آبلہ بدن
محی الدین نواب
KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

فہرست

حرف اول

محی الدین نواب کے قلم سے۔

ایک نوخیز تن پر اترنے والی نفس نفس محبت کی روداد۔
اس کا وجود گوشہ گوشہ سلگ رہا تھا۔

بھوک، مجبوری، غربت، ضرورت اور جبر! یہ ایسی ظالمانہ کیفیات ہیں جو آدمی کو اصول، نظریات ..... اور بعض اوقات اپنے عقائد تک سے بغاوت پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ایسی کیفیات کے شکار افراد کے درمیان رنگ و نسل کی کوئی دیوار ہوتی ہے نہ مذہب کی تفریق۔ خواہش آسودگی ہی ان احتیاج کے ماروں کا مذہب ہوتی ہے لیکن اس عالم بے کسی میں بھی بعض نام نہاد، غیرت مند، غیرت کے تقاضے پورے کرنے کے لیے سربکف ہوجاتے ہیں۔ اپنی کمزور غیرت کے کرب میں مبتلا یہ لوگ اپنی فطرت اور ضرورت کے مطابق غیرت کے معیار بدلتے رہتے ہیں لیکن عشق والوں کی الگ ہی ایک دنیا ہوتی ہے۔ یہ غیرت کے معاملات میں الجھتے ہیں نہ مذہب سے کوئی علاقہ رکھتے ہیں۔ مسلک عشق کے یہ پیرو تو محبت کے سوا ہر چیز کی نفی کی راہ پر گامزن رہتے ہیں۔

آبلہ بدن پڑوسی ملک کے پس منظر میں لکھی جانے والی ایک ایسی ہستی کی داستان ہے، جس نے انوکھی مثال قائم کرکے جیتے جاگتے تاج محل کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ اپنے پریتم کی پوجا کو اپنا مذہب اور گیروے رنگ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لینے والی وہ داسی، پاپ نگر کی باسی تھی۔ کیچڑ میں کھلنے والے کنول کے مانند اردگرد کی آلودگی اس کے نکھار اور اجلے پن کو گہنا نہ سکی۔ نوعمری کی بلاخیز محبت کی حدت اسے کندن بنائے دے رہی تھی۔ اس سوختہ تن آبلہ بدن کو اپنے محبوب کا نام روشنائی سے لکھنا گوارہ تھا نہ خون جگر سے۔ اس نے ایک انوکھا ہی ڈھنگ اختیار کیا۔ محبت شناسوں کے لیے وفا گزید گان کا احوال۔

انسان جس چیز کی بہت زیادہ خواہش کرتا ہے، وہ چیز اسے نہ ملے تو اسے حاصل کرنے کے لیے چور دروازے سے گذرتا ہے۔ "شجرہ" ایسے کرداروں کی داستان ہے۔ جنہیں کھانے کو آم نہ ملا تھا، انہوں نے امرود کے درخت سے آم پیدا کیے۔ یہ ایک مضحکہ خیز

بات ہے۔ لیکن آپ "شجرہ" پڑھ کر تسلیم کر لیں گے کہ انسانی ضد اور خواہشات ناممکن کو ممکن بنا دیتی ہیں۔

معاشرے کا حساس ترین فرد ہونے کے ناطے ادیب و شاعر ہر سانحے اور واقعہ کا اثر دوسروں کی نسبت زیادہ اور جلدی قبول کرتا ہے۔ نواب صاحب بھی اس حوالے سے قلم اٹھاتے ہیں۔ انہوں نے سیلاب کے حوالے سے جو داستان لکھی ہے' اس کے بلاخیز بہاؤ میں آپ خود کو بہتا ہوا محسوس کریں گے۔ آپ پر انکشاف ہو گا کہ سیلاب صرف نقصان ہی کا سبب نہیں بنتا' تہذیب و تمدن اور رسم و رواج پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کی زد میں آنے والی ہر شے تغیر و تبدل کا شکار ہو جاتی ہے۔

اس مجموعے میں "کزن" نامی کہانی ایسی تاثر انگیز ہے' جس کے اختتام پر آپ گم سم بیٹھے سوچتے رہ جائیں گے کہ انسان راستی کے کس نقطہ آغاز سے چلتا ہے اور گمراہی کی کس انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ یہ نقطہ اہم ہے کہ درسگاہوں میں کتابیں سکھاتی ہیں۔ لیکن زندگی کے عملی راستوں پر قدم قدم پر ٹھوکریں ہدایات دیتی رہتی ہیں۔ جو ہدایات کو سمجھ نہیں پاتا' وہ پوری زندگی عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔

ہم نواب صاحب کی ایسی ہی کہانیوں کے مجموعے آئندہ بھی شائع کرتے رہیں گے' جو بظاہر دلچسپیوں سے بھرپور کہانیاں ہوتی ہیں' مگر حقیقتاً" ایسا تازیانہ ثابت ہوتی ہیں' جو سونے والوں کو جھنجھوڑ کر جگا دیتی ہیں۔

ادارہ

آبلہ بدن

ابتدائے تہذیب سے محبت کی داستانیں
قلم سے لکھی گئیں۔
دل کے آنسوؤں سے رقم کی گئیں۔
اور کبھی خون جگر سے روشن کی گئیں۔
لیکن اس پریم پجارن نے
پیار کی انتہا کر دی
جب تک وہ نہ آیا
ایک ایک آبلے سے لکھتی گئی
آ بھی جاؤ کہ میں نے
آبلوں کی کہکشاں بچھا دی ہے۔
ہوس کے ماروں کی گردنیں جھکا دی ہیں۔

میں کوئی پینتالیس برس کے بعد ناگپور (بھارت) پہنچا تو بہت سے پرانے اور نئے رشتے دار ملنے کے لیے آئے۔ ان کے بچے مجھے یوں دیکھنے لگے جیسے پاکستان سے نہیں چاند سے آیا ہوں اور کوئی عجوبہ ہوں۔

دراصل انہوں نے مجھ سے پہلے کوئی پاکستانی رشتے دار نہیں دیکھا تھا۔ تقسیم ہند کے وقت ان کے بزرگ وہیں رہ گئے تھے۔ صرف میں اپنی بیگم کے ساتھ کراچی آگیا تھا تب سے ہندوستان جاکر کسی سے ملاقات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ان پینتالیس برسوں میں وہاں میرا ذکر ہوتا رہا تھا۔ پرانے رشتے دار میری طرح پچاس اور ساٹھ برس کے ہوگئے تھے۔ ان کے بعد کی نسل جوانی اور بڑھاپے کے درمیان تھی اور ان کے بعد کی نسل بالکل نوجوان تھی۔ پندرہ سے بیس برس کے بچوں نے پاکستان کے متعلق صرف اخباروں میں پڑھا تھا یا ٹی وی کی خبروں میں اس ملک کو دیکھا تھا۔ میں انہیں دستیاب ہوگیا تو وہ مجھ سے طرح طرح کے سوالات کرنے لگے جیسے میں ہندوستان کے آثار قدیمہ سے تعلق رکھتا تھا اور اب پاکستان سے برآمد ہوا ہوں۔

بھائی یوسف علی کی نوجوان نواسی فرح نے پوچھا۔ "سنا ہے' آپ کے ہاں فلموں میں بڑی پابندیاں ہیں۔ ہیرو اپنی ہیروئن سے دو ہاتھ دور رہ کر رومانس کرتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "تم فلموں کی بات کرتی ہو۔ ہمارے گھروں میں کوئی لڑکی اپنے بزرگوں سے ایسی باتیں نہیں کرتی' جیسی تم کر رہی ہو۔ بھارتی فلموں میں عورتیں جیسا مختصر لباس پہنتی ہیں کیا ایسا لباس تم نے بھارت کے کسی گھر میں یا قصبے میں دیکھا ہے؟"

"ایسا لباس ہماری فلموں میں صرف گلیمر کے لیے پہنایا جاتا ہے۔ ہمارے دیس میں غریبی بہت ہے۔ تن ڈھانپنے کے لیے پورا لباس نہیں ملتا۔ یہ بیچاری جنتا اگر فلموں میں ایسا حسن' گلیمر اور دولت دیکھ لیتی ہے تو کیا برا ہے؟"

"برائی ہے۔ غریب لڑکیاں ایسے لباس اور اتنی دولت حاصل کرنے کے لیے غلط راستوں پر چل پڑتی ہیں۔"

یوسف علی کی بیگم وہاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میری بات سنتے ہی ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ میرے قریب تھیں۔ میں نے صاف طور سے آنسو چھلکتے دیکھے۔ انہوں نے

جلدی سے ساڑھی کا آنچل آنکھوں پر رکھ لیا۔ آنچل میں آنسو تو چھپ گئے مگر آنسو پونچھنے کا عمل نہیں چھپ سکا تھا۔ اس لیے وہ اٹھ کر چلی گئیں۔

آنسو قطرہ قطرہ بہتے ہیں۔ مگر سمندر سے گہرے ہوتے ہیں۔ پتا نہیں آدمی کی کتنی گہرائیوں سے نکل کر آنکھوں کی دہلیز تک آتے ہیں۔ میں نے یوسف سے پوچھا۔ "بھابی کو کیا ہوگیا؟ کیوں رو رہی ہیں؟"

وہ ناگواری سے بولا۔ "پاگل کی بچی ہے۔ اس کے رونے اور ہنسنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔"

وہاں رشتے کی مزید دو عورتیں اور ان کے جوان بچے تھے۔ وہ بھی کسی نہ کسی کام کے بہانے چلے گئے۔ مجھے اجنبیت کا احساس ہوا۔ صاف پتا چل گیا کہ مجھ سے کچھ چھپایا جارہا ہے۔ کسی اجنبی سے کچھ چھپایا جاتا ہے جبکہ میں رشتے دار تھا۔ ہاں ایک دراڑ پڑگئی تھی۔ میں پاکستان سے آیا تھا۔ خون کا رشتہ ہونے کے باوجود غیر ملکی تھا۔ کچھ دنوں رہ کر چلا جانے والا تھا۔ گویا یہ ایک ملک کا راز تھا' دوسرے ملک سے چھپایا جارہا تھا۔

میں ناگ پور میں ایک رات گزار کر رائے پور چلا آیا۔ وہاں میرے پھوپھی زاد بھائیوں کا کنبہ پورے ایک محلے کی صورت میں پھیلا ہوا تھا۔ وہاں کی مختلف گلیوں میں ہندوؤں کے دو چار مکانات تھے۔ ورنہ مسلمان ہی مسلمان تھے۔ پانچوں وقت کی اذانیں سنائی دیتی تھیں۔ بزرگ حضرات مسجد کی طرف جاتے دکھائی دیتے تھے۔ خواتین میلاد کی محفلیں منعقد کرتی رہتی تھیں' جوان لڑکے امیتابھ بچن' انیل کپور' عامر خان اور سلمان خان کے اسٹائل میں دکھائی دیتے تھے۔ جوان لڑکیوں کو پردہ کرایا جاتا تھا۔ پھر بھی پردے کے پیچھے سے سری دیوی' میناکشی اور پوجا بھٹ کی بو باس آتی رہتی تھی۔ چونکہ ہر سو ہندی زبان تھی اس لیے ف' ق' خ' ض اور غ جیسے حروف ادا نہیں کرپاتے تھے۔ غلط کو گلت اور فرض کو پھرج کہتے تھے۔

پاکستان بننے سے پہلے غلط' غلط ہی تھا اور انصاف' انصاف ہی تھا۔ انساپھ نہیں تھا۔ اس بات کا اتنا دکھ نہیں ہے کہ بھارتی مسلمانوں کی زبان بگڑ گئی۔ دکھ یہ دیکھ کر ہوا کہ وہ کلام پاک غلط تلفظ سے پڑھتے تھے۔ نئی نسل کو خ' ف اور غ کی ادائیگی نہیں آتی تھی۔ یہ دین کے خلاف کھلی ہندو سیاست تھی۔

ایک شام میں نے اپنے پھوپھی زاد بھائی عبدالسلام سے کہا "میں ناگ پور میں ایک رات یوسف بھائی کے گھر میں رہا۔ وہاں محسوس کیا کہ ان کی اہلیہ یعنی کہ زینت بھابی چپکے چپکے کوئی صدمہ اٹھا رہی ہیں۔"

بھائی عبدالسلام نے حقارت سے کہا۔ "ہمارے سامنے ان لوگوں کا نام نہ لو۔ اب ہم ان کے لیے اور وہ ہمارے لیے مرچکے ہیں۔"

"آخر بات کیا ہے کہ ایک پردادا کی اولاد ایک دوسرے سے کٹ گئی ہے؟"

"بات کیا ہوگی میاں! انہوں نے بے حیائی کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں تھا یا پوچھا نہیں تھا کہ ان کی جوان بیٹیاں اور نواسیاں ملازمت کرنے کیوں جاتی ہیں؟"

میں نے کہا۔ "سلام بھائی! پاکستان میں ہماری بہو بیٹیاں بھی ملازمت کرتی ہیں۔ اس میں برائی کیا ہے؟"

"میاں! یہاں جو صنعتیں ہیں' ہندوؤں کی ہیں۔ چھوٹی بڑی کمپنیوں کے مالک بھی وہی ہیں۔ یہ ہندو مالکان مسلمان لڑکوں کو نہیں' لڑکیوں کو ملازمتیں دیتے ہیں۔"

جی ہاں' یہ سچائی میں نے وہاں دیکھی ہے۔ مسلمان تعلیم یافتہ جوانوں کو ملازمتیں نہیں ملتیں۔ وہ فٹ پاتھ وغیرہ پر سودا بیچتے ہیں' قلیوں کی طرح مزدوری کرتے ہیں یا پھر آوارہ پھرتے ہیں۔ اس کے برعکس لڑکیاں صبح ملازمت پر جاتی ہیں اور رات گئے واپس آتی ہیں۔

بھائی سلام نے بڑے کرب سے کہا۔ "میں نے اپنے کانوں سے ہندو موالیوں کو کہتے سنا ہے کہ مسلمان چھوکریاں دیتے ہیں اور ہندو نوکریاں دیتے ہیں۔"

ہم تھوڑی دیر تک سر جھکائے بیٹھے رہے۔ ایک دوسرے سے کچھ بول نہ سکے۔ پھر سلام بھائی نے کہا۔ "تم کہتے ہو' زینت بھابی چپکے چپکے کوئی صدمہ اٹھارہی ہیں لیکن تم نے یہ نہیں دیکھا' وہ سب کتنے خوشحال ہیں۔ اپنی زمین ہے' اپنا مکان ہے تمام بچے ملازمتوں سے لگے ہوئے ہیں۔ کیا تم سلمٰی سے ملے تھے؟"

"کون سلمٰی؟"

"یوسف علی اور زینت بھابی کی بڑی بیٹی ہے۔ انہوں نے تم سے چھپایا ہے۔ تم سے کہا ہوگا ان کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔"

"جی ہاں۔ میں نے ان کی دو بیٹیاں دو بیٹے اور ایک نواسی فرح کو دیکھا ہے۔"

"ان کی تین بیٹیاں ہیں۔ بڑی کا نام سلمٰی ہے۔ مومن پورہ اور سنترا مارکیٹ کے درمیان جو بڑا سا تالاب ہے اس کے قریب ہی سلمٰی ایک بڑے سے بنگلے میں رہتی ہے۔ اس کے پاس پہننے کے لیے ریشمی جوڑے ہیں۔ گھومنے پھرنے کے لیے کار ہے۔ بڑے ٹھاٹھ سے رہتی ہے۔ وہاں کے ایک ایم ایل اے دھرم چند اگروال نے اسے رکھا ہوا ہے۔"

بڑے شرم کی بات تھی۔ سلام بھائی کے سامنے میری نظریں شرم سے جھک گئیں۔ وہ بھی سر جھکائے ہوئے تھے۔ جیسے ہم سب خطاوار ہوں اور ہم سب نے مل کر اسے اگروال کے بنگلے میں پہنچایا ہو۔ ایسی خطائیں بھی ہوتی ہیں جو ہم سے دانستہ سرزد نہیں ہوتیں۔ کسی سماجی اور سیاسی عمل کے دوران نادانستگی میں ہو جاتی ہیں۔

پھر ہمارے درمیان کوئی بات نہ ہوسکی۔ میں سلمٰی کے متعلق بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن میں نے سلام بھائی کے چہرے اور حرکات و سکنات سے بھانپ لیا کہ وہ جھینپ رہے ہیں۔ یہ ایسا حساس موضوع ہے کہ اسے چھیڑنے سے ہر مسلمان کو غصہ آتا ہے یا پھر چپ لگ جاتی ہے مگر غصہ کرنے سے وہ موضوع ختم نہیں ہوجاتا۔ اپنی جگہ زندہ رہتا ہے اور

ہماری انا اور غیرت کے پیچھے پھلتا اور پھیلتا جاتا ہے۔ کسی زخم کو سمجھ کر اس کا علاج کرنا ہوتا ہے۔ طیش میں آنے سے زخم کے ٹانکے ٹوٹ جاتے ہیں۔

وہاں ہر عزیز کے ہاں مجھے ایک ایک دن مہمان رہنا تھا۔ اس لیے دوسری صبح عظیم الدین بھائی کے ہاں حیدر آباد چلا آیا۔ سلمٰی میرے اندر ایک پھانس کی طرح رہ گئی۔ ارادہ تھا کہ عظیم بھائی کے سامنے یہ موضوع چھیڑوں گا لیکن وہاں جرات نہیں ہوئی۔ میں نے ان کے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کو کافی آزاد خیال پایا۔ وہ اپنے بزرگوں سے اجازت حاصل کیے بغیر سیر وتفریح کے لیے جاتے تھے۔ ان کے دوستوں میں ہندو لڑکیاں اور لڑکے تھے۔ ہندوستانی ماحول اور تہذیب ایسی ہی محبت اور دوستی کے تقاضے کرتی ہے۔ یہ تقاضے رفتہ رفتہ سیکولرازم کو آگے لاتے ہیں اور مذہب کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔

اس رات عظیم بھائی کے کمرے میں میری چارپائی لگائی گئی۔ مجھے ان سے باتیں کرکے بڑا لطف آیا۔ ستر کے ہو رہے تھے مگر اب بھی زندہ دلی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ایک عزیز نے مجھ سے کہا تھا عظیم بھائی کے ساتھ رات خوب گزرے گی وہ سونے نہیں دیں گے اپنی جوانی کے قصے سنائیں گے تو صبح کردیں گے۔

انہوں نے جوانی میں خوب پیسہ کمایا تھا اور اسی مناسبت سے عیاشی بھی کی تھی اپنے ہم عمر بوڑھوں میں بیٹھ کر خوب مزے لے لے کر حسن و عشق کی داستانیں سناتے رہتے تھے۔

میں نے چاہا کہ سلمٰی کی بات چھیڑوں اور اس کی تمہید کے لیے میں نے ان کی نواسیوں اور پوتیوں کا ذکر چھیڑا۔ وہ ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ میرا خیال تھا وہ خوش ہوں گے اور ان کی باتیں کرتے رہیں گے تو میں اس دوران ان کے منہ میں سلمٰی کا لقمہ ٹھونس دوں گا لیکن انہوں نے کہا۔ "میاں! چھوڑو ان بچوں کی باتیں۔ کیوں نہ ہم عمر رفتہ کو آواز دیں؟"

میں نے کہا "ہاں ٹھیک ہے مگر میں پہلی بار ان بچوں کو دیکھ رہا ہوں۔ معلوم کرنا چاہتا ہوں یہ کس مستقبل کی سمت جارہے ہیں؟"

"جب ہم جوان تھے تو کیا اپنے مستقبل کے بارے میں کبھی سوچا تھا؟ کیسی رازداری اور بے فکری کے دن تھے۔ ایسے ہی ہمارے یہ بچے بے فکری سے زندگی گزار رہے ہیں۔ اب ہمارا آخری وقت ہے کیا پتا کب چل بسیں؟ لہٰذا جو وقت ہنستے بولتے گزر جائے وہ غنیمت ہے۔"

میں نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "جی ہاں' گزرے ہوئے لمحات اور گمشدہ یادوں کو تازہ کرنے میں بڑا لطف آتا ہے۔"

یک بیک میرے دماغ میں بات آئی کہ یہ حضرت اپنی عشقیہ داستانیں سنانے سے باز نہیں آئیں گے۔ اس دھرم چند اگروال نے بھی سلمٰی سے عشق کیا ہوگا یا جبر کیا ہوگا۔ جو بھی کیا ہوگا' جوانی کا تماشہ کیا ہوگا۔ ہندو ہو یا مسلمان اگروال ہو یا عظیم بھائی' سب پر جوانی آتی ہے اور سب ہی اپنی بساط کے مطابق عشقیہ داستانیں رقم کرتے ہیں۔

میں نے طے کرلیا کہ وہ اپنی جوانی کی کتھا سنائیں گے تو میں انہیں اگروال کی سمت موڑ دوں گا۔ میں نے کہا۔ "عظیم بھائی! جوانی میں آپ بڑے بدنام تھے کوئی بدنامی کا دلچسپ واقعہ سنائیں۔" میں نے فرمائش کی تو گویا انہیں زبان مل گئی' بولے۔ "میاں! بدنامی کمزوروں کی ہوتی ہے جس کے پاس دولت اور اثرورسوخ ہو اس پر کوئی کیچڑ نہیں اچھالتا۔"

میں نے پوچھا۔ "سنا ہے' ان دنوں آپ نے بڑی دولت کمائی تھی؟"

"ہاں' میں برٹش انڈین آرمی میں ایک ٹھیکیدار تھا۔ حیدر آباد دکن کی فوجی چھاؤنی میں راشن سپلائی کرتا تھا۔ ان دنوں دوسری جنگ عظیم اختتام کو پہنچ رہی تھی۔ مشرق بعید میں جاپان ایک وحشت بنا ہوا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ امریکی ہوابازوں نے ہیروشیما اور ناگاساکی میں ایٹم بم گرا کر جاپان کو بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا۔

ہائے! وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ حیدر آباد میں بازاری عورتوں کا میلہ سا لگا رہتا تھا۔ برطانوی اور امریکی فوج کے سپاہی اپنا پیٹ راشن سے بھرتے تھے لیکن نیت عورتوں سے ہی بھرتی تھی۔ باہر کی فوج جب کسی بیرونی زمین پر جنگ لڑنے آتی ہے تو اس ملک کے کھیتوں کے اناج کے ساتھ ان کے شہروں کی عورتیں بھی مانگتی ہے۔

عورت کیسے بکتی ہے؟ ایک گھر سے دوسرے گھر ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں کیسے جاتی ہے؟ اس کا جواب تاریخ سے اور ذہانت کی غیر جانبداری سے ملتا ہے چکلا ہندوستان کا ہو یا پاکستان کا وہاں ہندو عورت بھی ہوتی ہے اور مسلمان بھی۔ وہاں ہندو گاہک مسلمان کے پاس اور مسلمان گاہک ہندو عورت کے پاس جاتے ہیں تو کسی مسلمان یا ہندو کو غیرت نہیں آتی۔ غیرت کا تقاضا اسی وقت پورا ہوتا ہے جب ایک مذہب کے مرد کو بازار میں بیٹھی ہوئی دوسرے مذہب کی عورت کے پاس جانے سے روک دیا جائے۔

کیا عورتوں کی منڈی میں مذہب اور دھرم نہیں ہوتا؟ ہوتا ہے وہاں ہر دیوی دیوتا کی پوجا ہوتی ہے اور ہر محرم میں زور وشور سے ماتم ہوتا ہے۔ وہاں بھی غیرت کا تقاضا ہے کہ اللہ والا اللہ والی کے پاس اور بھگوان والا بھگوان والی کے پاس جائے اور اگر ایسے میں کوئی اگروال کسی سلمٰی کے پاس..."

میں نے چونک کر عظیم بھائی کو دیکھا وہ بڑی سنجیدگی سے بولے۔ "میں جانتا ہوں تم زینت بھابی کے گھر سے اپنے دل میں غیرت کی ایک کیل چبھو کر آئے ہو۔ وہاں سے یہاں تک کسی نے وہ کیل نہیں نکالی ہے تم ایک کرب میں مبتلا ہو۔ ذرا صبر کرو۔ میں وہ کیل نکال دوں گا۔ ہاں تو میں جنگ عظیم کی باتیں کر رہا تھا۔"

"نہیں عظیم بھائی! پہلے سلمٰی کی بات کریں۔"

"میاں! صرف اگروال سلمٰی کے پاس نہیں گیا تھا تمہارا یہ عظیم بھائی بھی ایک "میرا" جوگن کے پاس گیا ہے۔ جب تک تم صبر سے میری کہانی نہیں سنو گے تمہیں سلمٰی کے سلسلے میں ہونے والی کوئی بات سمجھ میں نہیں آئے گی اور تم ایک کمزور سی غیرت کا بوجھ

اٹھائے یہاں سے پاکستان جاؤ گے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولے۔ "میں چاہتا ہوں جب تم یہاں سے جاؤ تو تمہارا اور تمام پاکستانی بھائیوں کا ذہن ہماری طرف سے صاف ہوجائے۔"

انہوں نے جگ اٹھا کر گلاس میں تھوڑا پانی لیا پھر دو گھونٹ پینے کے بعد کہا۔ "ہندوستان میں ابتدا ہی سے غربت ہے پھر ان ہی دنوں قحط بنگال نے لوگوں کو دانے دانے کے لیے ترسا دیا' انہیں بھوکا ماردیا۔ جوان لڑکیاں ایک وقت کی روٹی کے عوض فروخت ہونے لگیں۔ فرنگی اور امریکی سپاہی نوٹوں کی بارش کرتے تھے۔ اس لیے بھوکی اور مجبور عورتیں ان علاقوں میں جانے لگیں جہاں جہاں فوجی کیمپ ہوا کرتے تھے۔

ملٹری پولیس کے افسران اپنی فوج کے جوانوں کو ایسی عورتوں سے دور رکھنے لگے تھے کیونکہ ان کے ذریعے طرح طرح کی بیماریاں پھیلنے لگی تھیں۔ جو سپاہی ہوس پرستی سے باز نہیں آتے تھے انہیں سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ کسی عورت پر شبہ ہو کہ وہ گشتی ہے' تو اسے مار مار کر شہر چھوڑنے پر مجبور کردیا جاتا تھا۔

میں عاشقانہ مزاج رکھنے کے باوجود پرہیز کررہا تھا کبھی بد پرہیزی کے لیے کسی پر نظر جاتی تو ڈر جاتا تھا کہ کہیں وہ بیماری کا گھر نہ ہو۔ ایسے وقت ابا جان نے خط لکھا برخوردار! بہت کمائی کرلی۔ واپس آجاؤ شادی کرو اور گھر بساؤ فوجیوں کے کیمپ میں جہاں بیماریاں پھیل رہی تھیں وہاں وہ خط نسخہ بن کر آیا کہ ایک مرد ایک شریف عورت کے ساتھ گھر بسا کر ہی بیماریوں سے محفوظ رہ سکتا ہے میں نے واپسی ڈاک سے جواب لکھ بھیجا کہ چند روز میں پہنچ رہا ہوں۔

میرے ایک ساتھی ٹھیکیدار مرلی دھر نے کہا۔ "اجیم بھائی! ہندوستان میں پہلی بار جیپ کاریں آرہی ہیں۔ یہ دیکھو اخبار میں نے پتا نوٹ کرلیا ہے یہ نئی گاڑی جرور خریدوں گا تمہارا کیا کھیال ہے؟"

میں نے کہا۔ "ایسی نئی اور مہنگی چیزیں بڑی موثر ہوتی ہیں۔ خاندان کے لوگوں پر اور شہر والوں پر بڑا رعب پڑتا ہے میں بھی ایک خریدوں گا"

ان دنوں جیپ کاریں عام نہیں تھیں۔ جنگ کے دوران اس کا ڈیزائن تیار ہوا تھا اور یہ جنگی مقصد کے لیے بڑے افسران کے استعمال میں رہا کرتی تھی۔ اب عام استعمال کے لیے جیپ کاروں سے بھرا ہوا پہلا جہاز بمبئی کی بندرگاہ میں پہنچ گیا تھا۔ میں اور مرلی دھر حیدر آباد کے نام پلی اسٹیشن پر آئے۔ فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ لیے۔ پھر ٹرین میں سوار ہوگئے۔

ایک بات اور بتادوں کہ دوسری جنگ عظیم سے پہلے فرسٹ کلاس میں صرف انگریزی سفر کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کو ایسے کمپارٹمنٹس میں جھانکنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ پھر آزادی کی تحریک نے برٹش گورنمنٹ کو سمجھا دیا تھا کہ اب وہ آقا بن کر ہمیں تیسرے

درجے میں ٹھونس کر نہیں رکھ سکیں گے۔

یوں سمجھ لو کہ میں نے اور مرلی دھر نے زندگی میں پہلی بار فرسٹ کلاس میں سفر کیا۔ اس کمپارٹمنٹ میں ایک انگریز اپنی گوری میم کے ساتھ تھا۔ اس نے ہماری موجودگی پر حقارت سے منہ بنایا۔ حقارت محض اس لیے نہیں تھی کہ ہم کالے تھے وہ گورا تھا ہم غلام تھے وہ آقا تھا بلکہ اس لیے بھی تھی کہ ہم کباب میں ہڈی بن گئے تھے اور بدلتے ہوئے سیاسی حالات کے پیش نظر وہ ہماری موجودگی پر اعتراض نہیں کرسکتا تھا۔

ویسے وہ گوری میم ہمارے صبر کا امتحان بن گئی۔ ہمارے ہاں کی عورتیں گردن سے لیکر ٹخنوں تک لباس میں چھپی رہتی ہیں۔ جہاں تک دیکھنے کو ملتا ہے وہاں کے بعد ہم خوابوں اور خیالوں میں دیکھتے ہیں۔ اس میم کی گوری بانہوں اور چمکتی ہوئی پنڈلیوں کو دیکھ کر آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ شاید وہ بمبئی تک ہماری آنکھوں کو اندھا کرنے والی تھی۔

میں نے کہا۔ "یار مرلی! یہ فرسٹ کلاس مہنگا پڑ رہا ہے میں اپنی اٹیچی میں بہترین اسکاچ وہسکی لایا ہوں۔"

"پھر تو مزہ آجائے گا۔"

"کیا خاک مزہ آئے گا۔ یہاں ایک عورت کی موجودگی میں کیسے پئیں گے؟"

"اجیم بھائی! یہ کوئی شرمیلی ہندوستانی عورت نہیں ہے انگریج عورتیں تو بوتل دیکھ کر دوست بن جاتی ہیں۔"

"اس دوست بننے والی کے یار کے ہولسٹر میں ریوالور ہے۔ اگر ہم نشے میں آؤٹ ہوں گے تو وہ ہمیں دنیا سے آؤٹ کردے گا۔ ہو سکتا ہے' ہمیں بوتل کھولنے ہی نہ دے۔"

وہ بے بسی سے بولا۔ "اس سالے انگریج کو مار کر پھینک دینے کو جی چاہتا ہے۔"

"اسے پھینکنے کے بعد کیا ہوگا؟"

"اس کے بعد یہ ہمارے پاس اکیلی رہ جائے گی ہی ہی ہی' بمبئی تک اکیلی۔"

"تو پھر جاؤ اور اس سے ریوالور مانگ کر اسے گولی مار دو کیونکہ چھیننے کی طاقت تم میں ہوگی نہیں۔ کیا پینے سے پہلے بہک رہے ہو؟"

وہ سرد آہ بھر کر بولا۔ "یار! جب ہم کسی سے کچھ چھین نہیں سکتے تو کھیالوں میں چھینا جھپٹی کرتے ہیں۔ بول کر ہی کھش ہو لینے دو۔"

ٹرین تیز رفتاری سے جارہی تھی کھڑکی سے آنے والی ہوائیں میم کی تراشیدہ زلفیں اڑا رہی تھیں۔ حسن مائل بہ پرواز تھا جیسے گورے کے ہاتھ سے کٹ کر پتنگ ہمارے پاس آنے والی تھی۔ عجب ہوش ربا نظارہ تھا۔ ایسے میں انگریز بہادر نے انگریزی فلموں کا رومانس شروع کردیا تھا۔ رومانس کی ایک حد ہوتی ہے۔ اس حد تک فرنگی تہذیب سرعام انہیں اجازت دیتی ہے لیکن ہم نظریں چرا رہے تھے۔ کبھی کھڑکی کے باہر دیکھ رہے تھے کبھی ایک دوسرے سے باتیں کرکے اپنا دھیان بٹا رہے تھے۔ ادھر نہ دیکھنے کے باوجود خیال کی

اسکرین پر بہت کچھ دیکھ رہے تھے اور اندر ہی اندر پک رہے تھے۔

ٹرین چھوٹے اسٹیشنوں پر نہیں رک رہی تھی۔ خراٹے بھرتی جارہی تھی۔ حیدر آباد سے بمبئی کا فاصلہ چھ سو میل ہے اور شاید سو میل کا سفر طے ہوا تھا۔ ابھی پانچ سو میل کا عذاب باقی تھا۔

مرلی دھر نے کہا۔ "کیا مصیبت ہے ان کو شرم نہیں آرہی ہے' ہم کو آرہی ہے۔"

"ہمیں ابھی شرم نہیں آرہی ہے۔جب ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے تو ہم دیدے پھاڑ کر دیکھتے ہیں ابھی ہم پر فرنگی کا خوف طاری ہے۔"

بے شک سب ہی شرم والے نہیں مرتے۔ مسلمان ' ہندو اور سکھ سب ہی ایک دوسرے کے گھروں میں بے شرمی سے جھانکتے ہیں لیکن ہم میں سے کوئی انگریز بہادر کے بیڈ روم میں جھانکنے کی جرات نہیں کرتا تھا۔ موقع ملے تب بھی بے شرمی بھول جاتا تھا کیونکہ اس کا ڈنڈا ہمارے سروں پر ہوتا تھا۔ آج ڈنڈا سر پر نہیں ہے۔ اس لیے کتنے ہی ہندو گوری میموں کو ان کے ملکوں سے اور مسلمان عورتوں کو ان کے گھروں سے نکال لاتے ہیں۔ پاکستان میں کوئی ہندو ایسا کرنے کی جرات نہیں کرے گا۔ اسی طرح ہندوستان میں کوئی مسلمان کسی ہندو عورت کو چھیڑنے کی ہمت نہیں کرے گا کیونکہ جہاں ڈنڈا ہوتا ہے وہاں آدمی شرم اور شرافت کو اپناتا ہے۔ نوے فیصد تہذیب لاتوں جوتوں سے قائم رہتی ہے۔

مرلی دھر نے کہا۔ "ہمارا دیش آجاد ہونے والا ہے لیکن اس انگریج نے ہمیں گلام بنا کے کھڑکی کی طرف منہ کرکے بٹھا دیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "غلامی کی زنجیریں توڑ دو۔ ہم آزادی سے جدھر چاہیں ادھر دیکھ سکتے ہیں۔"

"تو پھر دیکھیں؟"

"ضرور دیکھو۔ آزادی کا نعرہ لگاؤ۔ اور ....."

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس نے نعرہ لگانے کے انداز میں ایک مکا لہراتے ہوئے کہا۔ "بندے ماترم....."

پھر وہ انگریزی جوڑے کی طرف گھوم کر جوش و خروش سے بولا۔ "جے ہند۔ جے بھارت ماتا کی' جے ہند....."

انگریز بہادر نے ہمیں غصے اور جھنجلاہٹ سے دیکھا۔ پھر حکم دیا۔ "یو کالا آڈمی لوگ۔ شٹ یور آئز اینڈ ٹرن یور ڈرٹی فیس۔" (اپنی آنکھیں بند کرو اور گندے منہ پھیرلو)

مرلی دھر نے کہا۔ "تم کو شرم نہیں آتی؟ ایک ابلاناری (مظلوم عورت) کو ہمارے سامنے یعنی کہ ہمارے سامنے ..."

میں نے کہا۔ "مرلی! تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ ابلا ناری ہے؟ ہمیں دونوں پر اعتراض کرنا چاہیے۔"

پھر میں نے انگریز سے کہا۔ "یہ سب سرعام کرنا خلاف تہذیب ہے۔ ہندوستان چھوڑنے سے پہلے ہماری حیا پرور تہذیب سیکھ کر جاؤ۔"

وہ پہلے ہی سرخ و سفید تھا۔ جذبات اور جنون میں گرم لوہے کی طرح اور زیادہ سرخ ہوگیا تھا۔ اس نے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر ہم دونوں کو نشانے پر رکھا۔ پھر کہا۔ "کم آن' گٹ اپ' اٹھو جلدی کرو۔ ہمارا ٹائم ویسٹ مت کرو۔"

ہم سہم کر اٹھ گئے۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھالیے۔ اس نے ریوالور کے اشارے سے ہمیں ٹائلٹ میں جانے کے لیے کہا۔ ہم بے چوں و چرا دروازہ کھول کر اندر گئے۔ اس نے دروازے کو کھینچ کر بند کیا پھر باہر سے چٹخنی چڑھادی۔

ہم ٹائلٹ میں قید ہوگئے۔ کچھ دیر گم صم سے کھڑے رہے۔ ایک دوسرے کو تکتے رہے پھر میں نے بے بسی سے کہا۔ "یہ کیا ہوگیا؟"

"اجیم بھائی! تم نے مجھے ادھر دیکھنے کو کہا تھا۔"

"ہاں کہا تھا لیکن جے ہند کا نعرہ لگانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"وہ میں بھول گیا تھا کہ اس کے پاس ریوالور ہے۔"

ٹرین کسی بڑے اسٹیشن پر رک گئی۔ میں نے کہا۔ "کوئی نیا مسافر کمپارٹمنٹ میں آئے گا تو ہمیں اس سے مدد ملے گی۔"

"وہ انگریج اسے بھی ہمارے پاس بھیج دے گا۔"

"کتنوں کو یہاں بند کرسکے گا۔ پھر ہم سب اس صاحب بہادر پر ہلہ بول دیں گے۔"

ہم اپنی کم تری اور بے بسی پر پیچ و تاب کھارہے تھے۔ ہم بیرونی امداد کے منتظر رہے۔ کوئی نیا مسافر اس کمپارٹمنٹ میں نہیں آیا۔ ٹرین پھر چل پڑی۔

یہ ہماری خام خیالی تھی کہ ہم اس انگریز کا کچھ بگاڑ سکیں گے۔ ابھی انگریزوں کو ہندوستان سے بھگانے کی تحریک چل رہی تھی اور یقین سے یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ بھاگ جائیں گے۔ میں نے کہا۔ "ہم ٹھیکیدار ہیں' سیاسی لیڈر نہیں ہیں۔ ہمیں سنڈاس میں قید ہوکر سبق سیکھنا چاہیے۔ اتنی بے عزتی ہونے کے بعد میں اس کمپارٹمنٹ میں نہیں رہوں گا۔"

میں نے دروازے کو پیٹ پیٹ کر کہا۔ "ہمیں باہر آنے دو ہم سے ایسا سلوک نہ کرو۔ ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔"

ہماری داد فریاد کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ گوری میم کے اثر میں تھا۔ اس نے ایک گھنٹے بعد دروازہ کھولا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ ہمیں اس حسینہ کے سامنے بری طرح توہین کا احساس ہو رہا تھا۔ لائن کلیئر نہ ہونے کی وجہ سے گاڑی ایک چھوٹے اسٹیشن پر رکی ہوئی تھی۔ ہم اپنا سامان اٹھا کر کمپارٹمنٹ سے اتر گئے۔

اسی وقت سگنل ڈاؤن ہوگیا۔ ٹرین حرکت میں آگئی۔ ہم دوڑتے ہوئے ایک تھرڈ کلاس

کمپارٹمنٹ میں سوار ہوگئے۔ ایک جگہ بیٹھ کر ہانپنے اور سانسیں درست کرنے لگے۔ وہاں بیٹھے ہوئے غریب اور بدحال مسافر ہمیں دیکھ رہے تھے۔ چھوٹے سے کمپارٹمنٹ میں مرد کم اور عورتیں زیادہ تھیں۔ ہمارے ٹھیک سامنے والی سیٹ پر ایک نوجوان لڑکی تھی۔ اس کے آس پاس بوڑھی اور جوان عورتیں تھیں۔

میں جو واقعہ سنا رہا ہوں' اس واقعے کی اہم کردار وہی ہمارے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی تھی۔ اب تک میں نے جو کچھ کہا اسے تمہید سمجھو۔ اس تمہید کی دو اہم باتیں پھر بیان کرتا ہوں تاکہ اس لڑکی کی روداد وضاحت سے سمجھ میں آسکے۔

پہلی اہم بات یہ کہ ہم شہر حیدر آباد کی فوجی چھاؤنی سے آرہے تھے جہاں گناہوں کی کثرت سے بیشتر فوجی جوان مختلف امراض میں مبتلا ہوگئے تھے اور اب وہاں سے کسبی عورتوں کا بھگایا جارہا تھا۔

دوسری اہم بات یہ کہ پہلے کمپارٹمنٹ میں ہم نے جو ذلت اٹھائی تھی اور تھرڈ کلاس میں آکر اس فرسٹ کلاس حسینہ کو دیکھ رہے تھے تو یہ عقل آرہی تھی کہ جو عورت ہماری اوقات سے باہر ہو اسے ہماری مردانگی تسخیر نہیں کرسکتی۔ ہماری اوقات اور حیثیت کے مطابق وہ تھرڈ کلاس والی ہی ہماری دسترس میں تھی۔

اس نے مندر کی دیو داسی جیسا گیروے رنگ کا لباس پہنا تھا۔ اس رنگ کی ساڑی اور بلاؤز میں وہ بھری ہوئی بارود کی طرح بیٹھی تھی۔ ہم نے بارود کو تیلی نہیں دکھائی تھی پھر بھی وہ ہمارے اندر دھماکے کر رہی تھی۔ اس کے سامنے وہ گوری میم انگور کی طرح کھٹی ہوگئی تھی۔

ہم اسے بے باکی سے جی بھر کے دیکھ رہے تھے کیونکہ اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی ماں کے پاس ریوالور نہیں تھا وہ غریبی کے نیلام گھر میں تھی۔ ہم کم سے کم بولی دے کر اسے حاصل کرسکتے تھے۔

اس کی نظریں کئی بار ہم سے ملیں۔ اس کی آنکھوں میں کوئی شکایت کوئی ناگواری نہیں تھی اور نہ ہی کسی طرح کی اپنائیت یا اشارہ تھا۔ میں نے ایسی آنکھیں کم دیکھی ہیں جن میں معصومیت بھی ہو اور جذبے بھی پکار رہے ہوں۔

وہ نو عمر معصوم ہوتی تو نظریں جھک جاتیں لیکن اس کی بے انتہا جوانی معصومیت کے اندر سے چیخ رہی تھی جیسے حبس بے جا میں رکھی ہوئی ہو۔ پتا نہیں وہ کس کے لیے ہوگی۔ اس کا خاموش بدن اپنے ہی لیے لگ رہا تھا۔ وہ جتنی خاموش تھی اتنی ہی اس کی بے زبانی میرے اندر شور مچارہی تھی۔

اس کے گلے میں زرد گیندے کے پھولوں کا ہار تھا۔ ہندو مذہب میں گیندے کے پھول مقدس سمجھے جاتے ہیں۔ یہ پھول پوجا کی تھال میں رکھے جاتے ہیں اور بھگوان کے چرنوں پر چڑھائے جاتے ہیں۔ وہ ایسی جگہ بیٹھی ہوئی تھی کہ دوسرے مسافروں کو ٹائلٹ جانے کے

لیے اس کے سامنے سے گزرنا ہوتا تھا اور جو مسافر بھی وہاں سے گزرتا تھا وہ اس کے سامنے ذرا رک جاتا تھا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کے آگے ذرا سا سر خم کرتا تھا۔ اسے تعظیم دیتا تھا پھر آگے بڑھ کر ٹائلٹ میں جاتا تھا۔

ایسا تو مندر کے سامنے سے گزرنے والے کرتے ہیں۔ کرشن بھگوان یا ماں جگ دمبے کی مورتی کے سامنے رکتے ہیں' سر جھکاتے ہیں' ہاتھ جوڑتے ہیں پھر آگے بڑھ جاتے ہیں ایسا دیوی دیوتاؤں کے لیے ہوتا ہے۔ کسی نوجوان حسینہ کو یہ مان نہیں دیا جاتا لیکن ہماری آنکھوں کے سامنے ایسا ہو رہا تھا۔ اسے جیسی تعظیم دی جارہی تھی اس سے ظاہر تھا کہ وہ کوئی مہان ہستی ہے۔

مرلی دھر نے میرے قریب جھک کر کان میں کہا۔ "ادھر صاحب بہادر نے ریوالور دکھا کر گوری میم کو دیکھنے پر پابندی لگائی تھی۔ ادھر اس سندر چھوکری پر دھرم کی تلوار لٹک رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اَدھر ہم ٹائلٹ میں قید کیے گئے تھے۔ اِدھر جوتے بھی پڑ سکتے ہیں۔ سنبھل کر رہنا۔"

ہوس غالب ہو تو آدمی خطرات کی پرواہ نہیں کرتا۔ رکاوٹ ہو تو راستہ بن کر تکمیل خواہشات کے جزیرے میں پہنچ جاتا ہے۔ وہ حسینہ میرے لیے قصہ حاتم طائی کی حسن بانو بن گئی تھی۔ وہ سات سوالات پیش کرتی تو میں جواب لانے کے لیے موت کے کوہ ندا کی طرف چلا جاتا۔

مرلی دھر نے اس کے پاس بیٹھی ہوئی بوڑھی عورت سے پوچھا۔ یہ کون ہے؟ کوئی جوگن ہے؟"

"جوگن ہی سمجھو۔ ہمارے لیے تو ابھاگن (بدنصیب) ہے۔"

میں نے خوبصورت جوگن کو دیکھا۔ وہ بدنصیب نہیں ہوسکتی تھی۔ کم از کم ہمارے نصیب چمکا سکتی تھی۔ اسے ابھاگن کہنے والی اس کی ماں تھی۔ میں نے پوچھا۔ "تم اسے بدنصیب کیوں کہہ رہی ہو؟"

"اور کیا کہوں؟ جب سے جوان ہوئی ہے' ایک پیسہ کما کر نہیں دیا۔"

ہم ایک دم سے چونک گئے۔ اس عورت کے ایک فقرے نے سمجھا دیا کہ وہ بازار کی ہیں۔ یا حیرت! ایک طرف وہ قابل تعظیم جوگن تھی۔ دوسری طرف پاپ نگر کی باسی تھی۔ وہ خیر بھی تھی اور شر بھی۔ مندر کی داسی بھی تھی اور راج دربار یا عیش کدے کی نرتکی بھی۔ وہ ایک پھول تھی جو بھگوان پر چڑھائی جاتی تھی اور سیج پر بھی اتاری جاتی تھی۔

مرلی دھر نے بوڑھی عورت سے پوچھا۔ "کیا حیدر آباد سے آرہی ہو؟"

"ہاں جی۔ ادھر قسمت آزمانے کو گئے تھے۔ اس ڈبے کی آدھی مسافر عورتیں اور مرد ہمارے اپنے لوگ ہیں۔ ویسے تو ہم گورے گاؤں کے ہیں لیکن بمبئی کے ماگی پاڑہ (چکلا) میں

رہتے ہیں۔"

"حیدر آباد کیوں آئی تھیں؟"

"کہاں نا' قسمت آزمانے گئی تھی۔ میری اور دو بیٹیاں ہیں۔ بھگوان کی کرپا سے دونوں کا بڑا نام ہے۔ بمبئی کی فوجی چھاؤنی میں جتنے گورے ہیں وہ سب مالتی اور شاردا کے نام یاد رکھتے ہیں۔ وہ ہندی بول نہیں پاتے مگر میری بیٹیوں کے نام خوب یاد ہیں۔"

اس نے ہاتھ اٹھا کر ایک طرف بیٹھی ہوئی دو عورتوں کی سمت اشارہ کیا۔ مالتی اور شاردا ہمیں دیکھ کر مسکرانے لگیں۔ بڑی بیمار مسکراہٹیں تھیں۔ دونوں کے چہروں پر جھائیاں سی پڑ گئی تھیں۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ آنکھیں اندر کو دھنستی جا رہی تھیں۔ فولاد بھی کثرت استعمال سے گھس جاتا ہے وہ بیچاریاں تو گوشت پوست کی تھیں۔ اپنی ماں کی ہم عمر لگتی تھیں۔

ماں نے جوگن بٹی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اُس کا نام میرا ہے۔ پورے سولہ سال کی ہے۔"

میرا نے خلا میں تکتے ہوئے دھیمے سروں میں کہا۔ "سولہ نہیں' بیس برس کی ہوں۔"

ہم نے اتنی دیر میں پہلی بار اُس کی رس بھری آواز سنی تھی۔ ماں نے ڈانٹ کر کہا۔ "تو چپ کر۔"

پھر وہ ہم سے مسکرا کر بولی۔ "میں ماں ہوں۔ میں نے اسے پیدا کیا ہے۔ میں جانتی ہوں' آج ہی سولہ سال پورے ہوئے ہیں۔ رنگ روپ دیکھ لیں۔ اس پر کسی کی انگلی کا نشان بھی نہیں ملے گا۔"

اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے سیلزمین مال کی کوالٹی بیان کر رہا ہو۔ ویسے سچ تو یہ تھا۔ کوئی سراغرساں محدب شیشے سے اس کے بدن کو دیکھتا تو اس پر گناہ کا کوئی فنگر پرنٹ نظر نہ آتا۔ وہ کیچڑ میں کنول کی طرح صاف ستھری' نکھری نکھری اور اجلی اجلی سی تھی۔

میں نے پوچھا۔ "تم نے میرا کو دھندے سے الگ کیوں رکھا ہے؟"

وہ بولی۔ "میرا کیا ماتھا خراب ہوا ہے کہ سونا اگلنے والی کو بھوک اور غریبی اگلنے کے لیے چھوڑ دوں۔ ادھر چھ برس سے کتنے ہی دل والے دھنوان بولیاں دے رہے ہیں۔ دو ہزار تک دینے کو تیار ہیں۔ رات کو جائے گی صبح آئے گی اور ہتھیلی پر دو ہزار دھرے ہوں گے۔ اتنی رقم کسی بھاگ وتی کو ہی ملتی ہے۔"

اُن دنوں دو ہزار آج کے دو لاکھ کے برابر تھے۔ دو آنے سیر خالص دودھ اور ایک روپیہ سیر خالص گھی ملتا تھا۔ پانچ افراد پر مشتمل کنبہ ایک روپے میں تینوں وقت پیٹ بھر کر کھاتا تھا۔ گھریلو استعمال کی ساڑھیاں روپے ڈیڑھ روپے میں خریدی جا سکتی تھیں۔ کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کی چیزیں اتنی سستی تھیں کہ آج کے جوان بچوں کو یہ قصے کہانیوں والی باتیں لگتی ہیں۔

میرا کے لیے اگر ایک رات کے دو ہزار دیے جا رہے تھے تو یہ اس کی ماں کے لیے واقعی فخر کی بات تھی۔ بازار میں اتنی اونچی بولی پہلے کسی کے لیے نہیں لگی تھی۔ مرلی دھر نے میرے کان میں کہا۔ "لڑکی جوردار ہے۔ مگر دو ہجار بہت ہوتے ہیں۔ یہ بڑھیا باتوں ہی باتوں میں ہمیں ریٹ بتا رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "مول تول بعد کی بات ہے۔ پہلے یہ تو معلوم ہو کہ یہ چھ برس تک کسی کے ہتھے کیوں نہیں چڑھی؟"

"یار! چڑھی ہوگی۔ یہ بھاؤ بڑھانے کے لیے اسے ان چھوئی کلی بنا کر پیش کر رہی ہے۔"

دل نہیں مانتا تھا کہ وہ نظر سے بھی میلی ہوئی ہوگی۔ کیا پتا بوڑھی کیا دکھا رہی تھی اور کیا پیش کر رہی تھی۔ آگے کی سب جانتے ہیں۔ پیچھے کی کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ آگے پیچھے کی باتوں کو سمجھنا ہوتا ہے۔ پیچھے کا سچ دکھائی نہیں دیتا۔ آگے کا جھوٹ حقیقت لگتا ہے۔

ٹارچ کے آگے روشنی اور پیچھے تاریکی ہوتی ہے۔ حُسن کی سوغات آگے اور گناہوں کی گٹھری پیچھے رہتی ہے۔

پیچھے کا سبق بھولنے والے آگے نہیں پڑھ سکتے۔ ہمیں میرا کو آگے پڑھنے کے لیے پیچھے کا ورق الٹنا تھا۔ میں نے اُس کی ماں سے پوچھا۔ "جب بمبئی میں اتنی اونچی بولیاں لگ رہی تھیں تو حیدر آباد کیوں گئی تھیں؟"

وہ بولی۔ "کچھ تو ہماری شامت آگئی تھی۔ کچھ مقدر کا ستارہ بھی چمکنے والا تھا۔ ہوا یوں کہ بمبئی کی فوجی چھاؤنی میں گورے سپاہی بیمار ہونے لگے۔ فوجی ڈاکٹروں نے پہلے نرمی سے ہم پر پابندیاں لگائیں۔ پھر ہماری لڑکیوں کو ڈنڈے مار کر بھگانے لگے۔ ایک دن ملٹری پولیس والے بڑے بڑے ٹرک لے کر آئے پھر ہم تمام عورتوں کو ان میں ٹھونس کر بمبئی شہر سے کئی میل دور لے جا کر چھوڑ دیا اور وارننگ دی کہ ہم میں سے کوئی شہر میں دیکھی جائے گی تو اسے گولی ماردی جائے گی۔"

ٹرین ایک اسٹیشن پر رکی۔ پھر آگے چل پڑی۔ میرا کی ماں نے کہا۔ "بمبئی چھوٹ گیا تو ہم گورے گاؤں آگئے۔ جو جمع پونجی تھی اس سے گزارا کرنے لگے۔ پھر ہم چند عورتوں نے یہ طے کیا کہ حیدر آباد جانا چاہیے۔ وہاں اچھی کمائی ہے لیکن یہ میری دشمن بٹی گورے گاؤں سے جانا نہیں چاہتی تھی۔"

وہ ذرا توقف سے بولی۔ "یہ جب بمبئی میں تھی تب بھی ہر منگل کے دن گورے گاؤں جاتی تھی۔ سری کرشن مراری کا ایک مندر ہے۔ وہاں یہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی بھگوان کے سامنے بھجن گاتی ہے۔ صبح و شام مندر کے فرش کو دھویا کرتی ہے۔ دیواروں' دروازوں اور کھڑکیوں کو صاف کرتی ہے۔ بوڑھے پجاری کی سیوا بھی کرتی ہے۔ یہ بھگوان

کی بھگتی میں اتنی مشہور ہوگئی ہے کہ سب اسے موہن کی میرا کہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ نیک نام ہو رہی ہے، اس کا جیون بھگتی میں گزر رہا ہے پھر تم اسے دلدل میں کیوں لے جانا چاہتی ہو؟"

وہ بولی۔ "بھگتی سے بھگوان ملتا ہے مگر پیٹ نہیں بھرتا اس جنگ کے زمانے میں دیکھو کہ مہنگائی کتنی بڑھ گئی ہے پہلے ایک سیر چاول چار آنے میں ملتا تھا اب دس آنے میں ملتا ہے، یہ جو ساڑیاں ہم نے پہنی ہیں یہ ڈیڑھ روپے کی ایک ملتی تھی۔ اب سوا دو روپے کی ہوگئی ہے کورو کے دربار میں جب درد پدی کی ساڑی اتاری جا رہی تھی تو کرشن بھگوان نے اسے ننگی نہیں ہونے دیا تھا۔ اس کے بدن پر نئی ساڑیاں بھیجتے رہے تھے۔ اس کا تن ڈھانپتے رہے تھے۔ آج میرا کے بدن کی ساڑی پھٹے گی تو کوئی اس کی عزت ڈھانپنے نہیں آئے گا اسے اپنے ہی تن کی کمائی سے اپنا بدن چھپانا ہوگا۔"

میرا خلا میں تک رہی تھی اور زیر لب کچھ کہہ رہی تھی۔ ٹرین تیزی سے پٹڑی بدل رہی تھی۔ اس کے شور میں کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی ماں اونچی آواز میں بولی۔ "میں اسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتی ہوں تو یہ دیکھو، یہ ہونٹ ہلا ہلا کر اس کی مالا جپ رہی ہے۔ تمہیں سنائی نہیں دے گا یہ کہہ رہی ہے۔ کرشنا۔ کرشنا ہرے ہرے۔ ہرے کرشنا ہرے ہرے۔"

میرا جوگن کے گلاب جیسے ہونٹ ہولے ہولے ہل رہے تھے۔ وہ کرشنا کے نام کا جاپ کررہی تھی۔ میں نے اس کی ماں سے کہا۔ "تمہاری بات کسی حد تک درست ہے۔ انسان پاپی پیٹ کے لیے پاپ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن تم اسے مجبور نہیں کر سکیں۔"

پہلے بڑے دنوں تک پیار سے سمجھاتی رہی پھر میں نے زبردستی کی۔"

اس نے کیسے زبردستی کی یہ بتانے سے پہلے میرا جوگن نے کہا۔ "زبردستی نے راون کا بھی سرد ناش (تباہ) کردیا تھا۔ پوجا پیار کا دوسرا نام ہے۔ میں جس سے پیار کرتی ہوں اسی کی پوجا کرتی ہوں۔ میرا بھگوان میرا کرشن مراری ہے۔"

ہمیں اس کے خیالات سن کر اور اپنے کرشن سے اس قدر لگاؤ دیکھ کر مایوسی ہو رہی تھی۔ شاید یہ حسن اور خوشبو سے لبریز پھول ہوس کی سیج پر نہیں آسکے گا۔

ماں نے بیٹی سے کہا۔ میری بات بیچ میں کیوں کاٹ دیتی ہے۔ مجھے پہلے کہہ لینے دے پھر جو کرتی آئی ہے وہی کرتی رہنا۔"

"اور کیا کرے گی جو آتا ہے اسے بھگا دیتی ہے۔"

میرا جوگن نے پھر خلا میں تکتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں بھگاتی بھگوان کرشن اسے بھگا دیتے ہیں۔"

لو اور سنو یہ کوئی ماننے والی بات ہے کہ بھگوان مندر سے نکل کر اس کے کمرے میں آتے ہیں اور ہمارے لائے ہوئے گاہکوں کو اس کے کمرے سے بھگا دیتے ہیں۔ تم ہی بتاؤ

بابو جی کیا تمہیں یقین آتا ہے۔"

بے شک آج کے زمانے میں کون یقین کرے گا۔ یہ بات سراسر مضحکہ خیز ہے کہ بھگوان لاکھوں عورتوں کی عزت لٹنے دیتے ہیں صرف میرا جوگن کی آبرو بچانے آجاتے ہیں۔ مرلی دھر نے کہا۔ "یہ بات ماننے والی نہیں ہے مگر بھگوان کی لیلا اپرم پار ہے۔ (ناقابل فہم ہے)"

میں نے کہا "خدا کے بھید خدا ہی جانتا ہے لیکن جو اس کے پاس جاتے ہیں وہ واپس آ کر کیا کہتے ہیں؟"

"اس کے کمرے سے واپس آنے والے ہرے ہرے کرشنا کا جاپ کرتے ہیں۔ کوئی ہمیں گالیاں دیتا ہے اور کوئی تھوک کر چلا جاتا ہے۔ ایک نے تو ہمیں دھمکی دی ہے کہ آئندہ اس سے پیشہ کرایا تو وہ ہمیں گولی مار دے گا۔"

میں نے اور مرلی دھر نے میرا جوگن کو ایسے دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ اب دیکھنے کا زاویہ بدل گیا سب سے پہلے تو یہ ثابت ہوگیا کہ آج تک کسی نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔ پھر یہ تجسس بھڑکا کہ آخر وہ کیا چیز ہے؟ انگور کا کیسا دانہ ہے کہ کسی لومڑی کے ہاتھ نہیں آرہی ہے؟

اس کی ماں نے کہا۔ "میں اسے چھ برس سے راضی کر رہی ہوں۔ یہ چودہ برس کی تھی میں نے زیادہ اصرار نہیں کیا یہ پندرہ کی ہوئی تب بھی میں نے زبان سے ہی سمجھایا لیکن سولھواں سال شروع ہوتے ہیں میں نے سیٹھ دینا ناتھ سے رقم پکڑلی۔ پھر زبردستی اسے سیٹھ کے مکان میں چھوڑ آئی۔"

اتنا کہہ کر ماں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ میں نے پوچھا "پھر کیا ہوا؟" اس نے گھور کر بیٹی کو دیکھا پھر کہا۔ "ایک گھنٹے بعد سیٹھ نے مجھے بلایا۔ میں نے وہاں پہنچ کر دیکھا یہ لڑکی ایک چوکی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سیٹھ اس کے سامنے فرش پر پلتھی مار کو پوجا کرنے کے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ کر بیٹھا تھا۔ ایک پنڈت جی پوجا کی تھال لے کر کچھ پڑھ رہے تھے اور اس چھوکری کے گلے میں گیندے کے پھولوں کی مالا ڈال رہے تھے۔"

حیرت کا مقام تھا کہ اسے گناہوں کی سیج پر بلانے والا سیٹھ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ رہا تھا اور ایک مہاگیانی پنڈت سے پوجا کرا رہا تھا۔ آخر کیا چمتکار (معجزہ) ہوا تھا کہ ایک شیطان انسان بن گیا تھا؟ آخر یہ کیا بھید تھا۔؟

بھید وہ ہوتا ہے جو نظر نہیں آتا سنائی نہیں دیتا سمجھ میں نہیں آتا۔ جستجو کو چابک مارتا ہے۔

اس کا وجود نہیں ہوتا اگر ہو تو بھید نہیں رہتا۔
دوسروں کو اندھا تسلیم کرانے کا نام بھید ہے۔
بھید نظر کے پیچھے ہو تو خدا ہے نیت کے پیچھے ہو تو شیطان ہے۔

میرا جوگن کا جو بھید تھا اسے ایک دن کھل جانا تھا کیونکہ کائنات کے سارے بھید کھل جاتے ہیں۔ ایک وہی اوپر والا بھیدی ہے جو کبھی نہیں کھلتا۔

میرا کی ماں نے کہا۔ "میں نے سیٹھ دینا ناتھ سے پوچھا' یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ میری بیٹی کی پوجا کیوں کر رہے ہیں؟"

سیٹھ نے کہا۔ "تم کیسی ماں ہو؟ ایسی بیٹی کو پاپ کے راستے پر چلاتی ہو' جس کے شریر 'بدن" میں سویم بھگوان پدھارتے ہیں۔"

"سیٹھ کی یہ بات سن کر میں نے حیرانی سے اپنی بیٹی کو دیکھا میں نے اسے نو مہینے پیٹ میں رکھا۔ اسے پیدا کیا اور مجھے کبھی خبر نہ ہوئی کہ اس کے اندر بھوان رہتے ہیں۔ پھر اس کے گاہک کو کیسے معلوم ہوگیا۔ میں نے پوچھا سیٹھ جی! کیا آپ نے بھگوان کے درشن کیے ہیں؟"

سیٹھ نے کہا۔ "معاف کرو مائی میں ایک بہت بڑے پاپ سے بچ گیا ہوں۔ مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ میرا دیوی کا حکم ہے کہ میں اس بارے میں کسی سے کچھ نہ کہوں۔"

میں اسے گھر لے آئی۔ اچھی طرح مار پیٹ کر پوچھا' یہ ناٹک کیا ہے؟ ایک کسبی سے دیوی کیسی بن گئی۔ چل کپڑے کھول۔ میں بھی تو دیکھوں بھگوان کہاں ہیں۔

اس لڑکی نے مجھے لباس اتارنے نہیں دیا۔ میرے پیٹ سے جنم لے کر مجھ سے پردہ کرتی ہے۔ میں زبردستی کرنے لگی تو مجھے دھکا دے کر کمرے میں بند ہوگئی ماچس کی ڈبیا اور گھاس لٹ (مٹی کا تیل) کی بوتل اٹھا کر بولی۔ "یہ بدن پاک ہے میں اس پر ایک گناہگار ماں کی نظر پڑنے نہیں دوں گی۔ زبردستی کرو گی تو جل مروں گی۔"

میں اپنی بیٹی سے ہار مان گئی ہاتھ جوڑ کر بولی باہر آجا۔ اب تجھے ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔

یہ بات مجھے کھٹکتی ہے کہ یہ اپنا بدن مجھ سے کیوں چھپاتی ہے؟ میں ماں ہوں۔ اپنی ماں اور بہنوں سے بھی کیوں چھپتی ہے؟ جب یہ پندرہ برس کی تھی تب سے ایسا بلاؤز پہنتی ہے جس سے کمر اور پیٹ کھلے نہیں رہتے۔ بازو کہنی تک چھپے رہتے ہیں۔ گریبان اتنا تنگ ہوتا ہے کہ گلے سے نیچے بدن کی جھلک نہیں ملتی۔

اس کی ماں سے یہ سن کر میں نے اور مرلی دھر نے توجہ سے جوگن کو دیکھا۔ واقعی وہ گردن سے ٹخنوں تک لباس میں چھپی ہوئی تھی۔ ماں کو یہ غصہ تھا کہ بیٹی نے سیٹھ کی رقم واپس کیوں کردی؟ اگر سیٹھ کو اس میں بھگوان نظر آرہا تھا تو کم از کم چڑھاوا قبول کرلیتی لیکن وہ کہتی تھی پوجا کو پیسہ نہیں صرف پھول چاہئیں۔ مجھے رقم نہ دو عقیدت کے پھول دو۔

ہم نے دیکھا میرا جوگن کے گلے میں گیندے کے پھولوں کی مالا تھی اسے پھول مل رہے تھے۔ ماں کی آمدنی خاک میں مل رہی تھی۔ وہ بولی۔ "پتا نہیں اس چھوکری کے اندر کیسا بھگوان ہے جو صرف آبرو بچاتا ہے اگر وہ دولت دیتا تو میں بیٹی کو کبھی مجبور نہ کرتی

جب کھانے کو روٹی پہننے کو کپڑا اور رہنے کو مکان ملے گا تو بھگوان کو چوکیداری کے لیے اس کے پاس نہیں آنا پڑے گا کوئی ماں چھنال نہیں ہوتی۔ یہ بات بھگوان کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔

اس ماں کے لیے ایک مشکل یہ بھی تھی کہ گورے گاؤں کے رہنے والے میرا جوگن کی عزت کرتے تھے۔ ہر منگل کی صبح اس کا بھجن سننے کے لیے مندر میں بھیڑ لگی رہتی تھی۔ پجاری اس کے بھجن سے ہی پوجا شروع کرتا تھا۔ وہ تمام دن مندر میں یا پجاری کی کٹیا میں رہتی تھی۔ وہاں کے لوگ اس کی ماں اور بہنوں کو نفرت سے دیکھتے تھے۔ میرا کا لحاظ کرکے انہیں کچھ کہتے نہیں تھے۔ وہ لوگوں کو سمجھاتی تھی "برے کی برائی اگر دور نہیں کرسکتے ہو تو انہیں گالیاں نہ دو' انہیں بھگوان پر چھوڑ دو۔ میری چنتا (فکر) نہ کرو۔ مجھے مندر سے اٹھا کر کوئی دلدل میں نہیں لے جاسکے گا۔ دروپدی کا کرشن اور میرا کا موہن میرا محافظ ہے۔"

میرا جوگن کی ماں بمبئی سے نکالے جانے کے بعد گورے گاؤں میں نہیں رہنا چاہتی تھی۔ ان کی ہم پیشہ عورتیں اور ان کے مرد حیدر آباد جارہے تھے۔ ایک دلال نے یہ بات کان میں پھونکی کہ کوشش کی جائے تو حیدر آباد کے دربار میں میرا کی رسائی ہوسکتی ہے ریاست حیدر آباد میں ان دنوں نظام عثمان علی خان کے ساتویں اور آخری نظام حکمرانی کر رہے تھے۔ وہ حکومت برطانیہ کے وفادار اور معتبر خاص تھے اور دنیا کے امیر ترین حکمران کہلاتے تھے۔

میرا کی ماں پورے یقین سے سمجھتی تھی کہ بیٹی بڑی ڈراما باز ہے۔ خاندانی دھندے سے دور رہنے کے لیے جوگن بننے کا ڈھونگ رچا رہی ہے۔ اس نے ایک سیٹھ کو الو بنایا ہے۔ آئندہ دوسرے گاہک کو نہیں ٹرخا سکے گی۔

وہ بیٹی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "میری بات مان لے۔ حیدر آباد چل ہمارے وارے نیارے ہوجائیں گے۔"

میرا جوگن نے کہا "تم ماں ہو جہاں لے جاؤ گی وہاں جاؤں گی میرا کچھ نہیں بگڑے گا لیکن سوموار کی رات گورے گاؤں واپس آجاؤں گی تاکہ منگل کی صبح مندر میں بھجن گانے اور پوجا کرنے جاسکوں۔"

یہ اس کا معمول تھا۔ تقریباً پانچ برس سے وہ ہر منگل کو وہاں جاتی تھی اگلے منگل میں ابھی پانچ دن باقی تھے ماں نے سوچا اتنے دنوں میں حیدر آباد جاکر دربار شاہی میں قسمت آزمائی جاسکتی ہے اگر وہاں کام نہ بنا تو گورے فوجی کچھ کم نہ تھے اچھی خاصی رقمیں لٹایا کرتے تھے۔

وہ سب اس شہر کی سمت روانہ ہوگئے اس قافلے میں پندرہ عورتیں اور چار مرد تھے وہاں پہنچ کر پتا چلا کہ بمبئی شہر کی طرح ادھر بھی عورتوں کو فوجی کیمپ سے دور بھگایا جاتا

ے۔ نام پلی کے اشٹیشن پر ہی پولیس والوں نے انہیں روک دیا۔ شہر میں داخل ہونے نہیں دیا۔ اتنی مہربانی کی کہ آوٹر سگنل سے ذرا دور ڈیرا ڈالنے کی اجازت دے دی۔

چونکہ وہ شہر میں نہیں جاسکتی تھیں اس لیے ان کے مرد جاتے تھے ان دلالوں میں گردھراما کی پہنچ دربار دکن کے دیوان جی تک تھی دیوان جی پرانے پاپی تھے جس کے حسن و شباب کا قصیدہ سنتے تھے اسے ضرور طلب کرتے تھے اگر کوئی بازار کی ہو تو اسے شہر کے باہر ریسٹ ہاؤس میں بلاتے تھے۔

دیوان جی نے گردھراما سے میرا کی تعریفیں سن کر کہا۔ "آج کل عورتوں نے بڑی گند پھیلائی ہے اگر تو کسی گندی کو بلا لائے گا تو تجھے کھڑے گولی ماردوں گا۔"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "حضور! میں تو آپ کی چاکری کے لیے پیدا ہوا ہوں آپ ماریں گے تو مرجاؤں گا۔ پر دھوکا نہیں کروں گا۔ وہ بلا کی خوبصورت جوگن ہے حضور! اسے تو اس کی ماں نے بھی ہاتھ نہیں لگایا ہے۔"

"گدھے کے بچے! اس پیشے میں جوگن کہاں سے آگئی؟"

"پتا نہیں حضور! شاید بھگوان نے آپ کی خاطر اسے بچائے رکھنے کے لیے جوگن بنادیا ہے۔"

دیوان جی نے خوش ہو کر مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "منیم جی سے سو روپے لے جاؤ۔ چھوکری کو نئے جوڑے میں لاؤ۔ پسند آگئی تو اس کی ماں کو ہزار دے دوں گا۔"

ماں سو روپے دیکھ کر خوشی سے کھل گئی۔ گردھر نے کہا۔ "تیری بیٹی آج رات بھگوان کو نہیں بلائے گی تو صبح تیری ہتھیلی پر ہزار روپے ہوں گے۔"

ماں گردھر کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "ہائے رام! مجھے تو ہزار تک گنتی نہیں آتی۔"

وہ بولا۔ "میں گن کر دوں گا دیوان جی نے اسے دلہن بنا کر لانے کو کہا ہے مگر تیری بیٹی نیا جوڑا بھی گیروے رنگ کا ہی مانگے گی۔ اسے سمجھا کم سے کم آج سرخ جوڑا پہن لے۔"

میرا نے کہا۔ "میں تو پیا کی جوگن ہوں۔ چاہے ریشم کمخواب پہنا دو مگر گیروا رنگ ہی پہنوں گی۔"

ماں جھگڑا بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ ہزار روپے ملنے والے تھے اندھیرا ہوتے ہی اسے من پسند لباس پہنا کر ریسٹ ہاؤس میں لے آئی۔ وہاں ایک کمرے کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ اسے اس کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ وہ خود گردھر کے ساتھ برآمدے کے فرش پر آکر بیٹھ گئی۔

رات کے نو بجے دیوان جی اپنی موٹر گاڑی میں آئے۔ شراب کے نشے میں موڈ اچھا تھا۔ وہ برآمدے سے گزرتے ہوئے اس کی ماں کے پاس دس روپے کا ایک نوٹ پھینک کر کمرے میں چلے گئے۔

گردھر نے نوٹ اٹھا کر کہا "دیکھا میرا کی ماں؟ دیوان جی کتنے دیالو ہیں۔ ابھی ایک تھال

میں مٹھائی اور ہزار روپے بھیجیں گے۔"

ماں دونوں ہاتھ جوڑ کر تاریک آسمان کو دیکھ رہی تھی اور پرارتھنا کر رہی تھی کہ آج کوئی گڑ بڑ نہ ہو۔ جوگن کا چولا اتر جائے۔ وہ زیر لب بڑبڑائی۔ "ہے بھگوان! آج میری سن لے۔ آج تو مندر سے باہر نہ نکل میری بیٹی کے کمرے میں نہ جا۔ میں کل ہی تیری مورتی کو چاندی کا مکٹ پہناؤں گی۔

ہر سو رات کا گہرا سناٹا تھا بند کمرے میں بھی پراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ یہ خاموشی یقین دلا رہی تھی کہ بھگوان مندر ہی میں ہے لیکن اس کی پرارتھنا (دعا) پوری نہیں ہوئی اندر سے دیوان جی کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ "نہیں نہیں مجھے معاف کردو۔ کرشنا کرشنا ہرے ہرے اِدھر بھی کرشنا اُدھر بھی کرشنا میں نے میرا کی بھگتی سنی تھی مگر ایسی بھگتی ایسی جوگن پہلی بار دیکھ رہا ہوں مجھے شما کرو بھگوان! یہ تمہاری ہے میں اسے ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ یہ تمہاری' صرف تمہاری ہے۔"

اس کی ماں کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑگئے۔ اندر سے جان نکلنے لگی۔ سمجھ میں آگیا کہ اندر پاپ نہیں ہو رہا ہے پوجا ہو رہی ہے۔ پاپ ہوتا تو ہزار روپے ملتے پوجا کا ایک پیسہ بھی نہیں ملنے والا تھا۔

اندر سے دیوان جی کی آواز آرہی تھی۔ پھر وہ دروازہ کھول کر دونوں ہاتھ جوڑے "کرشنا کرشنا ہرے کرشنا" جپتے ہوئے باہر برآمدے میں آئے۔ اس کی ماں کو دیکھ کر رک گئے۔ غصے سے گھور کر بولے۔ "یہ تیری بیٹی ہے؟"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "جی مہاراج! میری ہے۔"

وہ گرجنے لگے۔ "جھوٹ مت بول۔ نہیں تو کھال کھنچوادوں گا۔ سچ بتا کیا تونے اسے اپنے پیٹ سے پیدا کیا ہے؟"

"سچ کہتی ہوں مہاراج! بھگوان سے کوئی بھید نہیں چھپا ہے۔ میں نے اسے نو مہینے پیٹ میں رکھ کر پیدا کیا ہے۔"

"پھر تو تجھے گولی مار دینا چاہیے۔ سور کی بچی! تو پُن پیدا کرکے پاپ کمانا چاہتی ہے۔ وہ کرشن کی رادھا اور موہن کی میرا ہے یہ دیکھ میں نے معافی مانگنے کے لیے اس کے چرنوں میں پانچ ہزار روپے رکھے اس نے اتنی بڑی رقم کو سوئیکار نہیں کیا اور تو ہزار روپلی کے لیے اسے گناہ کی دلدل میں گرانے آئی تھی؟"

پھر انہوں نے گردھر کو ایک لات مار کر کہا۔ "حرام کے جنے! تونے اسے جوگن کہا۔ یہ کیوں نہ بتایا کہ وہ موہن کی میرا ہے اس کی پوترتا (تقدس) کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔"

پھر وہ گرج کر سپاہیوں سے بولے۔ "ان دونوں کو جوتے مارو۔"

میرا جوگن نے کمرے کے اندر کھلے ہوئے دروازے کی آڑ سے کہا۔ "دیوان جی! اس ماں نے مجھے جنم دیا ہے اسے کوئی ہاتھ نہ لگائے۔"

دیوان جی نے دروازے کی طرف گھوم کر دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا "دھن ہو دیوی جی! آپ کی خواہش کا احترام کیا جائے گا۔ آپ اس ریسٹ ہاؤس میں جب تک چاہیں رہ سکتی ہیں۔ کرشنا کرشنا ہرے کرشنا..."

وہ جاپ کرتے ہوئے برآمدے سے اترے پھر اپنی موٹر گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ ماں رونے لگی۔ کمرے کے اندر آکر بولی۔ "اری او جنم جلی! کیا تو میری جان لے کر رہے گی۔ آخر تو کیا ہے؟ تیرے اندر بھگوان ہیں تو مجھے دکھاتی کیوں نہیں؟ وہ کیسا بھگوان ہے جس نے پانچ ہزار روپے لوٹا دیئے۔ ہائے میں مرجاؤں۔ بمبئی کی تمام کسبیوں کو بیچ دو تب بھی اتنے روپے نہیں ملیں گے اور تو نے یہ دولت ٹھکرادی ہائے! تو نے ہماری قسمت پھوڑدی۔

میرا فرش پر پالتھی مارے بیٹھی تھی دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھے پھر دھیان گیان میں ڈوب کر بولی۔ ماں! قسمت سیدھی تدبیر سے اور سچے عمل سے بنتی ہے۔

تیری تدبیر اور ہے میرا عمل اور ہے۔

تجھے سمجھ لینا چاہیے کہ یہ قسمت ایک بازاری عورت ہے، کسی وقت بھی ساتھ چھوڑ دیتی ہے کسی وقت بھی پانچ ہزار چھین لیتی ہے۔

مانگنے اور چھیننے کے عمل کو سمجھو یہ قسمت مانگنے والے ہاتھ میں آئے تو ایک وقت کی روٹی ہے۔

یہ چھیننے والی تجوری میں آئے تو روٹی بھی ہے، بوٹی بھی ہے۔

ایک اچھے آدمی کی قسمت غریب ہوسکتی ہے، بُری نہیں ہوسکتی ہے۔

ایک بُرے آدمی کی قسمت امیر ہوسکتی ہے کبیر نہیں ہوسکتی۔

ہاتھ کی آڑی ترچھی اور الجھی ہوئی لکیریں کہتی ہیں کہ یہ سیدھی طرح نہیں آتی۔

اس لیے تدبیر اس کی ماں ہے اور عمل اس کا باپ ....

پھر میرا جوگن نے آنکھیں بند کرلیں اور گیان دھیان میں ڈوب گئی۔

ٹرین تیز رفتاری سے جارہی تھی۔ اسٹیم انجن کا دھواں کھڑکیوں کے راستے کمپارٹمنٹ کے اندر آرہا تھا۔ اس دھوئیں میں سامنے بیٹھی ہوئی میرا جوگن کا اجلا روپ یوں لگ رہا تھا جیسے بادلوں سے کوئی اپسرا آکر بیٹھ گئی ہو۔ اتنی دیر سے اسے دیکھتے رہنے اور اس کے بارے میں سنتے رہنے کے باعث ہمارے اندر سے مطالبات چیخنے لگے تھے۔

خدا نے انسان کی فطرت کیا بنائی ہے۔ یہ بات ..... آدم زاد کی گھٹی میں ڈال دی ہے کہ جو کچھ پسند ہو اسے مانگ لو یا اسے چھین لو۔ خواہ عرش کی بلندیوں سے فرش کی پستیوں میں جاگرو مگر اسے پاؤ پھر بعد میں پچھتاؤ۔

اگرچہ وہ پراسرار تھی جانے کیسے بھیدوں سے بھری ہوئی تھی لیکن خطرناک نہیں تھی۔ اس کی تنہائی میں جو لوگ جاچکے تھے وہ خیریت سے واپس آئے تھے۔ ان میں سے کسی کو کبھی نقصان نہیں پہنچا تھا بلکہ انہیں نیکی اور راستی ملی تھی۔ وہ گناہ سے باز آگئے تھے۔

مرلی دھر نے میرے قریب جھک کر کہا۔ "ہم بھی ٹرائی کریں تو نقصان نہیں ہوگا۔ ہاتھ آگئی تو کیا کہنے۔ نہ آئی اور سچ مچ جوگن ثابت ہو تو کم از کم اکیلے میں اس کا نظارا تو کرلیں گے۔"

اس نے بڑے مزے کی بات کہہ دی۔ دونوں صورتوں میں دلچسپی اور فائدہ تھا۔ گناہ کی نوبت نہ آتی تب بھی نگاہوں کی پیاس بجھتی میں نے میرا سے پوچھا۔ "ہم سے بات نہیں کروگی؟"

وہ بولی "جب سے یہاں آئے ہو تمہاری آنکھیں میرے بدن سے بات کر رہی ہیں۔"

مرد پہلا حملہ آنکھوں سے کرتا ہے۔

وہ بولتا بوڑھی ماں سے ہے اور دیکھتا جوان بیٹی کو ہے۔

یوں زبان کھولنے سے پہلے اپنی نیت سے بول دیتا ہے۔

اگر مرد کو سب کچھ ملتا صرف آنکھیں نہ ملتیں تو اس دنیا سے آدھا پاپ ختم ہوجاتا۔

"بولو اب کیا رہ گیا ہے بولنے اور سمجھنے کے لیے؟"

میں نے کہا۔ "بے شک جب مرد کی نیت کو سمجھنے والی ہو تو بولنے کے لیے کچھ نہیں رہ جاتا لیکن تمہارا جیون تمہارا آدرش دوسروں سے مختلف ہے اس لیے تمہیں سمجھنا

ضروری ہے۔

اس نے آنکھیں بند کرلیں پھر کہا۔ "آدرش کتنے ہی اونچے ہوں عورت کتنی ہی نیک پارسا اور معتبر ہو مرد کا سارا دھیان عورت کے بدن پر رہتا ہے۔"

جب سے انسان پیدا ہوا ہے' تب سے سمجھایا جارہا ہے یہ گناہ کا پھل ہے اسے نہ کھاؤ مگر آدمی چرا کر کھاتا ہے چھین کر کھاتا ہے مگر کھاتا ضرور ہے اور پچھتاتا ضرور ہے۔

حقیقت سے آنکھیں چرا کر اندھا بننا ضروری ہے تو ٹھوکر کھانا بھی ضروری ہے۔

اس کی ماں نے کہا "بابو صاحب! اس سے بات نہ کریں یہ گیان دھیان والی اور نہ سمجھ میں آنے والی باتیں کرتی ہے۔ آپ مجھ سے باتیں کریں۔"

مرلی دھر نے کہا۔ "کیا بات کریں تمہاری بیٹی نے کسی گاہک کی جیب سے پیسہ نکلنے نہیں دیا۔ تمہیں پھوٹی کوڑی بھی نہ ملی۔ بمبئی سے ملٹری پولیس نے نکال دیا۔ حیدر آباد سے دیوان جی نے بھگادیا۔ اس کے باوجود تم اسے کیش کرنے کی دھن میں لگی ہو۔"

وہ بولی "دھن پکی ہو تو دھن ملتا ہے ہمیں لڑکیوں کے انکار کو اقرار میں بدلنا آتا ہے میری بڑی بیٹی مالتی چھ مہینے میں راضی ہوئی تھی منجھلی بیٹی شردا سار کھا کھا کر دس مہینے میں راضی ہوئی بس یہ کمینی بہت ٹائم لے رہی ہے میں اسے اب آخری موقع دوں گی۔ اگر اس بار کوئی واپس جائے گا تو میں اسے غنڈوں کے ساتھ کمرے میں بند کردوں گی۔"

میرا پریشان ہو کر ماں کو تکنے لگی۔ یہ اس بازار کا آخری حربہ تھا جس طرح گرفت میں نہ آنے والے مجرم کے پیچھے شکاری کتے چھوڑ دیے جاتے ہیں اسی طرح قابو میں نہ آنے والی کو چرسیوں اور شرابیوں کی چنڈال چوکڑی میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔

یہ میرا کے لیے فکر کا مقام تھا کیونکہ اس کی تنہائی میں اب تک ایسے عیاش لوگ آئے تھے جو سوسائٹی میں عزت اور مرتبہ رکھتے تھے۔ گناہ کرنے کے باوجود بھگوان سے ڈرتے تھے اور مذہب کا احترام کرتے تھے لیکن غنڈوں موالیوں کو نہ عزت کی پروا ہوتی ہے اور نہ ہی وہ کسی مذہب کو مانتے ہیں۔ شراب اس لیے پیتے ہیں چرس کا دم اس لیے لگاتے ہیں کہ دل سے پولیس اور قانون کا ڈر نکل جائے رہی بھگوان کی بات تو وہ اگر ان کے سامنے بند کمرے میں آبھی جائے تب بھی وہ غنڈے موالی جوگن کی ایسی کی تیسی کر دیتے۔

ماں کی اس تدبیر نے میرا کو پریشان کردیا۔ وہ بے بسی سے مجھے اور مرلی کو یوں دیکھنے لگی جیسے ہمیں غنڈوں پر ترجیح دے رہی ہو۔ میں نے اس کی ماں سے پوچھا۔ "کیا گورے گاؤں جارہی ہو؟"

"ہاں ہم بمبئی پہنچتے ہی پہلی بس پکڑ کے ادھر چلے جائیں گے۔"

مرلی دھر نے کہا "ہم رات دس بجے بمبئی پہنچیں گے ہوٹل میں میرا اور اجیم بھائی کا ایک ایک کمرا ہوگا تم ماں بیٹی کے لیے بھی تیسرا کمرا لے لیں گے۔"

"لیکن اس شہر میں ہمارے لیے پابندی ہے۔ اگر پکڑے گئے تو سیدھے جیل جائیں

گے۔"

"یہ نوبت نہیں آئے گی۔ ہم وہاں رات کو پہنچ رہے ہیں صبح ہوتے ہی تمہیں لاری اڈے پہنچادیں گے۔ ہوٹل پہنچ کر ہم تمہیں پانچ سو روپے دیں گے۔"

وہ اپنی خوشی کو چھپاتی ہوئی بولی۔ "نہیں بابو صاحب! پانچ سو کم ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں بھی پانچ سو دوں گا۔ اس طرح ایک ہزار ہو جائیں گے۔ زیادہ لالچ نہ کرو۔ لالچ کرتی ہو۔ اسی لیے تمہیں کچھ نہیں ملتا ہمیشہ بڑی رقم آتے آتے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ چھوٹی رقم پر گزارا کرو۔"

وہ چپ رہی میرا کا سر بھی جھکا ہوا تھا۔ وہ زیر لب کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ شاید کوئی جاپ کر رہی تھی۔ عبادت کے وقت تقدس اور پاکیزگی کا احساس بڑھ جاتا ہے لیکن پوجا کے سے پاکیزگی کے ساتھ ساتھ اس کی سندرتا اور بڑھ جاتی تھی۔ سری کرشن بھگوان سے گہرے لگاؤ کے باوجود اس کا حسن ہماری ہوس کو پکار رہا تھا۔

بمبئی پہنچ کر میرا جوگن کی دونوں بہنیں گورے گاؤں کی دوسری عورتوں کے ساتھ چلی گئیں۔ ہم نے ایک ہوٹل میں تین کمرے لیے۔ ان دنوں پانچ روپے میں اچھے ہوٹل کا ایک کمرا مل جایا کرتا تھا۔ وہاں اس کی ماں نے پیٹ بھر کر دال بھات اور گوشت کا سالن کھایا۔ ہم سے کھایا نہیں گیا۔ ہمیں میرا کی بھوک تھی وہ مرلی دھر کے کمرے میں تھی اور مرلی دھر میرے کمرے میں کافی بے چین ... ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔

میں نے پوچھا "کیا ہوگیا؟ جاتے کیوں نہیں؟"

وہ میری طرف جھک کر آہستگی سے بولا۔ "کیا ایسا نہیں لگتا کہ وہ سامنے ہو تو ہوس بڑھتی ہے اور سامنے نہ ہو تو اس کی پوجا اس کی شردھا یاد آتی ہے؟"

"کیا پوجا کرنے کا ارادہ ہے؟"

"نہیں یار! سمجھا کرو۔ تھوڑی دیر کے لیے اس کو خیال کی آنکھوں سے دیکھو کیا وہ کنول کی طرح پوتر (پاک) اور برف کی جیسی ٹھنڈی نہیں لگتی ہے کیا ایسا نہیں لگتا کہ اسے ہاتھ لگاؤ گے تو ٹھنڈے پڑجاؤ گے؟"

"یعنی تم ٹھنڈے پڑ رہے ہو؟"

"یار! میں تمہیں محسوس کرنے کو کہہ رہا ہوں تھوڑی دیر کے لیے مان لو اس کے ساتھ بھگوان ہوگا تو کیا ہوس کی اور سارے ارمانوں کی آگ ٹھنڈی نہیں پڑے گی؟"

"اس بڑھیا کو پانچ سو دینے کے بعد تمہیں بھگوان یاد آرہا ہے اور اس حسینہ کی بھگتی یاد آرہی ہے ایسا کرو تم یہاں بیٹھو میں اس کے پاس جاتا ہوں۔"

وہ تن کر بولا کبھی نہیں وہ ہندو ہے ہمارے دھرم کی ہے پہلے میں جاؤں گا۔"

"تو پھر جاؤ۔ میں جانتا ہوں تمہارا انجام کیا ہوگا تم جانے سے پہلے ٹھنڈے ہو۔ ایسے مذہبی عقیدے سے جاؤ گے تو ہرے کرشنا کہتے ہوئے واپس آؤ گے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے یار اجیم بھائی! ایک پیگ اور دو میں بھگوان کو بھولنا چاہتا ہوں۔"

میں نے اپنے اور اس کے لیے دو بڑے پیگ بنائے وہ سوڈا ملا کر پی گیا۔ ہمیں زیادہ پینے کی عادت نہیں تھی بس یونہی کبھی مستی میں آنے کے لیے تھوڑی سی پی لیتے تھے اس لیے تیسرے پیگ میں اسے چڑھ گئی وہ سینہ تان کر بولا میں جارہا ہوں ماں! مجھے آشیرواد دے۔"

میں نے کہا۔ "واہ بیٹے! مصیبت کے وقت باپ یاد آتا ہے' تجھے ماں یاد آرہی ہے۔"

وہ ڈگمگاتا ہوا دروازے تک گیا پھر بولا۔ "دوست مصیبت کے وقت دوست کے کام آتا ہے آؤ دوست! مجھے میدان جنگ میں چھوڑ آؤ۔"

میں نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا دروازے کو کھولا۔ پھر ہم ڈگمگاتے ہوئے کاریڈور میں آئے ساتھ والا کمرا مرلی دھر کا تھا۔ بند دروازے کے پیچھے میرا جوگن تھی۔ اندر سے دھیمی دھیمی آواز آرہی تھی وہ بھجن کے بول الاپ رہی تھی۔ آواز میں ایسا رس تھا جیسے شہد گھل رہا ہو اور شراب کا توڑ کر رہا ہو۔ وہ ایسے جذبوں میں ڈوب کر گارہی تھی جیسے بھگوان اس کے سامنے آبیٹھے ہوں اور وہ ہاتھ جوڑ کر زمانے کی بے ثباتی خود غرضی اور گناہوں کی آلودگی کا دکھڑا رو رہی ہو۔

مرلی دھر کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر خلا میں تک رہا تھا اور اس دروازے کے قریب دیوار سے لگ گیا تھا میں نے کان میں کہا۔ "رک کیوں گئے؟ دروازہ کھولو۔"

اس نے پوچھا۔ "کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ بھگوان اس کے سامنے ہیں۔"

میں نے انکار میں سرہلایا۔ "نہیں مجھے ایسا نہیں لگتا۔"

وہ میرے سینے پر انگلی رکھ کر بولا "تم ناستک (منکر) ہو اس لیے تمہیں بھگوان دکھائی نہیں دے رہا ہے میں باہر سے دیکھ رہا ہوں وہ اندر ہے۔"

"تو پھر نہیں جاؤ گے؟"

"بھجن ختم ہوجائے گا۔ بھگوان چلے جائیں گے تب جاؤں گا۔"

وہ کاریڈر کی دیوار سے ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھ گیا۔ آنکھیں یوں بند کرلیں جیسے پوری شردھا سے بھجن سن رہا ہو۔ ایک منٹ کے اندر ہی میں نے خراٹوں کی آواز سنی۔ وہ بیٹھے بیٹھے سوگیا تھا۔

آدمی کے اندر کسی کو پالینے کے کیسے کیسے طوفان اٹھتے ہیں۔ پھر جتنے جوش و خروش سے اٹھتے ہیں اتنی ہی جلدی بیٹھ جاتے ہیں۔

مرلی دھر کی یہ حالت دیکھ کر سمجھ میں آرہا تھا کہ ہم گناہ کے وقت خدا کو بھول جاتے ہیں اس لیے گناہ آسان ہوجاتا ہے اگر ہر عیش کدے میں ہر عورت کی سیج پر بھگوان کی جھلک نظر آئے تو ہر عیاش ہرے کرشنا کہتا ہوا یا توبہ کرتا ہوا اندھی ہوس کے کمرے سے نکل آئے گا یا اس دروازے پر عقیدت سے سوجائے گا۔

لیکن میں تو مسلمان ہوں اگر میرا کے کمرے میں بھگوان دکھائی دیتے ہیں تو دکھائی دیں میں تو خدا سے ڈرتا ہوں میں یہ پوچھنا بھول گیا تھا کہ میرا کی تنہائی میں کبھی کوئی مسلمان گاہک یا گورا فوجی آیا تھا؟"

میں نے اس کی ماں سے نہیں پوچھا تھا اور اب پوچھنے کی نہیں دریافت کرنے کی گھڑیاں آگئی تھیں۔ میں نے مرلی دھر کو وہیں چھوڑا اور دروازہ کھول کر اندر آگیا۔

وہ گیروے رنگ کے لباس میں فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بھجن اور بھگتی سے اسے فرصت مل گئی تھی۔ میں نے کہا۔ "نیچے کیوں بیٹھی ہو؟ پلنگ پر آؤ۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ سر جھکا کر دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھنے کے لیے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ پوچھتی رہو۔"

"کیا مسلمان ہو؟"

مجھے چند ساعتوں کے لیے چپ سی لگ گئی۔ جب پوچھا جائے کہ مسلمان ہو؟ تو ہر مسلمان جواب میں الحمد للہ کہتا ہے لیکن گناہ کے بند کمرے میں یہ رحمانی الفاظ ادا نہ ہوسکے۔ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "ہاں مسلمان ہوں۔"

اس نے دانستہ یا نادانستگی میں احساس دلایا کہ یہاں آتے ہی میری زبان سے مقدس الفاظ چھن گئے ہیں۔ اس نے پوچھا۔ "کیا میرا بھگوان اور تمہارا خدا ہر جگہ رہتا ہے؟"

"بے شک .. ہر جگہ ..."

"کیا یہاں بھی ہے؟ ہوٹل کے اس بستر پر بھی؟"

میں نے ناگواری سے پوچھا۔ "یہ کیا بکواس ہے؟ کیا تم اسی طرح دین دھرم کی باتیں کر کے آنے والوں کو بھگاتی رہتی ہو؟"

"میں نے آج تک کسی کو نہیں بھگایا ہوس کی مستی میں آنے والے بندگی کی مستی میں ڈوب کر چلے جاتے ہیں۔"

"میں بندگی کمرے کے باہر چھوڑ کر آیا ہوں۔"

"مگر تم اپنے اندر کے انسان کو باہر نہیں چھوڑ سکتے۔"

میں نے قریب آکر اس کے چکنے چہرے کو چھو کر کہا۔ "قدرت نے تمہیں انسانیت کا جنازہ نکالنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ ممانعت ہے کہ اس شجر کو ہاتھ نہ لگائیں مگر ہم لگاتے ہیں ہم آدم علیہ السلام کے بیٹے ہیں۔ بنت حوا کے ساتھ وہی روایتی حکم عدولی کرتے ہیں۔"

اس نے پیچھے ہٹ کر التجا کی "مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔"

"وہ تو لگا چکا ہوں۔ تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ آدمی سے زیادہ بے باک اور بے شرم کوئی نہیں ہوتا۔ جب وہ شرم دلانے سے نہیں شرماتا اور خوف دلانے سے خوفزدہ نہیں ہوتا

تو پھر کیوں وقت ضائع کرتی ہو؟"

وہ سر جھکا کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پلنگ کے پاس گئی۔ پھر بستر کے سرے پر یوں بیٹھ گئی جیسے ہارا ہوا سپاہی ہتھیار ڈال رہا ہو۔ وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "میں کسی سے پیار کرتی ہوں۔"

میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ "کیا وہ تمہاری ماں کو تمہارے پیار کی قیمت ادا نہیں کرتا ہے؟"

"وہ ہوتا تو مجھے تم سے چھین کر لے جاتا۔"

"کیا وہ مرچکا ہے؟"

اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر مجھے گھورا پھر احساس ہوا کہ خریدی گئی ہے' آنکھیں نہیں دکھاسکتی۔ وہ خلا میں دیکھتی ہوئی بولی "جب تک میرا یقین زندہ ہے وہ زندہ رہے گا۔"

"وہ تمہیں چھوڑ کر کہاں گیا ہے؟"

"میرے لیے کمانے اور گھر بنانے گیا ہے۔"

"تمہارا انکار پانچ چھ برس سے جاری ہے کیا وہ اب تک تمہارے لیے گھر بنا رہا ہے؟"

"تاج محل ایک دن میں نہیں بن جاتا۔ محبت کرنے والوں کو پہاڑ توڑنے پڑتے ہیں۔ جب وہ مزدوری کرتا تھا پتھر توڑتا تھا اور دوسروں کے لیے عمارتیں بناتا تھا تو اس کے ہاتھوں میں چھالے دیکھ کر سوچتی تھی تاج محل سستا ہے' بن جاتا ہے۔ جھونپڑی بہت مہنگی ہوتی ہے غریب شاہ جہاں کبھی بنا نہیں پاتا۔"

میں نے پوچھا۔ "وہ کہاں ہے؟"

"یہیں کہیں بمبئی میں ہے۔ میرے لیے محنت کررہا ہے ہم دونوں گورے گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ وہ پجاری کا بیٹا تھا۔ اس کا نام کرشن مراری تھا۔ ہم اسے کرشنا کہتے ہیں ہماری دوستی بچپن سے اتنی گہری اور دل پر اثر کرنے والی تھی کہ میں پوجا کے وقت کرشن بھگوان کی مورتی کو دیکھتی تو اس میں اپنا کرشنا دکھائی دیتا تھا وہ بھی رادھا کی مورتی میں میری جھلک دیکھتا تھا۔ پوجا کے دوران میرے کان میں کہتا تھا۔ "دیکھو یہ رادھا تمہاری طرح مسکرا رہی ہے۔"

پجاری جی اس کے کان پکڑ کر ڈانٹتے تھے۔ "کئی بار سمجھایا ہے پوجا کے وقت باتیں نہ کیا کر مگر تو تو نیند میں بھی میرا سے بولتا رہتا ہے۔"

میں مندر سے گھر آتی تو ماں مجھے دو چار ہاتھ جما کر کہتی۔ "کیا تجھے جوگن یا مندر کی داسی بننا ہے۔ صبح شام مندر میں یا پجاری کے گھر میں گھسی رہتی ہے اور یہ تیرا کرشنا کے ساتھ دن رات کھیلنا مجھے پسند نہیں ہے۔ چودہ برس کی ہو رہی ہے اس کا ساتھ نہیں

چھوڑے گی تو بالغ ہونے سے پہلے تجھے بمبئی لے جاؤں گی۔"

ماں ہفتے میں دو چار دن کے لیے میری بہنوں کو لے کر جاتی تھی۔ پھر کچھ کمائی کرکے لوٹ آتی تھی۔ میرے کانوں میں یہ بات پھونکتی رہتی تھی کہ برس دو برس میں مجھے بھی بمبئی جاکر اس دھندے سے لگنا ہے۔ اس سلسلے میں وہ بڑی بے حیائی سے مردوں کو الو بنانے کے گر سکھاتی رہتی تھی۔ میرے ذہن میں یہ نقش کرتی رہتی تھی کہ میں ویشیا (طوائف) ہوں اور یہی رہوں گی۔

میں نے پجاری سے کہا۔ "مجھے میری ماں سے بچاؤ۔ اس کی باتیں سن کر میں شرم سے مرجاتی ہوں اگر وہ زبردستی مجھے بمبئی لے جائے گی تو میں خودکشی کرلوں گی۔"

ان دنوں پورے گورے گاؤں میں میرا بڑا نام ہو رہا تھا۔ ہر گھر میں میرے بھجن کی گائیکی کا بڑا چرچا تھا۔ میں اور کرشنا اتنے بڑے مندر کی صفائی کرتے تو گاؤں والے ہمارے ایک ساتھ رہنے اور ہنسنے بولنے پر اعتراض نہیں کرتے تھے کیونکہ ہم مندر کے کاموں میں مصروف رہا کرتے تھے ہماری محبت مندر کی خدمت بھگوان کی پوجا اور بھجن کے بولوں میں پروان چڑھتی رہی۔

جب میں پندرہ برس کی ہوئی تو بھجن گاتے وقت میری آواز میں ایسا رس پیدا ہوگیا جو بچپن اور جوانی کے سنگم پر ہوتا ہے۔ پھر میرے اندر یہ صدمہ تھا کہ ماں مجھے بمبئی لے جائے گی۔ میں مندر سے نکل کر ہوس کے غلیظ کمروں میں پہنچ جاؤں گی۔ یہ دکھ درد بھی میری آواز میں رچ بس گیا تھا۔ لوگ میرا بھجن سن کر سحر زدہ رہ جاتے تھے اور مجھے عزت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔"

میرا جوگن اتنا کہہ کر ذرا چپ ہوئی میں نے کہا۔ "ایسی بھگوان بھگتی اور پریم کہانیاں میں نے بہت پڑھی ہیں۔ تم اپنی پریم کہانی کو خواہ مخواہ طول دے کر میری اس رنگین رات کی صبح کرنا چاہتی ہو۔"

"ذرا صبر سے سن لو۔ میں صرف پندرہ منٹ میں یہ کہانی ختم کردوں گی۔"

"لیکن مجھے تمہاری کہانی سے نہیں تمہاری جوانی سے دلچسپی ہے میں پندرہ منٹ کیوں ضائع کروں؟"

میں بیزار ہو رہا تھا۔ اس کی داستان سننا نہیں چاہتا تھا مگر بند کمرے کی پہلی ملاقات میں کسی کی بات مانتے رہو اسے خوش کرتے رہو تو وہ بھی خوش کرتی ہے تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ میں نے پوچھا۔ "تمہاری داستان میں ایسی کیا بات ہے کہ میں دلچسپی لوں گا؟"

"ہر شخص اپنی ذات اور مفادات کے حوالے سے کسی معاملے میں دلچسپی لیتا ہے۔ تم مسلمان ہو۔ کیا یہ سن کر تمہاری دلچسپی نہیں بڑھے گی کہ میرا کرشنا مسلمان ہے؟"

میں نے ایک دم سے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ "کیا کہا تم نے؟ تمہارا محبوب

مسلمان ہے؟"

"ہاں مگر میرا کرشنا ہے۔"

"وہ ... مندر کے پجاری کا بیٹا ہے اور مسلمان ہے؟"

"ہاں میں یہی کہہ رہی ہوں۔ پہلے تو گورے گاؤں میں کسی کو یقین نہیں آیا لیکن سچائی کو نہ ماننے سے سچائی نہیں بدل جاتی۔"

میرا جوگن نے درست کہا تھا کہ اس کی داستان کے اگلے موڑ سے میری دلچسپی یکلخت بڑھ جائے گی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا تمہارے کرشنا نے اسلام قبول کیا تھا؟"

"ایسی بات نہیں ہے ایک دن ایک بوڑھا مسلمان ہماری بستی میں آیا۔ اس نے پجاری سے ملاقات کی۔ اس نے پوچھا۔ "پنڈت گردھاری لال! تم نے مجھے پہچانا۔"

اس نے دونوں بازو پھیلا کر گلے لگتے ہوئے کہا۔ "ارے رحیم بھائی! تم ہو؟ کیسے راستہ بھول پڑے؟"

رحیم بھائی نے مندر کی اونچی سیڑھی پر بیٹھ کر کہا۔ "کیا بتاؤں ضرورت اور مجبوری لے آئی ہے۔"

"یہاں کیوں بیٹھ گئے؟ گھر چلو۔ اشنان کرو۔ پھر روٹی کھائیں گے۔"

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ابھی دوسری بس سے لوٹ جاؤں گا۔ تمہاری بھابی بہت بیمار ہے۔ کئی ڈاکٹروں کا علاج کراچکا ہوں مگر کوئی فرق نہیں پڑ رہا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ اب چل چلاؤ کا وقت آپہنچا ہے۔"

"تم بھابی کو حوصلہ دو۔ بھگوان نے چاہا تو وہ تندرست ہوجائیں گی۔"

"خدا کرے وہ صحت پائے مگر بہت مایوس ہے کہتی ہے آخری وقت بیٹے کی صورت دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"آں؟ وہ ... کرشنا کو دیکھنا چاہتی ہیں؟ مگر رحیم بھائی! تمہارے تو چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ بھابی کی آنکھوں کے سامنے ان کے چھ بچے رہتے ہیں پھر کیا ضروری ہے کہ ..."

"گردھاری! آدمی اسی چیز کے لیے تڑپتا ہے جس سے وہ محروم ہوجاتا ہے وہ اپنے چھ بچوں کے پیار کو دن رات سمیٹنے کے باوجود کرشنا کو نہیں بھولتی ہے وہ سترہ برس تک اندر ہی اندر اس کے لیے بے چین رہی۔ اب زندگی کی امید نہیں رہی ہے۔ موت نظر آرہی ہے تو نظروں سے دور ہونے والے بیٹے کو یاد کررہی ہے، کہتی ہے ایک بار اسے دکھادو پھر سکون سے مرجاؤں گی۔"

پجاری پریشانی سے سرجھکائے سوچنے لگا۔ پھر بولا "بڑی گڑ بڑ ہوجائے گی اگر یہاں بات کھلے گی کہ کرشنا مسلمان ہے تو یہاں کے ہندو سماج میں وہ اجنبی سا ہوجائے گا یہاں گورے گاؤں میں گنتی کے چند مسلمان ہیں۔ اس کی سماجی حیثیت وہ نہیں رہے گی جو ایک پجاری کے بیٹے کی ہونی چاہیے۔

وہ ذرا چپ ہوا پھر بولا "میں بچپن سے کرشنا اور میرا کا پیار دیکھتا آرہا ہوں۔ وہ دونوں آتما کی گہرائیوں سے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ جب یہ معلوم ہوگا کہ وہ مسلمان ہے تو کوئی اسے ہندو لڑکی سے مندر میں ملنے نہیں دے گا اور نہ ہی چوری چھپے ملاقات کی اجازت ہوگی۔ وہ لڑکی ہندوؤں کی غیرت کا مسئلہ بن جائے گی۔"

"درست کہتے ہو لیکن ہم راز کو راز ہی رکھیں تو یہ ظاہر نہیں ہوگا۔ میں ابھی کرشنا کو ساتھ لے جاؤں گا جو بھی تم سے پوچھے اس سے یہ کہہ دینا کہ میں تمہارا دوست ہوں۔ کرشنا کو ایک اچھی ملازمت دلانے کے لیے بمبئی لے جارہا ہوں۔"

"رحیم بھائی! کیا تم یہ چاہتے ہو کہ کرشنا ملازمت کے بہانے مجھ سے دور ہو جائے؟ وہاں نوکری کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ تمہارے پاس رہے گا۔"

"میں بے ایمان نہیں ہوں۔ ملازمت کے سبز باغ دکھا کر اسے اپنے پاس نہیں رکھوں گا۔ وہ ایک دن کے لیے میرے ساتھ جائے گا۔ پرسوں یہاں واپس آجائے گا۔"

وہ رحیم بھائی کا ہاتھ تھام کر بولا۔ "میں جانتا ہوں تم زبان کے دھنی ہو۔ بھابی نے بھی اپنے کلیجے پر پتھر رکھا اور آج تک بیٹے سے ملنے نہیں آئیں۔ بے شک وہ تمہارا بھی ہے اسے لے جاؤ۔"

ایک بوڑھا مندر کی دیوار کے سائے میں آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔ اسے نیند آرہی تھی لیکن پجاری اور رحیم بھائی کی باتوں نے اس کی نیند اڑادی۔ یہ حیرت انگیز اور دھماکہ خیز انکشاف تھا کہ پجاری کا بیٹا مسلمان ہے۔

"گردھاری! اس کی فکر نہ کرو۔ ماشاءاللہ ہمارا کرشنا جوان ہوگیا ہے۔ میں اسے اس کی ماں سے ملاتے وقت حقیقت بتادوں گا جس بات کو ہم نے راز رکھا ہے اسے وہ بھی راز ہی رکھے گا۔ آخر میرا خون اور تمہاری تربیت ہے۔ وہ زمانے کی اونچ نیچ کو سمجھ کر کبھی اس سلسلے میں اپنی زبان نہیں کھولے گا۔"

وہ دونوں مندر کے قریب ہی ایک کٹیا میں آئے۔ وہاں کرشنا غسل کرکے باہر نکلا ہی تھا۔ پجاری نے کہا۔ "بیٹے! یہ میرے بچپن کے دوست عبدالرحیم ہیں اور رحیم! یہ ہے میرا بیٹا کرشنا۔"

کرشنا نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کہا۔ پھر ایک ہاتھ پیشانی تک لے جاکر کہا "آداب!"

عبدالرحیم نے اسے گلے سے لگالیا۔ پجاری نے کہا۔ "بیٹے! تم ابھی ان کے ساتھ بمبئی جاؤ۔ یہ تمہیں لینے آئے ہیں۔ آج اور کل وہاں رہنے کے بعد پرسوں چلے آنا۔"

اس نے پوچھا۔ "آپ مجھے اچانک شہر کیوں بھیج رہے ہیں؟"

"کچھ ضروری کام ہے۔ تمہارے یہ رحیم چاچا راستے میں تمہیں سب کچھ بتادیں گے۔"

"ٹھیک ہے آپ کہتے ہیں تو میں چلا جاتا ہوں لیکن میرا سے مل آؤں؟"

پجاری نے ہنستے ہوئے عبدالرحیم سے کہا۔ "یہ بڑا سیانا ہے بڑوں کا مان رکھنے کے لیے اجازت لے رہا ہے میں اگر اجازت نہ دوں تو کسی بہانے سے مل آئے گا۔"

وہ دونوں ہنسنے لگے۔ وہ مسکرا کر جانے لگا۔ پجاری نے کہا۔ "سنو بیٹا! میرا سے اور سب سے یہی کہنا کہ بمبئی میں تمہیں نوکری مل رہی ہے۔ واپس آکر کہہ دینا تمہیں نوکری پسند نہیں آئی۔"

"پتا جی! آپ جانتے ہیں میں ساری دنیا سے جھوٹ بول سکتا ہوں میرا سے نہیں بول سکتا۔ میں ایک تھیلے میں اپنا ایک جوڑا رکھ کر لے جارہا ہوں میرا سے مل کر لاری اڈے آجاؤں گا پورے ایک گھنٹے کے بعد۔"

وہ کینوس کے ایک تھیلے میں ضروری سامان رکھ کر مجھ سے ملنے آیا۔ جب میں نے سنا کہ وہ بمبئی جارہا ہے تو میں ناراض ہوگئی مجھے اس کی ایک دن کی جدائی بھی گوارا نہیں تھی۔ ہم دن کے وقت تالاب کے گھاٹ پر ملتے تھے۔ میں جب سے پندرہ کی ہوئی تھی میری ماں سائے کی طرح پیچھے لگی رہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کرشنا یا کوئی بھی میرے بدن کو ہاتھ لگائے وہ مجھے شہر لے جا کر کیش کرانا چاہتی تھی۔

وہ بولا۔ "میرا! روٹھنے میں وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے ایک گھنٹے کے اندر لاری اڈے پہنچنا ہے اور بیس منٹ گزر چکے ہیں۔"

"تو پھر جاؤ۔ میرے پاس کیا لینے آئے ہو؟"

"یہ کہنے آیا ہوں کہ پرسوں رات ایک بجے مندر کے پیچھے تمہارا انتظار کروں گا۔ آؤ گی نا؟"

وہ اسے ستانے کے لیے انکار کرنا چاہتی تھی لیکن نہ کرسکی ماں آگئی۔ اس نے پوچھا۔ "یہاں اس چھوکرے کے ساتھ کیا کر رہی ہے؟"

میں نے کہا۔ "ماں! تمہارے لیے خوشخبری ہے۔ کرشنا ابھی بمبئی جارہا ہے۔ وہیں رہ کر نوکری کرے گا۔ تمہیں دن رات کی فکر سے نجات مل جائے گی۔"

ماں خوش ہوگئی۔ کرشنا مجھ سے رخصت ہو کر لاری اڈے آیا۔ پھر عبدالرحیم کے ساتھ بس میں سوار ہوگیا۔ بس وہاں سے روانہ ہوئی تو کرشنا نے پوچھا۔ "چاچا! آپ مجھے شہر کیوں لے جارہے ہیں۔

"بیٹے! بات بہت لمبی ہے اور یہ کھٹارا بس بہت شور مچاتی جارہی ہے۔ میں بمبئی پہنچ کر تمہیں بتاؤں گا۔"

کرشنا نے وہاں پہنچ کر دیکھا چاچا عبدالرحیم کا بہت بڑا گھر تھا۔ اس گھر کے ایک کمرے میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت بستر پر پڑی ہوئی تھی اسے دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ وہ برسوں کی بیمار ہے۔

عبدالرحیم نے آواز دی۔ "سیما! آنکھیں کھولو۔ دیکھو کون آیا ہے؟"

سیما نے آنکھیں کھول کر پہلے شوہر کو پھر کرشنا کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولا۔ "یہ تمہارا بیٹا ہے گورے گاؤں والا بیٹا..."

سیما کی آنکھوں میں زندگی کی چمک آگئی۔ اس نے کمزور اور تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں کو کرشنا کی طرف یوں اٹھایا جیسے آغوش میں بلا رہی ہو۔ کرشنا حیران پریشان ہو کر بولا "بیٹا! میں ان کا بیٹا ہوں؟ چاچا! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"جو سچ ہے وہی کہہ رہا ہوں۔ اپنی ماں کے پاس جاؤ اس کے سینے سے لگ جاؤ یہ تمہارے لیے تڑپ رہی ہے۔"

"لیکن چاچا! کچھ معلوم تو ہو کہ ..."

چاچا نے کہا۔ "تمہارے ہر سوال کا جواب ملے گا پہلے ماں کی ممتا کو سکون پہنچاؤ۔"

وہ بستر کے سرے پر آکر بیٹھ گیا۔ پھر جھک کر ماں کے سینے سے لگ گیا وہ رو رہی تھی۔ یہ حیران تھا کہ ماجرا کیا ہے اس نے سر اٹھا کر پوچھا "آپ میری ماں ہیں؟"

وہ بول نہیں سکتی تھی۔ اس نے بڑی کمزوری سے ایک بار ہاں کے انداز میں سرہلایا۔

عبدالرحیم نے دوسرے بچوں کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "بیٹے! یہ سب تمہارے سگے بھائی بہن ہیں۔ آج سے سترہ سال پہلے تم ہم سے بچھڑ گئے تھے۔"

اس نے پوچھا۔ "کیا آپ ایسی بے تکی باتیں کرنے کے لیے مجھے یہاں لائے ہیں؟"

عبدالرحیم نے اپنی جیب سے ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہارے پتا جی پنڈت گردھاری لال نے بس کے اڈے پر لکھ کر دیا ہے۔"

اس نے کاغذ لیا پھر اسے کھول کر دیکھا۔ وہ ہندی زبان میں اپنے پجاری پتا کی تحریر پہچانتا تھا۔ اس پر لکھا تھا۔ "بیٹے کرشن مراری! عبدالرحیم تمہارے اصل پتا ہیں۔ یہ تم سے جو کہیں گے اس کا ایک ایک لفظ درست ہوگا پرسوں واپس آؤ گے تو باقی باتیں ہوں گی۔"

تحریر کے نیچے پجاری نے اپنا نام لکھا تھا۔ وہ شدید حیرانی سے کبھی سیما کو اور کبھی عبدالرحیم کو دیکھ رہا تھا۔ رحیم نے پوچھا۔ "کیا اپنے پتا کی تحریر پڑھ کر بھی یقین نہیں آرہا ہے؟"

"ہاں یہ میرے باپ نے لکھا ہے کہ آپ جو کہیں گے وہ درست ہوگا مگر معلوم تو ہو کہ یہ قصہ کیا ہے؟"

عبدالرحیم نے بچوں سے کہا "تم سب باہر جاؤ۔"

وہ چار برس سے لے کر پندرہ برس تک کی لڑکیاں اور لڑکے تھے۔ باپ کے حکم پر چلے گئے۔ باپ نے دروازے کو اندر سے بند کرکے کہا۔ "میں سمجھ رہا تھا تم اپنے بچھڑے ہوئے ماں باپ کو پاکر بھرپور مسرتوں کا اظہار کرو گے۔ خون کی کشش تمہیں کھینچ کر ہمارے سینے سے لگا دے گی لیکن تمہارے اندر کوئی جذبہ پیدا نہیں ہو رہا ہے۔"

"آپ کیسے جذبے کا اظہار چاہتے ہیں؟ کیا میں اپنے پتا جی سے منہ موڑ کر آپ کے گلے سے لگ جاؤں؟"

"بیٹے یہ ضروری نہیں ہے کہ مجھ سے گلے لگنے کے لیے تم اپنے ہندو باپ کا احسان بھول جاؤ۔"

"کیا دنیا میں کسی کے دو باپ ہوتے ہیں؟ کیا میرے دو باپ ... دو مذہب اور دھرم ہیں؟ یہ تماشہ کیا ہے؟ اگر میں آپ کا بیٹا ہوں تو بچپن سے اب تک ایک پجاری کے گھر میں کیوں رہا۔ کیا میرے پتا جی پر یہ الزام نہیں آرہا ہے کہ انہوں نے ایک مسلمان لڑکے کو ہندو بنا کر اس کی پرورش کی ہے۔"

"نہیں بیٹے! پنڈت گردھاری لال پر ایسا کوئی الزام نہیں آسکتا۔ اس کی آنجہانی پتنی نے ہماری ایک غلطی کو اپنے آنچل میں چھپایا تھا۔"

وہ سوالیہ نظروں سے اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ باپ نے کہا۔ "یہ سترہ برس پہلے کی بات ہے میں اور سیما ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے مگر ہمارے بزرگ ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس طرح وہ ہماری محبت کے بھی دشمن ہوگئے ہماری شادی پر راضی نہ ہوئے۔"

عبدالرحیم نے منہ پھیر کر گویا بیٹے سے منہ چھپا کر کہا۔ "ان حالات میں سیما کے پاؤں بھاری ہوگئے۔ سیما کے بزرگوں کو یہ خبر ہوگئی تو انہوں نے اسے خوب مارا پیٹا۔ پھر یہ طے کیا کہ اسے دور افتادہ مقام میں لے جاکر دوسرے رشتے داروں سے چھپا کر رکھیں گے۔ زچگی کے بعد بچے کو ختم کردیں گے اور سیما کو گھر واپس لے آئیں گے۔

ان دنوں ہم شہر گوندیا میں تھے۔ جب سیما کو پتا چلا کہ اس کے ہونے والے بچے کے خلاف سازشیں ہورہی ہیں تو یہ ایک رات گھر سے بھاگ کر اپنی سہیلی رتنا دیوی کے پاس آگئی۔ رتنا گردھاری کی پتنی تھی اور وہ بھی ماں بننے والی تھی۔ اس نے سیما کو اپنے گھر میں چھپا کر رکھا اور تسلی دی کہ اس کے ہونے والے بچے کو نقصان نہیں پہنچنے دے گی۔

سیما کے گھر والے اسے تلاش کر رہے تھے۔ رسوائی کے ڈر سے انہوں نے تھانے میں رپورٹ نہیں لکھوائی بڑی رازداری سے اسے تلاش کرتے رہے۔ ایک روز گردھاری نے مجھ سے ملاقات کی اور بتایا کہ سیما ان کے گھر میں محفوظ ہے۔ اس دن سے پنڈت گردھاری لال سے ہماری گہری دوستی ہوگئی۔

رتنا دیوی نے ایک بچی کو جنم دیا۔ وہ بچی دوسرے دن مرگئی۔ اسی رات تم پیدا ہوئے میں نے اور سیما نے طے کرلیا تھا کہ تمہیں لے کر اس شہر سے کہیں دور چلے جائیں گے لیکن اسی رات میری والدہ کو دل کا دورہ پڑا میں انہیں لے کر ہسپتال چلا گیا۔ دوسرے دن سیما سے ملنے آیا تو اس بات سے بے خبر تھا کہ میرا تعاقب کیا جارہا ہے وہاں میرے پیچھے سیما کے بڑے بھائی اور والد پہنچ گئے۔

انہوں نے گردھاری سے کہا "ہم تمہارے گھر میں زبردستی نہیں گھسیں گے۔ تم ایک شریف انسان ہو ہماری بیٹی کو یہ برقع پہنا کر باہر بھیج دو۔"

سیما نے دروازے کی آڑ سے کہا۔ "ابا جان! میں آپ لوگوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔"

باپ نے کہا۔ "اگر ہم تمہیں چھوڑ کر جائیں گے تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ ابھی بات نہیں بگڑی ہے ہم نے رشتے داروں سے یہ کہہ دیا ہے کہ تم ننھیال میں رہنے گئی ہو۔"

بھائی نے کہا "چلی آؤ سیما! ہماری عزت تمہارے ہاتھ ہے ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے نہ تم بدنام ہوئی ہو نہ ہم پر کوئی انگلی اٹھا رہا ہے دیر ہونے سے پہلے چلی آؤ۔"

سیما نے کہا "ابا جان! آپ رشتے داروں سے کہہ دیں کہ ننھیال پہنچ کر میں مرگئی ہوں مجھے وہیں دفن کردیا گیا ہے۔"

"یہ بچگانہ باتیں ہیں۔ عقل کی بات یہ ہے کہ ہم تمہیں یہاں سے لے کر جائیں یا سامنے والے چبوترے پر بیٹھ کر بھوک ہڑتال کریں۔ اب ہماری عزت اور ہماری زندگی تمہارے ہاتھوں میں ہے۔"

سیما کے باپ اور بھائی چبوترے پر جاکر بیٹھ گئے اپنی اور خاندان کی عزت کا تقاضہ تھا کہ وہ اسی طرح پرامن احتجاج کریں۔ رتنا دیوی اور گردھاری پریشان ہوگئے گردھاری نے چبوترے کے پاس آکر ان سے پوچھا۔ "کیا آپ سیما کے ساتھ بچے کو لے جائیں گے۔"

"ہرگز نہیں۔ نہ ہم عبدالرحیم کو قبول کریں گے اور نہ اس کے بچے کو۔ ہمیں صرف ہماری بیٹی چاہیے ورنہ ہم یہیں جان دے دیں گے۔"

رتنا نے کہا "سیما! یہ بچہ تمہارے پاس نہیں رہ سکے گا کل سے میں ہی اسے دودھ پلا رہی ہوں یہ بھگوان کی عجیب لیلا ہے کہ تمہیں دودھ سے خالی کردیا اور مجھے اولاد سے۔ تم اسے باہر لے جاؤگی تو تمہارے غیرت مند باپ اور بھائی اسے مار ڈالیں گے یا خود مرجائیں گے میرا مشورہ ہے تم اپنے بزرگوں کے ساتھ چلی جاؤ اور بچے کو بھول جاؤ۔"

سیما کی ممتا نہیں مان رہی تھی لیکن میں نے بھی سمجھایا کہ بچہ رتنا دیوی کے پاس نہیں رہے گا تو اس بدنامی کو اس کے بزرگ زندہ نہیں رہنے دیں گے بچہ کہیں بھی رہے گا تو ضمیر مطمئن رہے گا کہ ہم نے اسے مرنے نہیں دیا۔

آخر تمہاری یہ بدنصیب ماں برقع پہن کر اپنے والد اور بھائی کے ساتھ چلی گئی۔ ایک ہفتہ بعد رتنا اور گردھاری وہ شہر چھوڑ کر چلے گئے۔ اس واقعہ کے بعد ایک سال کے اندر کایا پلٹ گئی۔ میرے اور سیما کے بزرگوں نے ایک بار ناگ پور کے ولی کامل تاج الدین بابا کے دربار میں حاضری دی۔ حضرت تاج الدین بابا خدا کے برگزیدہ بندے تھے۔ ان سے کئی کرامات وابستہ ہیں ان کے حضور دشمنی دوستی میں بدل جایا کرتی تھی۔ ہمارے بزرگوں کے

ساتھ بھی یہی ہوا۔ رفتہ رفتہ دوستی ہوگئی اور سیما سے میری شادی ہوگئی۔

سہاگ رات میں دل کی کلیاں کھلتی ہیں لیکن اس رات سیما دلہن کی سیج پر بیٹھ کر خوب روئی اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے کو یاد کرتی رہی اور مجھ سے پوچھتی رہی کیا میرا بیٹا مجھے واپس نہیں ملے گا؟

میں نے سمجھایا۔ "صبر کرو۔ تم نے اسے امانت کے طور پر نہیں دیا تھا بلکہ حالات سے مجبور ہو کر ہمیشہ کے لیے اسے سونپ دیا تھا۔ کسی کو کچھ دے کر واپس لینا کم ظرفی ہے پھر ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ رتنا اور گردھاری کہاں چلے گئے ہیں۔ گردھاری روزگار کے سلسلے میں پریشان رہتا تھا۔ پیٹ کی خاطر شہر شہر بھٹک رہا تھا۔ تقریباً دس برس بعد اس سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ وہ گورے گاؤں کے ایک مندر میں پجاری ہے اور رتنا دیوی کا دیہانت ہوگیا ہے۔"

عبدالرحیم نے ذرا چپ ہوکر بیٹے کو دیکھا۔ پھر کہا "یہ داستان بہت طویل تھی میں نے اختصار سے سنایا ہے ہماری اس روداد کا سب سے دردناک پہلو یہ ہے کہ یہ ممتا کی ماری چھ بچوں کی ماں بننے کے باوجود تمہارے لیے تڑپتی رہی۔ اب یہ بولنے کے قابل نہیں رہی ہے۔ اس نے زبان بند ہونے سے پہلے التجا کی تھی کہ میں ایک بار تمہاری صورت اسے دکھا دوں۔"

بیٹے نے ماں کو دیکھا۔ ماں ایک ٹک بیٹے کو تک رہی تھی۔ جب سے وہ آیا تھا اسے ہی دیکھے جارہی تھی۔ آنکھ کی پتلیاں ادھر سے ادھر نہیں ہوئی تھیں۔ وہ اس کی کوکھ کا پہلا ثمر تھا جسے وہ آخری سانسوں میں دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے ساری دنیا بجھ گئی تھی۔ وہی ایک چراغ لو دے رہا تھا۔

عبدالرحیم نے کہا۔ "میں باپ ہوں میں نے تمہارے لیے صبر کرلیا تھا۔ پچھلی بار گردھاری سے ملاقات ہونے کے باوجود گورے گاؤں جاکر تمہیں نہیں دیکھا یہ ڈر تھا کہ تمہیں دیکھ لوں گا تو پھر میں بھی تمہاری ماں کی طرح بے چین اور مضطرب رہنے لگوں گا میں نے اس بدنصیب کو یہ نہیں بتایا کہ تمہارا پتا ٹھکانا معلوم ہوگیا ہے۔ اسے معلوم ہوتا تو یہ ہوا کی طرح اڑتی ہوئی تمہارے پاس پہنچ جاتی۔

میں نے اور گردھاری نے یہ طے کیا تھا کہ تمہاری اصل اور بنیادی حیثیت تم پر بھی ظاہر نہ ہو۔ ظاہر ہوگی تو تم ذہنی طور پر الجھ جاؤ گے۔ کسی ایک دھرم یا ایک مذہب پر قائم نہیں رہ سکو گے۔ کرشنا بن کر رہوگے تو عبدالرحیم کے خون کی کشش پکارے گی۔ ہماری طرف جھکو گے تو ایک ہندو ماں کے دودھ اور گود کی خوشبو نہیں بھول پاؤ گے۔ گردھاری کی تربیت اور وہاں کا ماحول تمہیں اپنی طرف کھینچے گا۔

لیکن تمہاری ماں کو زندگی اور موت کی کشمکش میں دیکھ کر میں تمہیں یہاں لانے پر مجبور ہوگیا ایک موہوم سی امید رہی کہ شاید یہ تمہیں دیکھ کر جی اٹھے یا شاید تمہیں دیکھ کر

سکون سے دم نکل سکے۔"

کرشنا ماں کے پاس آخر بیٹھ گیا پھر جھک کر بولا۔ "آپ بول نہیں سکتیں مگر سن سکتی ہیں۔ آپ نے جسے جنم دیا وہ جوان ہوکر بول رہا ہے مجھے یہ گھر یہ ماحول اپنا نہیں لگ رہا ہے میرا گھر اور میرا ماحول گورے گاؤں کا مندر ہے۔ یہاں جو باپ اور بہن بھائی ہیں اب اجنبی لگ رہے ہیں میرا دل صرف ..... میرے پتا جی کو اپنا سگا مانتا ہے۔ وہ ماں جس نے مجھے دودھ پلایا گھٹی پلائی اور جب تک جیتی رہی مجھے بھرپور ممتا دیتی رہی۔ اس ماں کی محبت میں آپ کو دے نہیں سکوں گا کیونکہ پیدا کرنا بڑی بات نہیں ہے۔ جانور بھی پیدا کرکے اپنے بچوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ نے بھی یہی کیا اگر مجھے پناہ دینے والی اور دودھ پلانے والی ماں نہ ہوتی تو میں زندہ نہ رہتا پھینکے ہوئے کچرے کی طرح مٹی میں مل کر نابود ہو جاتا۔"

عبدالرحیم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "بیٹے! ماں کی حالت دیکھو۔ ایسے وقت ایسی باتیں نہ کرو۔"

وہ بولا "مجھ پر اس ماں کا یہ قرض ہے کہ اس نے نو ماہ تک مجھے پیٹ میں رکھا۔ یہ قرض چکانے کے لیے میرے پاس صرف پیار ہے۔ میں پیار ہی دے سکتا ہوں۔"

اس نے جھک کر ماں کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ بیٹے کے ہونٹوں کا لمس پاتے ہی ماں کے بیمار بدن کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ اس کے ساتھ ہی دم نکل گیا۔

وہ ماں کی تدفین تک وہاں رہا پھر چپ چاپ چلا آیا۔ اس نے اپنے باپ بہنوں اور بھائیوں سے رخصتی کے وقت ملاقات نہیں کی اپنی اس حرکت سے یہ احساس دلایا کہ اس مسلمان گھرانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن راستے میں اس کے اندر دھماکے ہوتے رہے کہ وہ کیا ہے؟ اس کی شناخت کیا ہے؟

ساری دنیا کے لوگ اپنے باپ دادا سے اور اپنے دین دھرم سے پہچانے جاتے ہیں اگر کوئی منکر مذہب ہو تو باپ سے منکر نہیں ہوتا اسے زندگی کے اہم معاملات میں باپ کا نام بتانا پڑتا ہے۔ یوں باپ کے حوالے سے اس منکر کا مذہب معلوم ہو جاتا ہے۔

کرشنا کا یہ مسئلہ تھا کہ وہ منہ پھیر کر آنے کے باوجود عبدالرحیم کا بیٹا ہونے سے انکار نہیں کرسکتا تھا۔ انکار کرتا تو خود کو ماں کی گالی پڑتی اور ماں کے احترام میں وہ پنڈت گردھاری لال کو اب سگا باپ نہیں کہہ سکتا تھا۔ صرف پتا جی مان سکتا تھا۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنا مذہب بدل دیتا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کرشنا کا مذہب بدل گیا لیکن کرشنا نے نہیں بدلا وہ حالات کی آندھی میں اڑ کر جس گھر میں گیا اس گھر کے رنگ میں رنگ گیا۔ بڑی مشکل ہوگئی تھی بچپن سے جس پتا کو دیکھتا آرہا تھا وہ بھی اپنے ہونے کے باوجود کچھ پرائے سے لگ رہے تھے۔

وہ گورے گاؤں پہنچا۔ لاری اڈے پر ڈھابے کے مالک شیام سندر کو دیکھ کر نمستے کیا۔ شیام سندر نے جواب نہیں دیا۔ سر جھکا کر ہوٹل کی آمدنی اور اخراجات کا حساب کرنے

لگا۔ اسے یوں نظر انداز کیے جانے پر تعجب ہوا وہ آگے بڑھا گاؤں کی عورتیں پیتل کی کلسیاں اٹھائے تالاب کی سمت جارہی تھیں اسے دیکھ کر رک گئیں ایک دوسرے سے کچھ کہنے لگیں ان کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ کرشنا کو پہلی بار دیکھ رہی ہیں اور اس کے اندر سے گم شدہ کرشنا کو تلاش کررہی ہیں۔

لاری اڈے سے مندر کے قریب پہنچنے تک اس نے تمام شناسا نظروں میں اجنبیت دیکھی جو بڑی گرمجوشی سے ملتے تھے وہ کترا کر چلے گئے مندر کی سیڑھیوں پر بہت سے جوان اور بوڑھے بیٹھے ہوئے تھے سیڑھیوں کے سب سے اونچے پائیدان پر اس کے پتا پنڈت گردھاری لال بیٹھے ہوئے کچھ کہہ رہے تھے۔ کرشنا کو دیکھ کر ذرا سی دیر کے لیے چپ ہوگئے۔

دوسروں نے بھی اسے دیکھا پھر پجاری نے کہا۔ "آپ لوگ ذرا سی بات کو بڑھا رہے ہیں یہ جو تمہارے سامنے کھڑا ہے میرا بیٹا ہے یہ اپنے جنم سے بیٹا نہیں ہے مگر دھرم سے ہے اس میں سارے گن ہمارے دھرم کے ہیں۔ پھر آپ اسے مسلمان کیوں کہتے ہیں؟"

"اس لیے کہ یہ مسلمان کا خون ہے۔"

"آپ لوگوں کو تو خوش ہونا چاہیے کہ مسلمان کی اولاد ہندو ہے۔"

ایک بوڑھے نے کہا۔ "اگر یہ ہندو ہے تو آپ نے پجاری ہو کر اتنی بڑی بات کیوں چھپائی کہ آپ اسے مسلمان کے گھر سے لائے ہیں؟ آخر اس میں کیا راز ہے؟"

دوسرے نے کہا۔ "ایک پجاری سے ہم جھوٹ اور فریب کی امید نہیں رکھتے پھر سترہ برس سے یہ دھوکا کیوں دے رہا ہے' کیوں اس نے ایک مسلمان کو ہندو کے بھیس میں چھپا رکھا تھا۔"

تیسرے نے کہا۔ "جو سچ ہوتا ہے اسے سب ہی تسلیم کرتے ہیں اگر سترہ برس پہلے کہہ دیتے کہ یہ مسلمان تھا اور آئندہ ہمارے دھرم میں کرشنا بن کر رہے گا تو ہمیں خوشی ہوتی مگر اب تو صاف پتا چلتا ہے کہ ہمیں الو بنانے کے لیے ہمیں دھوکا دینے کے لیے اسے ہندو بنا کر رکھا گیا ہے۔"

پجاری نے کہا "میں نے یہ حقیقت کرشنا سے بھی چھپائی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ یہ خود کو جنم جنم سے ہندو سمجھے اسے یہی سمجھائے رکھنے کے لیے میں آپ لوگوں سے اور ساری دنیا سے اس کی اصلیت چھپاتا رہا۔"

کسی نے یہ بات تسلیم نہیں کی۔ سب کے سامنے یہی ایک بات تھی کہ جس پجاری سے بھگوان کی پوجا کرائی جاتی ہے وہ برسوں سے جھوٹ بولتا اور پوری بستی کو دھوکا دیتا آرہا ہے۔

پنچائیت نے فیصلہ سنایا کہ پنڈت گردھاری لال اس مندر کا پجاری نہیں رہے گا جو ایک مسلمان کو ہندو کے بھیس میں چھپا کر رکھتا ہے اس پجاری کا بھی ہندو ہونا مشکوک ہے۔

یہ بات تسلیم نہیں کی گئی کہ کرشنا کو اپنی اصلیت کا پتا نہیں تھا اس کے برعکس یہ سمجھا گیا کہ وہ بھی پجاری کی طرح ان سے جھوٹ بولتا اور انہیں دھوکا دیتا رہا اس لیے کسی نے اس کو ہندو تسلیم نہیں کیا۔

پنچایت کے اختتام پر ایک نوجوان نے کہا۔ "اور سنو کرشنا! آئندہ تم میرا سے نہیں ملوگے ہمارے دھرم کی کسی عورت سے بات نہیں کروگے۔"

"کیوں نہیں کروں گا۔ میرا اور میرا کا دھرم ایک ہے تم میں سے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ مجھے میرے دھرم سے الگ کردو۔"

ایک بوڑھے نے کہا۔ "ساری بستی جسے اچھا کہے وہ اچھا ہوتا ہے جسے برا کہے وہ برا ہوتا ہے جسے ہندو مانے وہ ہندو ہوتا ہے ورنہ وہ مسلمان ہے۔"

کرشنا اپنے حق کے لیے لڑنا چاہتا تھا مگر پجاری اس کا ہاتھ پکڑ کر ان سے دور لے گیا پھر کٹیا کی طرف چلتے ہوئے بولا "تم ایک ہو وہ ہزار ہیں کس کس سے لڑوگے؟"

"نہیں لڑوں گا' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کے کہہ دینے سے میں ہندو جاتی سے الگ ہو جاؤں گا۔"

"ہاں ان کے کہہ دینے سے میں بھی جھوٹا اور دھوکے باز نہیں ہو جاؤں گا۔ ہم سچے ہیں ہمارا یہی دھرم ہے اور یہ قائم رہے گا۔"

"لیکن ہم اپنی سچائی کیسے ثابت کریں گے؟"

"ہمیں ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے سچائی خود ایک دن ظاہر ہوتی ہے۔"

"پتا نہیں وہ دن کب آئے گا مگر تب تک یہ لوگ مجھے میرا سے ملنے نہیں دیں گے۔"

پنڈت گردھاری لال نے سر جھکا لیا بیٹے کی میرا سے محبت ایک مسئلہ بننے والی تھی۔ وہ بولا میں میرا کی ماں سے بات کروں گا اب تو روزگار کا بھی مسئلہ پیدا ہوگیا ہے۔ جب تو رتنا کی گود میں دو دن کا تھا تب ہم گوندیا شہر چھوڑ کر روزگار کی تلاش میں بمبئی آئے بمبئی سے گورے گاؤں پہنچے۔ آج پھر تیرے ساتھ روزگار کے لیے ایک جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ جانا ہوگا۔"

"پتا جی! یہ بستی چھوڑنے کی بات نہ کرو۔ میں میرا سے دور نہیں جاؤں گا۔"

"محبت کرنے کے لیے چار پیسے کمانے پڑتے ہیں روزگار اور روٹی کے بغیر محبت نہیں جچتی۔ اس بستی میں مجھے اور تمہیں کوئی کام نہیں دے گا ہمیں شہر جانا ہی ہوگا۔"

میرا جوگن داستان سناتے سناتے چپ ہوئی اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ "رات کا ایک بجا ہے کیا میں تمہارے بدن سے اپنے پانچ سو وصول کرپاؤں گا؟ کیا تم الف لیلیٰ کی شہرزاد کی طرح اس کہانی میں صبح کردو گی؟"

"میں ایسا نہیں کروں گی میری کہانی اختتام کو پہنچنے والی ہے۔ تھوڑا اور صبر کرلو۔"

پھر وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "اس رات میں اُس سے ملنے کے لیے مندر کے

پیچھے آئی میری ماں بہنوں کو لے کر بمبئی گئی ہوئی تھی۔ اس کی طرف سے کوئی کھٹکا نہیں تھا۔ میں تمام دن یہ سنتی رہی تھی کہ وہ پیدائشی مسلمان ہے لیکن مجھے یقین نہیں آرہا تھا اسے رات کی نیم تاریکی میں دیکھتے ہی ایسے لپٹ گئی جیسے وہ مجھے اور میرا دھرم چھوڑ کر بھاگ رہا ہو۔

میں نے اس کے دھڑکتے ہوئے سینے پر سر رکھ کر پوچھا۔ "یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"درست کہہ رہے ہیں اس کے باوجود میں تمہارا کرشنا ہوں۔"

میں رونے لگی رو رو کر اس کی قمیض بھگونے لگی وہ مجھے پیار کرتا رہا اور قسمیں کھاتا رہا کہ نہ مجھے چھوڑے گا نہ میرا دھرم چھوڑے گا اور چاہے کچھ ہو جائے وہ ہر منگل کی رات مندر کے پیچھے ملنے آیا کرے گا۔

وہ قسمیں نہ کھاتا تب بھی میری آتما کہتی تھی کہ وہ صرف میرا ہے۔ ویسے ہزار یقین رکھنے کے باوجود ہمارا محبوب قسمیں کھاتے کھاتے پیار کرتا رہے تو ایک سحر سا طاری ہو جاتا ہے یہ محبت کے انداز ہوتے ہیں جو بچھڑنے کے بعد یاد آتے رہتے ہیں۔

ہم دونوں پر جو سحر طاری تھی وہ اچانک ٹوٹ گیا اندھیرے میں کسی نے للکارا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

تاریکی میں دوسری طرف سے آواز آئی "بے شرمی ہو رہی ہے۔"

ہم دونوں گھبرا کر الگ ہوگئے تھے ان دونوں نے کرشنا کو دونوں طرف سے پکڑ لیا۔

ایک نے کہا۔ "سالے مسلمان کی اولاد! ہماری ذات کی لڑکی کو خراب کر رہا ہے؟"

دوسرے نے اس کے منہ پر گھونسا مارا۔ کرشنا غصے میں آکر لڑنے لگا وہ تنہا تھا اور حملہ کرنے والے چار تھے۔ میں انہیں پتھر پھینک پھینک کر مارنے لگی۔ ایک نے مجھے ایسا ہاتھ جمایا کہ میں چکرا کر گر پڑی۔ پوری بستی میں شور ہوگیا۔ سونے والوں نے جاگتے ہی سمجھا کوئی چور پکڑا گیا ہے وہ لاٹھیاں لے کر گھروں سے نکل پڑے اتنی دیر میں ان چاروں نے کرشنا کو لہو لہان کردیا تھا۔ آنے والوں نے دو چار لاٹھیاں اور ماریں انہیں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ چور نہیں کرشنا ہے۔

وہاں ہر آنے والے کے ہاتھ میں ایک لالٹین تھی۔ مندر کے پیچھے دور تک روشنی پھیل گئی تھی۔ پجاری بھی شور سن کر چلا آیا تھا۔ میں چکرانے کے بعد گر پڑی تھی۔ کرشنا اپنے لہو میں ڈوبا ہوا ہانپ رہا تھا اور دیوار کا سہارا لے کر کہہ رہا تھا۔ "مرد کے بچے ہو تو ایک ایک کرکے آؤ۔ میں نے میرا کے ساتھ کوئی پاپ نہیں کیا ہے پریم کیا ہے۔ تم سب بچپن سے ہمارا یہ پریم دیکھتے آرہے ہو۔ تم ہمیں دیکھ کر کہتے تھے کہ بہت سندر جوڑی ہے آج اس سندر جوڑے کو کیوں توڑ رہے ہو۔ میں چیخ چیخ کر کہتا ہوں کہ مسلمان نہیں ہندو ہوں مجھے ہندو تسلیم کرو۔"

ایک جوان نے کہا "کوئی بہروپیا اپنا نام کرشن مراری رکھ لے تو وہ کرشن بھگوان نہیں بن جائے گا۔ تم ہندو نہیں بہروپیے ہو۔"

ہر طرف سے شور اٹھنے لگا یہ بہروپیا ہے ہندو نہیں ہے بہروپیا مسلمان ہے۔

پنڈت گردھاری لال نے دونوں ہاتھ اٹھا کر سب سے خاموش رہنے کی التجا کی۔ پھر کہا۔ "میں آپ لوگوں کو کل سے سمجھا رہا ہوں لیکن آپ سب کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ یہ بہروپیا مسلمان ہے ٹھیک ہے تو پھر یہ مسلمان ہی ہے مگر یہ میری عمر بھر کی کمائی ہے اسے نہ مارو میں ابھی اسے لے کر چلا جاؤں گا مگر یاد رکھو تم سب ایک ہندو کو مسلمان بننے پر مجبور کر رہے ہو۔"

کسی نے کہا۔ "یہ بڈھا پجاری بکواس کرتا ہے۔ ہمیں الزام دیتا ہے کہ ہم ہندو کو مسلمان بنا رہے ہیں جبکہ یہ ہمیں الو بناتا رہا ہے۔"

اس بات پر کچھ لوگ پتھر مارنے لگے۔ کچھ لوگ مارنے والوں کو روکنے لگے۔ ایک پتھر پجاری کی پیشانی پر لگا۔ کرشنا ڈھال بن کر پتھر کھانے لگا۔ پھر سنگ باری رک گئی اسی وقت پولیس والے بھی آگئے۔ بھیڑ کو پیچھے ہٹانے لگے۔ انسپکٹر نے پجاری کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "میں کل سے کرشنا کے بارے میں بہت کچھ سن رہا ہوں۔ آپ کو بھی مندر سے نکال دیا گیا ہے مگر میرے دل میں پہلے کی طرح آپ کی عزت ہے میں آپ کی عزت کی خاطر کہتا ہوں یہاں سے چلے جائیں۔"

کرشنا نے کہا۔ "داروغہ صاحب! میں جانے سے پہلے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنا چاہتا ہوں جس ہندو ماں نے مجھے دودھ پلایا۔ اسے ان لوگوں نے پانی کردیا۔ اس دودھ کو میرے اندر سے لہو کی صورت میں بہادیا۔ یہ لوگ کس دھرم کی بات کر رہے ہیں۔ کیا یہ سب لوگ نہیں جانتے کہ ان کے دھرم والی میرا کی ماں کا خاندانی پیشہ کیا ہے اور کیا نہیں جانتے کہ وہ آج دو بیٹیوں کو لے کر کہاں گئی ہے؟ جس بازار میں گئی ہے وہاں ان ہندو لڑکیوں کے مسلمان گاہک آتے ہوں گے۔ یہ غیرت مند ہیں تو اس بازار میں جاکر اپنے دھرم کی رکھشا کریں۔ وہاں جاکر لاٹھیاں چلائیں۔

داروغہ صاحب! ان لوگوں نے میرے اندر سے دھرم کا دھواں نکال دیا ہے۔ میں ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں مجھے میری میرا سے یہاں نہیں ملنے دو گے تو میں دھرم کی ایسی کی تیسی کرنے والے بازار میں جاکر اپنی میرا سے ملوں گا جس نے ماں کا دودھ پیا ہے وہ وہاں آکر مجھے روک لے۔"

وہ پجاری کو لے کر وہاں سے چلا گیا اس کے جانے کے بعد اتنی بڑی دنیا بالکل کالی ہوگئی۔ یہاں دھرم نظر آیا نہ بھگوان نہ پریم نہ پوجا۔ پہلی بار احساس ہوا کہ یہ دنیا کھوکھلی ہے اسے مسرتوں سے بھرنے کے لیے ایک دن کرشنا ضرور آئے گا۔

اس واقعے کے بعد سے ماں محتاط ہوگئی۔ مجھے بازار میں بٹھانے کی فکر کرنے لگی۔ میرا

انکار سن کر وہ غصے میں آجاتی تھی۔ مجھے مارتی پیٹتی تھی پھر کہتی تھی۔ "میں مارتی ہوں مگر پیار سے بھی سمجھاتی ہوں۔ ابھی یہ اطمینان ہے کہ تجھے بہکانے والا کرشنا اب یہاں نہیں رہا ہے اگر وہ کسی دن نظر آئے گا تو میں تجھے غنڈوں سے اٹھواکر بازار میں پہنچا دوں گی۔"

پھر دن ہفتے اور مہینے گزر گئے۔ کرشنا کی کوئی خبر نہیں ملی۔ دس ماہ بعد میری بہن مالتی ایک رات اپنے بستر سے اٹھ کر میرے بستر پر آگئی میں نے اسے تعجب سے دیکھا وہ میرے کان میں بولی "میں گندی ہوں تو جوگن ہے تیرے بستر پر نہیں آنا چاہیے مگر آج کرشنا ملا تھا۔"

یہ سنتے ہی میں مالتی سے لپٹ گئی۔ سرگوشی میں بولی۔ "میرا کرشنا کیسا ہے؟ کیا میں اسے یاد آتی ہوں؟"

"ہاں وہ مجنوں تیرے ہی لیے جی رہا ہے یہ لے اس کی چٹھی۔"

وہ مجھے ایک تہ کیا ہوا کاغذ دے کر اپنے بستر پر چلی گئی۔ ماں میری دوسری بہن شاردا کے ساتھ دوسرے کمرے میں سو رہی تھی۔ میں نے لالٹین کی لو ذرا اونچی کی پھر وہ کاغذ کھول کر کرشنا کی تحریر دیکھتے ہی اسے چوم لیا۔ اس نے لکھا تھا۔

"میری جان میرا! بڑی مشکلوں سے مالتی تک پہنچنے میں کامیاب ہوا ہوں اور اس کے ہاتھوں دل کا حال لکھ کر بھیج رہا ہوں میرے مقدر میں جتنی سانسیں ہیں وہ سب تمہارے نام سے لے رہا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ تمہاری ماں تمہیں یہاں کے بازار میں نہ لے آئے۔ اس لیے ہر شام بازار کا ایک چکر ضرور لگاتا ہوں۔ میں نے چیلنج کیا تھا کہ دنیا والوں نے ہمیں شرافت اور محبت سے نہ ملنے دیا تو میں بازار میں جاکر اپنی میرا سے ملوں گا مگر وہ جذباتی چیلنج تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ میں تمہارا عاشق ہوں گاہک نہیں ہوں۔ میں تمہاری زندگی کی تمام راتیں خریدنے کے لیے دن رات محنت کر رہا ہوں۔ تمہارے لیے ایک چھوٹا سا گھر بنانا چاہتا ہوں اتنے روپے جمع کرلینا چاہتا ہوں کہ تمہاری ماں جب پہلی بار تمہیں بازار میں لائے تو میں سب سے اونچی بولی جیت کر تمہیں اپنے گھر لے آؤں۔

میں جانتا ہوں میری یہ چٹھی پڑھنے کے بعد تمہیں نئے سرے سے حوصلہ ملے گا۔ پھر تم اس وقت تک بازار میں قدم نہیں رکھو گی جب تک میں تمہیں حاصل کرنے نہیں آؤں گا۔

میرا ایک دوست گاہک بن کر مالتی کے پاس گیا تھا۔ میں اس کے ذریعے یہ چٹھی بھیج رہا ہوں۔ آئندہ بھی یہی طریقہ اختیار کروں گا مجھے تمہاری چٹھی کا انتظار رہے گا۔"

میں نے تحریر کے نیچے لکھے ہوئے کرشنا کے نام کو کئی بار چوما پھر مالتی کے پاس آکر اس سے لپٹ گئی۔ میری بہن دلدل میں جاکر میرے لیے کنول کا پھول لائی تھی۔ میں نے جواب میں محبتوں سے بھرپور خط لکھا اگلے ہفتے مالتی وہ خط چھپا کر لے گئی۔

اس چٹھی کی صورت میں کرشنا کو دوبارہ پاکر واقعی مجھ میں نیا حوصلہ پیدا ہوگیا ویسے بھی میں جان دے دیتی مگر نہ بکتی میرا یہ سارا وجود صرف اس کے لیے ہے وہ ہے تو میں ہوں نہیں ہوگا تو خود کو مٹادوں گی۔

کئی ماہ تک مجھے میرے خط کا جواب نہیں ملا کیونکہ کرشنا کا وہ دوست جو مالتی کے پاس آتا تھا بہت غریب تھا کبھی کبھی مالتی کے پاس جاتا تھا اور کبھی کبھی ہی مجھے میرے محبوب کا محبت نامہ ملتا تھا۔

ہماری زندگی میں خوشی ہو یا غم ہمیشہ نہیں ملتے کبھی کبھی ملتے ہیں۔
محبت نامہ بھی کبھی کبھی ملتا تھا اس لئے کبھی کبھی محبت کی عید ہو جاتی تھی۔
یوں کبھی کبھی زندگی کی رونق لوٹ آتی تھی۔

اپنے کرشنا کے لیے بہت زیادہ بے چینی کے دوران کبھی کبھی راحت ملتی تھی۔ دکھ اتنا بڑھ جاتا تھا کہ دوا بن جاتا تھا۔

کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ میں کسی کو آواز دیتی تو اس کا نام آجاتا تھا۔

مجھ پر عجیب بے خودی کا عالم طاری تھا۔ میں نے اسی طرح دو برس گزار دیے میں پالتی مار کر دھیان گیان میں ڈوب جاتی تھی۔ دنیا سمجھتی تھی بھگوان بھگتی میں کھوگئی ہوں مگر میرے اندر کرشنا بولتا رہتا تھا۔

ماں میری یہ حالت دیکھ کر پھر مجھے بازار میں لے جانے کی ضد کرنے لگی تھی۔ ایسے وقت مالتی نے مجھے کرشنا کا خط لا کر دیا۔ اس نے لکھا تھا کہ دو برس تک محنت مزدوری کرکے دیکھ لی۔ مزدوری میں پیٹ بھر جاتا ہے رقم جمع نہیں ہوتی کچھ جمع کرو تو اسے دکھ بیماری کھالیتی ہے اس لیے وہ فوج میں جارہا ہے۔

چار برس پہلے ہندوستانی جوانوں کو فوج میں لیا جارہا تھا۔ وہ زیادہ رقم کمانے کے لیے فوج میں بھرتی ہو کر برما کے محاذ پر چلا گیا۔" (اس وقت دوسری جنگ عظیم جاری تھی)

میں نے میرا جوگن سے کہا۔ "تم فضول اس کا انتظار کررہی ہو۔ جنگ پر جانے والے ہندوستانیوں کی لاشیں آرہی ہیں۔ اکثر ایسے ہیں جن کی لاشیں بھی نہیں مل رہی ہیں۔"

وہ بولی۔ "ایسی بدشگونی کی باتیں نہ کرو اسے میرے یقین میں زندہ رہنے دو۔"

"کیا اس نے محاذ جنگ سے بھی خط لکھا؟"

"ہاں دو برسوں میں مالتی کے ذریعے دو چٹھیاں ملیں جب وہ اپنی چٹھی میں جنگ کی ہولناکی لکھتا تھا تو میں سہم جاتی تھی بھگوان کرشن کی مورتی کو دودھ سے دھوتی تھی اور من ہی من میں کہتی تھی ہرے کرشنا! اسے میرے کرشنا کی ماں کا دودھ مان لے دودھ سے اشنان کرکے اسے جنگ کے عذاب سے بچالے۔

میں نے میرا جوگن سے کہا۔ "مجھے تم سے ہمدردی ہے تم بھی مجھ سے ہمدردی کرو بہت وقت ضائع ہوچکا ہے میری آغوش میں آجاؤ۔"

"صرف ایک منٹ اور صبر کرو۔ یہ سن لو کہ آج تک میں نے کسی گاہک کو اپنے کرشنا کا نام نہیں بتایا اگر بتادیتی تو وہ سمجھ لیتے کہ میں بھگوان کرشن کی پجارن نہیں بلکہ اپنے کرشنا کی جوگن ہوں۔"

"تم مجھے اس لیے کرشنا کا نام بتا رہی ہو کہ میں مسلمان ہوں۔ تمہاری بھگوان بھگتی یا کرشنا بھگتی سے اثر نہیں لوں گا پوری قیمت وصول کرکے جاؤں گا۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی ایک ہاتھ کے فاصلے پر روبرو آگئی۔ جب اس نے ایک ہاتھ اپنے شانے پر لیجاکر ساڑی کا آنچل ڈھلکایا تو میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ اس کا سانس لیتا ہوا بدن کبھی آمنے کبھی سامنے ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میری سانسیں کبھی رک رک کر آنے لگیں کبھی رک رک کر جانے لگیں۔

اس کا بلاؤز گلے تک بند تھا۔ وہ بند گلے کا پہلا بٹن کھولتے ہوئے بولی۔ "یہ وہ مرحلہ ہے کہ آنکھیں دیکھنے کے لیے اپنے حلقوں سے باہر نکل پڑتی ہیں۔ تم بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھو۔"

میں نے دیکھا ایک بٹن کی مناسبت سے جتنا کپڑا کھلا تھا اور جتنا بدن نظر آیا تھا وہاں کی صاف شفاف جلد پر کرشنا لکھا ہوا تھا۔

وہ نام قلم سے نہیں لکھا تھا اور وہ نام چاقو سے کندہ نہیں کیا گیا تھا بدن کا وہ خوبصورت حصہ چھالے کی زبان سے کرشنا کہہ رہا تھا یعنی اس نے اپنی نازک جلد کو آگ سے جلا کر وہ نام لکھا تھا اس لیے وہاں آبلہ پڑگیا تھا۔

گردن کے نیچے اس کی وہ جلد ایک نیم پلیٹ تھی ابھی دروازہ نہیں کھلا تھا مگر نام کی تختی بتارہی تھی کہ یہ اس کے کرشنا کا گھر ہے اس گھر میں کوئی دوسرا داخل نہیں ہوسکے گا۔

اس نے دوسرا بٹن کھولا گویا میری آنکھیں کھول دیں۔ اجلے بدن کی چکناہٹ پر اِدھر بھی چھالے تھے اُدھر بھی چھالے تھے تمام چھالے کرشنا کرشنا کہہ رہے تھے چکناہٹ پر نظریں پھسلتی ہیں لیکن وہاں نظریں تھم تھم جاتی تھیں اس کے محبوب کا نام جگہ جگہ آبلہ حروف سے لکھا ہوا تھا۔

وہ ایک انگلی کے اشارے سے چھالے دکھا دکھا کر کہنے لگی "جب میں پندرہ برس کی تھی تو اس نے پہلا بوسہ یہاں لیا تھا پھر یہاں پھر یہاں اور پھر یہاں..."

ہر چھالا ایک بوسہ تھا اور ہر بوسہ ایک چھالا بن گیا تھا۔ وہ بولی۔ "میں کبھی ایسا نہ کرتی لیکن جب وہ لام پر گیا اور ماں مجھے بیچنے کی ضد کرنے لگی تو یہ فکر ہوئی کہ میری تنہائی میں کوئی دوسرا آئے گا تو میرے محبوب کی امانت میں خیانت ہوجائے گی کوئی دوسرا شخص یہاں اپنے ہونٹ رکھے گا میں کسی اور کو یہاں پیار کا سجدہ نہیں کرنے دوں گی۔"

اس نے ایک چھوٹا سا پیتل کا سانچہ نکال کر دکھایا اس سانچے میں ہندی زبان کے حروف سے "کرشنا" لکھا ہوا تھا۔ یعنی وہ پکی مہر تھی۔ اسے آگ میں رکھ کر اچھی طرح تپا کر

جب وہ اپنے بدن پر رکھتی تھی تو وہاں اپنے محبوب کے نام کا آبلہ پڑجاتا تھا۔

پتا نہیں وہ اس جلن کو اس اذیت کو کیسے برداشت کرتی ہوگی۔ جسم کو ایک بار داغا جائے تو بڑی مشکلوں سے بڑے حوصلے سے تکلیف برداشت ہوتی ہے وہ بار بار کس طرح اذیتوں سے گزرتی رہی ہوگی وہ روتی رہی ہوگی یا انگ انگ کو محبوب کے نام کرنے کے جنون میں ہنستی رہی ہوگی۔

وہ جوگن کا روپ دھار کر رہتی تھی ہندو عقیدت مند سمجھتے تھے کہ جس طرح تپیا کرنے والے عبادت کے یا عقیدے کے جنون میں بھڑکتی ہوئی آگ میں کود جاتے ہیں اسی طرح میرا جوگن نے کرشن بھگوان کی پریم پوجا میں اپنے بدن کو جلا جلا کر بھگوان کا وہ نام لکھا ہے۔ "کرشنا!"

گناہ کے ارادے سے آنے والے ہندو آبلوں کی زبان پر وہ نام پڑھتے ہی دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکا لیتے تھے یہ سمجھ میں آگیا کہ ایک پجارن نے اپنے بھگوان کا نہیں ایک جوگن نے اپنے پریمی کا نام لکھا ہے۔

میں نے پوچھا "یہ تم نے کیا کیا؟"

وہ بولی۔ "کوئی اپنی پریم کہانی روشنائی سے لکھتا ہے کوئی خون جگر سے لکھ دیتا ہے میں نے آبلوں سے لکھا ہے۔"

وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "میں کبھی ایسا نہ کرتی بہت زیادہ کرتی تو پیار سے اپنے بدن کے کسی ایک حصے پر اس کا نام چھاپ دیتی مگر اس کی چٹھی آنی بند ہوگئی پہلی بار اس نے لکھا تھا کہ وہ برما کے محاذ پر ہے دوسری بار چٹھی آئی کہ جاپان بمباری کرتا ہوا ہانگ کانگ سے آگے بڑھتا ہوا ویتنام کی طرف آرہا ہے۔ اس لئے انڈین آرمی کو کمپوچیا اور کمبوڈیا بھیجا جارہا ہے۔

اس کے بعد وہاں سے ڈاک کا نظام معطل ہوگیا۔ اس کا محبوب اس کے یقین میں زندہ تھا مگر حالات مایوس کررہے تھے ماں اس کی دام وصول کرنے کی ضد کررہی تھی ایسے میں وہ جانے والا واپس آتا یا نہ آتا لیکن وہ اپنے بدن کو ممنوعہ بناتی رہی تھی۔

اس کے بلاؤز کا نچلا دامن لہنگے میں اڑسا ہوا تھا۔ اس نے لہنگے سے دامن کو اٹھا کر دکھایا پیٹ اور کمر پر بھی محبوب کے نام کے آبلے پڑے تھے۔ یہ سمجھ میں آگیا کہ اس نے گردن سے گھٹنوں تک آبلوں کی تحریر لکھی تھی اور یوں کتاب آبلہ بدن ہوگئی تھی۔

کوئی ہاتھ لگائے کہاں لگائے گا؟ جہاں ہاتھ رکھا جائے گا وہاں پریمی کا نام ہوگا۔

جو بھی شب خون مارنے آئے گا اسے انگ انگ پر محبت آبلہ پا ملے گی۔

میں پیچھے ہٹ گیا۔ آگے آبلوں کی فصیل تھی اس کا چہرہ خوبصورت تھا۔ ہاتھ پاؤں خوبصورت تھے باقی لباس میں چھپ کر للچانے والا بدن بدصورت ہوگیا تھا۔ اس بدصورتی میں بھرپور جوانی تھی مگر نادانی کو بھڑکاتی نہیں تھی۔

جو ہندو آتا تھا وہ ہرے کرشنا کہہ کر چلا جاتا تھا کوئی گورا فوجی آیا ہوگا تو اسے دیکھ کر یہی سمجھا ہوگا کہ میرا کو فوجی چھاؤنی سے پھیلنے والی بیماری لگ گئی ہے پھر وہ الٹے پاؤں لوٹ گیا ہوگا اور اس کا بدن مجھ جیسے مسلمان سے بھی پوچھ رہا تھا۔ "مجھے ہاتھ لگاؤ گے؟ میں نے خود کو شجر ممنوعہ بنالیا ہے۔"

شجر ممنوعہ سے مراد برائی کا بدن ہے' ہر عورت کا بدن نہیں ہے۔

اگر کسی نے ایک پتھر کا بدن تراش کر اسے خدا مانا تو وہ شجر ممنوعہ ہے۔

دولت کی ہوس میں سونے کا مینار بنایا تو وہ شجر ممنوعہ ہے۔ روٹی کی بھوک فطری ہے روٹی کی ہوس ممنوعہ ہے۔

لباس تہذیب بیچ کر ریشم و کمخواب اوڑھنا ممنوعہ ہے یعنی شجر ممنوعہ ایک اصطلاح ہے ہر اس چیز کے لیے جو خدا نے منع کردی۔

سورۃ الجاثیہ 45 میں ارشاد ہے "پھر کیا تم نے کبھی اس شخص کے حال پر غور کیا جس نے اپنی خواہش نفس کو خدا بنالیا۔"

خواہش یعنی جو چاہے وہ کر گزرے حرام کو حرام نہ سمجھے۔ حلال کو حلال نہ مانے اور اللہ تعالیٰ نے صرف نامحرم کو حرام نہیں کیا اور بھی کھانے پینے بدمست ہونے اور دیگر شوق کو بھڑکانے والی چیزوں کو بھی حرام کیا ہے۔

لہٰذا ہر وہ چیز ممنوعہ ہے جو شجر کی مانند انسان کے اندر جڑوں اور شاخوں کی طرح پھیلتی ہے میرا جوگن کی طرح کسی بھی شجر شوق کے تن پر کانٹے ہوں گے تو آدمی اس سے نہیں لپٹے گا۔

میں نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے سے باہر آگیا۔ کاریڈور کے فرش پر مرلی دھر دیوار سے ٹیک لگائے بے خبر سو رہا تھا۔ میں اسے فرش پر گھسیٹتا ہوا اپنے کمرے میں لے آیا۔ آدھے گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی میں نے دروازہ کھولا۔ میرا کی ماں کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ روتی ہوئی کمرے میں آئی۔ ہمارے ہزار روپے واپس دے کر بولی۔ "آج اس نے سارے بھید کھول دیے۔ میں نے اسے پیدا کیا ہے اور وہ مجھ سے اپنا بدن چھپاتی تھی۔ ابھی اس جنم جلی نے اپنا جلا ہوا بدن دکھایا ہے ہائے اس نے کرشنا کے انتظار میں اپنی حسن و شباب کو غارت کردیا ہے میں تو ڈوب گئی۔ اب تو وہ ایک آنے میں بھی نہیں بکے گی۔"

وہ اپنے ڈوبنے کا ماتم کرتی ہوئی چلی گئی۔ میں اور مرلی دھر دوسرے دن دو نئی جیپ

گاڑیاں خرید کر رائے پور چلے آئے۔ میں نے دو ماہ بعد شادی کرلی پھر ہر دوسرے تیسرے یا چوتھے سال ایک ایک بچے کا باپ بنتا چلا گیا۔ کبھی کبھی یادوں کی البم کھول کر میرا جوگن کو تصور میں دیکھتا تھا۔ سوچتا تھا پتا نہیں وہ کہاں ہوگی؟ کس حال میں ہوگی؟ سپاہی کرشنا مشرق بعید کے میدان جنگ سے واپس آیا ہوگا یا نہیں؟ میرے پاؤں میں بیوی بچوں کی ایسی زنجیر پڑگئی تھی کہ پھر میں ادھر نہ جاسکا۔ وہ یاد آتی تو اسے تھوڑی دیر سوچتا تھا پھر بھول جاتا تھا۔"

بھائی عظیم الدین نے یہاں تک داستان سنا کر مجھ سے کہا۔ "میاں! گھڑی دیکھو۔ رات کے دو بج گئے ہیں کیا سونے کا ارادہ نہیں ہے؟"

میں نے کہا "آپ نے ہوش اڑا دینے والی داستان سنائی ہے ویسے ہوش میں تو ہوں مگر نیند اڑگئی ہے۔"

"یہ جو کچھ میں نے سنایا ہے اس پر غور کرو تو سمجھ میں آئے گا کہ ہم سب اپنے مفادات کے مطابق کبھی غیرت مند بنتے ہیں اور کبھی بے غیرت کبھی دھرم والے بنتے ہیں اور کبھی بے دھرم۔ سیما اور عبدالرحیم کے عشق کے نتیجے میں کرشنا پیدا ہوا۔ وہ عشق اور ہوس میں بھول گئے کہ بچے کی پیدائش بے غیرتی ہے۔ پھر انہوں نے اپنے خاندان کی عزت رکھنے کے لیے اسے دوسرے دھرم کی گود میں دے دیا اور اسلامی غیرت کو بھول گئے جہاں جان پر اور عزت پر بن آتی ہے وہاں غیرت کا وزن کم ہوجاتا ہے۔

گورے گاؤں کے لوگ میرا کی ماں پر لعنت بھیجتے تھے کیونکہ جسم فروشی اس کا خاندانی پیشہ تھا لیکن جب انکشاف ہوا کہ کرشنا مسلمان ہے تو دھندا کرنے والی کی بیٹی ہندو دھرم کے لیے غیرت بن گئی۔

غیرت کسی اکیلی چیز کا نام نہیں ہے۔ غیرت خدا مذہب انسانی انا اور خود داری کے مجموعی احساس سے آدمی کے اندر پروان چڑھتی اور مستحکم ہوتی ہے۔

مگر یہ آدمی اپنی فطرت اور مزاج کے مطابق غیرت کا معیار بدلتا رہتا ہے جب پہلی بار اپنے خاندان کی ایک لڑکی سلمٰی ہندو گھر میں گئی تو ہماری غیرت بھڑک گئی۔ ہم نے اس ہندو دھرم چند اگروال کے خلاف اخبارات میں لکھا۔ یہاں کے علما نے دہلی تک اگروال کے خلاف آواز پہنچائی مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ ہم اگروال کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔

اب ہماری غیرت اسی میں تھی کہ ہم سلمٰی کو اپنی ذات برادری سے الگ کردیں لیکن یوسف بھائی اور زینت بھابی اپنی بیٹی سے بہت محبت کرتے تھے۔ انہوں نے اس سے قطع تعلق نہیں کیا وہ ہمیں چھوڑ کر ناگ پور چلے گئے یوں یوسف بھائی کے پورے کنبے سے ہمارے تمام رشتے ناتے ختم ہوگئے۔

مجھے حالات اور زمانے کی اونچ نیچ نے سمجھایا تھا کہ ہمیں انتہا پسند نہیں ہونا چاہیے

ہندو اور مسلمان دونوں ہی انسان ہیں۔ دونوں سے غلطیاں ہوتی رہتی ہیں جسے جتنی طاقت ملتی ہے وہ اسی کے مطابق دوسرے کو نقصان پہنچاتا اور غیرت کا مسئلہ پیدا کرتا رہتا ہے سلمٰی کو میں نے گود میں کھلایا تھا اسے بہت چاہتا تھا۔ اس سے ملنے کے لیے دل بے چین ہو رہا تھا۔ میں نے تمہاری بھاوج سے کہا "میں سلمٰی سے ملنے ناگ پور جارہا ہوں۔"

یہ بات خاندان کے بزرگوں تک پہنچی تو وہ مجھے ڈانٹنے لگے۔ ایک بزرگ نے کہا "وہ کافر ہوچکی ہے نہ تم اس کے چچا رہے نہ وہ تمہاری بھتیجی رہی۔ تم اس سے ملنے نہیں جاؤ گے۔"

"میں صرف ایک بار جاؤں گا۔"

"کیا اس سے ملاقات کرنے ایک ملعون کافر کے گھر جاؤ گے۔"

میں نے کہا۔ "بزرگوار ہم دیوالی اور دسہرے میں ہندوؤں کے گھر جاکر کھاتے پیتے ہیں۔ جب ان کی مٹھائی اور ان کا نمک کھالیتے ہیں تو اپنے خون کے رشتے سے کیوں نہیں مل سکتے۔"

"پوری برادری نے یہ فیصلہ سنا دیا ہے کہ اس سے ہمارا خون کا رشتہ نہیں رہا ہے۔"

"اگر خون ہندو اور خون مسلمان ہوتا ہے تو آپ کے فیصلے کے بعد بھی سلمٰی کی رگوں میں میرے مسلمان بھائی کا لہو دوڑ رہا ہے۔ آپس میں ناراضی ہوتی ہے بلکہ دشمنی بھی ہوتی ہے لیکن خون سے خون جدا نہیں ہوتا۔"

ایک بزرگ نے کہا "تم ہمیں سمجھانے کی کوشش نہ کرو۔ یہ مذہبی معاملہ ہے۔ ہم جان دے دیتے ہیں مگر اپنے مذہب پر آنچ نہیں آنے دیتے۔ کیا تمہاری مذہبی غیرت مرچکی ہے؟"

"آپ حضرات کی غیرت اس وقت کہاں تھی جب سلمٰی کو اغوا کیا گیا تھا؟ آپ حضرات نے اگروال اور اس کے ہندو غنڈوں کا کیا بگاڑ لیا تھا؟ آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس معاملے میں سلمٰی کا کوئی قصور نہیں ہے ایک تو وہ پہلے ہی مظلوم تھی اس پر ہم نے اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا۔ یہ تو اس بے چاری کے ساتھ سراسر ناانصافی ہو رہی ہے۔"

ہمارے درمیان تمام رات بحث ہوتی رہی میرے جوان بچوں نے میری حمایت کی میں دوسرے دن ناگ پور چلا آیا۔ یوسف بھائی اور بھابی کو بڑی حیرانی ہوئی وہ تو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اب کوئی رشتے دار ان کے گھر نہیں آئے گا۔ یوسف بھائی نے مجھے گلے لگالیا۔ بھابی نے میری بلائیں لیں۔ ان کے جوان بچے خوشی سے رو رہے تھے مجھے ان کی آنسو بھری خوشیوں نے بہت متاثر کیا۔ میں نے کہا۔ "تم لوگوں نے کیا سوچا تھا؟ کیا میں تمہارا چچا نہیں ہوں؟ جب سلمٰی اتنی سی تھی تو میری گود میں رہتی تھی اور میرے پہلو میں سوتی تھی

کیا میں اسے کبھی بھول سکتا ہوں؟"

میرے جذبات نے زینت بھابی کو رُلادیا۔ وہ بولیں۔ "سلمٰی بھی آپ کو نہیں بھولتی! ایک بار مجھ سے کہہ رہی تھی سب ناراض ہوگئے۔ سب نے ناتا توڑ دیا کیا میرے چچا جان بھی کبھی نہیں آئیں گے۔"

"اس سے کہو میں آگیا ہوں۔ ابھی فون کرو میں اس سے بات کروں گا۔"

زینت بھابی نے فوراً" ہی فون پر رابطہ کیا پھر کہا۔ "میں سلمٰی کی ماں ہوں اسے فون پر بلاؤ۔"

بھابی نے تھوڑی دیر تک چپ رہ کر انتظار کیا پھر بولیں۔ "ہیلو سلمٰی! کیسی ہو بیٹی؟" انہوں نے بیٹی کی خیریت معلوم کی پھر کہا۔ "رائے پور سے تمہارے چچا جان آئے ہیں تمہارے لیے لو بات کرو۔"

میں نے ریسیور لے کر کان سے لگایا پھر کہا "ہیلو میری پیاری بیٹی!"

دوسری طرف خاموشی رہی۔ پھر سسکیاں سنائی دیں۔ میں نے کہا۔ "نہیں خبردار! رونا نہیں ورنہ میں رائے پور واپس چلا جاؤں گا۔"

"مم... میں نہیں رو رہی ہوں۔ سچ کہتی ہوں چچا جان! خوشی برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ کیا میں آپ سے ملنے آؤں؟"

"کیا پوچھ کر آؤگی؟ اگر آنے میں کوئی دشواری ہو تو میں تمہارے پاس چلا آؤں۔"

"آپ آئیں گے تو میری عید ہوجائے گی۔ آپ کے داماد بھی خوش ہوں گے۔"

میرے دماغ کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ میں بھتیجی کی محبت میں بھول گیا تھا کہ ایک ہندو میرا داماد ہے۔ یہ کتنی بڑی گالی ہے اسے صرف مسلمان ہی سمجھ سکتے ہیں۔ آدمی زندگی میں بڑی بڑی گالیاں کھاتا ہے ان میں سے کوئی گالی ایسی نہیں ہوتی جو گولی کی طرح لگے اور آدمی مرجائے آدمی پھر بھی زندہ رہتا ہے۔"

بھائی عظیم الدین آگے کہنے جارہے تھے۔ میں نے کہا۔ "میں پاکستان سے آیا ہوں۔ میرے لیے یہ ہندو داماد والی بات بالکل ہی ناقابل برداشت ہے یہ آپ داستان کے کس زہریلے موڑ پر آگئے ہیں؟"

"ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کی دنیا میں اور ہماری زندگی میں ایسی ایسی زہریلی اور شرمناک سچائیاں ہیں جنہیں ہم شرم سے کاغذ پر نہیں لکھتے کسی کے سامنے زبان سے بول نہیں پاتے ہم چھپاتے ہیں۔ اس لیے چھپاتے ہیں کہ ایسی باتیں بولتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔"

"تو پھر آپ نہ بولیں۔ بس معلوم ہوگیا کہ سلمٰی کیسی زندگی گزار رہی ہے؟"

"میں نے آگے کچھ بتایا نہیں پھر تم نے کیسے سمجھ لیا کہ وہ کیسی زندگی گزار رہی ہے؟"

"کیا اس بے حیائی کو سمجھنے کے لیے کچھ رہ گیا ہے؟"

"کیسی بے حیائی؟ کیا تم سلمٰی کو بے غیرت سمجھ رہے ہو؟"

"بے شک ابھی تم نے کہا ہے کہ ہندو کو داماد کہنے سے گالی محسوس ہوتی ہے۔"

"ایسا میں نے ضرور کہا ہے لیکن سلمٰی نے ایسا کوئی کام نہیں کیا ہے جس سے ہم مسلمانوں کا سر جھک جائے۔"

"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ اگروال کے گھر میں ہے اور اگروال سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے؟"

"ہے مگر وہ اس کی بیاہتا ہے اس کے بچے کی ماں ہے۔"

"عظیم بھائی! آپ واقعات کو الجھا رہے ہیں کیا آپ یہ کہیں گے کہ اس نے اگروال کو مسلمان بنالیا ہے؟"

"میں خواہ مخواہ ایسا کیوں کہوں جبکہ اگروال پیدائشی مسلمان ہے۔"

"کیا؟" حیرت سے میرا منہ کھل گیا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا میں جو سن رہا ہوں وہی آپ کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں میں وہی کہہ رہا ہوں۔"

"پھر ایک بار کہیں کیا وہ دھرم چند جو کسی اگروال فیملی سے تعلق رکھتا ہے وہ پیدائشی مسلمان ہے؟"

انہوں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ "اتنے حیران کیوں ہوتے ہو؟ آگے تو سنو کہ معاملہ کیا ہے۔ تمہاری دلچسپی بڑھ جائے گی تم لیٹے ہوئے ہو اٹھ کر بیٹھ جاؤ گے۔"

پھر وہ سلمٰی کی روداد آگے بیان کرنے لگے۔

"میں اس روز زینت بھابی کے ساتھ سلمٰی سے ملنے گیا وہ کئی ہزار گز کی کوٹھی میں مہارانی کی طرح رہتی تھی۔ درجنوں نوکر چاکر تھے۔ مین گیٹ پر مسلح سپاہی کھڑے رہتے تھے۔ انہیں ہماری آمد کی اطلاع دی گئی تھی۔ اس لیے انہوں نے بڑا گیٹ کھول دیا۔ ہماری کار پورچ میں آکر رکی سلمٰی اندر سے دوڑتی ہوئی آئی تھی۔ میرے کار سے نکلتے ہی لپٹ کر ہنسنے اور رونے لگی میں نے اس کی پیشانی کو بوسہ دے کر اس کے آنسو پونچھے۔ پھر زینت بھابی نے اسے گلے سے لگا کر پیار کیا۔ ہم اسی طرح جذبوں میں بہتے ہوئے اندر آکر ایک شاہانہ طرز کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔

اگروال سیاست کے میدان کا کھلاڑی تھا۔ اس وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں بھارت کے بڑے بڑے نیتا آتے تھے اور وہاں کئی کئی گھنٹوں اور کئی کئی دنوں تک سیاسی سرگرمیاں جاری رہتی تھیں۔ سلمٰی نے بتایا کہ اس کا شوہر دہلی گیا ہے۔ آج رات کو کسی

وقت آئے گا اور ساس اپنے کمرے میں سو رہی ہے یہ اس کا معمول ہے وہ شام پانچ بجے بیدار ہوگی- اس نے ہمارے لیے پر تکلف ناشتے کا انتظام کیا تھا- مجھ سے کہا- "جب تک آپ کو اگروال سے نہیں ملاؤں گی تب تک جانے نہیں دوں گی- آپ رات کا کھانا بھی یہیں کھائیں گے اور یہیں سوئیں گے-"

"بیٹی! میں پھر کسی دن آجاؤں گا- آج تمہیں خوش باش دیکھ کر اطمینان ہوگیا-"

"میں تو آپ کے آنے سے مطمئن نہیں ہوں- میری خوشی اسی میں ہے کہ آپ اگروال سے مل کر جائیں-"

"ضد نہ کرو بیٹی!"

"ٹھیک ہے ضد نہیں کروں گی- آپ چلے جائیں میں بھی آج رات کا کھانا نہیں کھاؤں گی-"

کئی بار ایسا ہوا کہ جب وہ ناراض ہوتی تھی رات کا کھانا نہیں کھاتی تھی تو میں اسے مناتا تھا جب وہ نہ مانتی تو میں رات کا کھانا نہیں کھاتا تھا اس نے یہی حربہ مجھ پر استعمال کیا میں مجبور ہو کر اس کے پتی کے انتظار میں وہاں ٹھہر گیا زینت بھابی واپس چلی گئیں- ان کے جانے کے بعد سلمٰی نے کہا- "چچا جان! آج تک میرے میکے سے صرف امی اور بہن بھائی ملنے آئے ابا جان کبھی نہیں آئے- رائے پور سے بھی مجھے طعنے ملے میں بیان نہیں کرسکتی کہ آپ کے یہاں آنے سے مجھے کتنی مسرتیں حاصل ہو رہی ہیں-"

"میں بھی تمہیں یہاں شادو آباد دیکھ کر خوش ہورہا ہوں- بس ایک ہی بات کھٹک رہی ہے-"

"میں اچھی طرح سمجھ رہی ہوں آپ کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچ رہی ہے-"

"ہاں بیٹی! مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے-"

"چچا جان! میں اب بھی مسلمان ہوں- میرا نام اب بھی سلمٰی ہے- میں باقاعدگی سے پانچوں وقت کی نہ سہی ایک دو وقت کی نماز ضرور پڑھتی ہوں-"

"اور وہ پوجا کرتا ہے-"

"میری ساس کے کمرے میں بھگوان کی مورتی ہے مگر میں نے اپنے شوہر کو کبھی پوجا کرتے نہیں دیکھا-"

"گھر میں نہ سہی باہر کرتا ہوگا آخر سیاسی آدمی ہے عوام کا دل جیتنے کے لیے دھرم کی نمائش کرتا ہوگا-"

"نہیں وہ کبھی مندر نہیں گئے انہوں نے اپنی تقریری میں کبھی دھارمک خیالات کا اظہار نہیں کیا-"

"یہ کیسے ممکن ہے بھارت میں لیڈر بننے کے لیے کٹر ہندو ہونے کا ثبوت پیش کرنا پڑتا

ہے-"

"چچا جان! آپ بھول رہے ہیں کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر کبھی دھرم کی اور بھگوان کی بات نہیں کرتے ہیں- کٹر کمیونسٹ پارٹی کے نیتا خدا بھگوان مذہب اور دھرم کو نہیں مانتے وہ جنتا سے صرف بھوک اور بیروزگاری دور کرنے کے وعدے کرتے ہیں-"

"اس کا مطلب ہے وہ دہریہ ہے منکر مذہب ہے؟"

"یہ آپ کے لیے باعث اطمینان ہونا چاہیے کہ وہ ہندو نہیں ہیں-"

واقعی میں اندر ہی اندر بڑی حد تک مطمئن ہوگیا تھا- میں نے سلمٰی سے کہا- "اطمینان کیسے ہو سکتا ہے؟ تم جس گھر میں ہو وہ ہندو گھرانہ کہلاتا ہے-"

"نہیں یہ سیاسی اور سرکاری طور پر کمیونسٹ گھرانہ کہلاتا ہے-"

میں سوچ میں پڑگیا- اس گھر میں ساس پوجا کرتی تھی بہو نماز پڑھتی تھی ان کے درمیان اگروال دھرم اور مذہبی پابندیوں سے آزاد تھا- میں نے کہا "ٹھیک ہے کہ اگروال ہندو نہیں ہے لیکن اس کے باپ دادا تو ہندو رہے ہوں گے-"

"میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہوں گی آپ ایمان والے ہیں خدا پر آپ کا بھروسہ مضبوط ہے تو اطمینان رکھیں کہ میں اب تک باقاعدہ مسلمان ہوں اور میرے مذہب پر کوئی آنچ نہیں آئی ہے-"

ایک ملازمہ نے آکر اطلاع دی کہ اس کی ساس بیدار ہوگئی ہے اور اسے پوچھ رہی ہے وہ اٹھ کر بولی- "مجھے اجازت دیں میں ابھی آجاؤں گی-"

"کوئی بات نہیں بیٹی! تم جاؤ-"

وہ چلی گئی- میں سینٹر ٹیبل پر سے ایک رسالہ اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا- سلمٰی جو کچھ کہہ گئی تھی وہ باتیں میرے دماغ میں گردش کررہی تھیں- میں زندگی کے ایسے ایسے موڑ سے گزرتا آیا ہوں جہاں مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے یعنی خدا پر تو ایمان رہتا ہے لیکن مذہب کو برتنے کے سلسلے میں بے ایمانی ہوتی رہتی ہے اس کی مثالیں میں اس داستان کے کئی حصوں میں پیش کرچکا ہوں-

عام زندگی میں یہی مثال کیا کم ہے کہ کسی کے سامنے خدا کی قسم کھا کر کسی بات کا یقین دلاؤ تو اگلا یقین نہیں کرے گا- عدالت میں کلام پاک پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانے کو کہو تو جھوٹی گواہی دینے والا خدا کا خوف کیے بغیر قسم کھالے گا ایسے ایک دو نہیں ہزاروں لاکھوں بے ایمان ہیں ان کے درمیان اپنا ایمان سلامت رکھنا ہی بہت بڑی عبادت ہے-

مجھے سلمٰی کی آواز سنائی دی- "آئیے ماں جی! میرے چچا جان سے ملیے-"

وہ ایک بوڑھی خاتون کے ساتھ ڈرائنگ روم کا پردہ ہٹا کر داخل ہوئی گیروے رنگ کی ساڑھی دیکھتے ہی میرے دماغ میں بجلی سی کوند گئی- میں ایک دم سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا وہ میرا

جوگن تھی۔"

بھائی عظیم الدین سے یہ سنتے ہی میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے درست کہا تھا کہ میں ابھی لیٹا ہوا ہوں داستان کے ایک دلچسپ موڑ پر اٹھ بیٹھوں گا میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "میرا جوگن؟"

"ہاں پہلے تو میں نے اسے صورت سے نہیں پہچانا صرف گیروے رنگ کا لباس دیکھ کر چونک گیا تھا۔ اس کی آنکھوں پر عینک تھی چہرے پر کئی جگہ جھریاں پڑگئی تھیں۔ بال سفید ہوگئے تھے۔ وہ ہاتھی دانت کے دستے کی ایک چھڑی ٹیکتی ہوئی سلمیٰ کے ساتھ آئی وہ زیر لب بڑبڑا رہی تھی۔ قریب آنے پر سنائی دیا۔ "ہرے کرشنا ہرے ہرے...."

پھر وہ ایک صوفے کے پاس رکی اور مجھے دیکھ کر بولی۔ "آداب!"

میں نے کہا۔ "آداب تسلیمات۔"

میرے جی میں آیا اسے میرا جوگن کہہ کر مخاطب کروں مگر سلمیٰ کی موجودگی کی وجہ سے زبان بند رکھی۔ ویسے وہ ذرا ٹھٹک گئی۔ آنکھوں پر عینک درست کرکے مجھے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ سلمیٰ نے کہا "ماں جی! بیٹھ جائیں۔"

"آں؟" اس نے چونک کر سلمیٰ کو دیکھا پھر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔"

میں نے کہا "تمہاری یادداشت اچھی ہے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ ورنہ کسی کو بھول جانے کے لیے تیس برس بہت ہوتے ہیں۔ ہم انیس سو پینتالیس میں ملے تھے اور یہ انیس سو پچھتر ہے۔"

وہ مجھے اور زیادہ غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "ہم تیس برس پہلے کہاں ملے تھے؟"

"میں اپنے ایک دوست مرلی دھر کے ساتھ حیدر آباد سے بمبئی آرہا تھا۔ تم تھرڈ کلاس کمپاٹمنٹ میں اپنی ماں اپنی بہن مالتی اور شاردا کے ساتھ تھیں۔ تمہیں حیدر آباد کے دیوان جی نے بڑی عزت سے رخصت کیا تھا۔"

دیوان جی کے حوالے پر وہ چونک گئی۔ مجھے ایسے دیکھنے لگی جیسے اسکرین پر تیس برس پہلے کی فلم چل رہی ہو۔ گزری ہوئی باتیں جیسے جیسے یاد آرہی تھیں اس کا چہرا بجھتا جارہا تھا۔

پھر وہ ہچکچاتے ہوئے سلمیٰ سے بولی۔ "بہو! تمہارے چچا جان میرے پرانے جان پہچان والے ہیں۔ بیٹی ان سے تنہائی میں باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے ماں جی! میں چائے لے کر آتی ہوں۔"

مجھے کمرے میں پہنچا دو۔ چائے وہیں بھیج دینا۔"

پھر وہ صوفے سے اٹھ کر مجھ سے بولی۔ "آپ کو زحمت دے رہی ہوں۔ میرے

کمرے میں بیٹھنا پسند کریں گے؟"

"ضرور مجھے تم سے مل کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔"

وہ سلمیٰ اور چھڑی کے سہارے چلتی ہوئی اپنے بیڈ روم میں آئی۔ میں بھی اس کے پیچھے آیا۔ وہ سلمیٰ کے جانے کے بعد بولی "دروازہ اندر سے بند کردیں میں نہیں چاہتی کوئی اچانک اندر آجائے۔"

میں نے دروازے کو اندر سے بند کردیا۔ پھر پلٹ کر پوچھا "دھرم چند اگروال تمہارا بیٹا ہے؟"

"ہاں میرا بیٹا ہے۔ میرے کرشنا کی نشانی۔"

"تو کرشنا میدان جنگ سے واپس آگیا تھا؟"

"ہاں مجھے میری محبت اور انتظار کا میٹھا پھل مل گیا تھا۔ آپ میری زندگی میں آخری گاہک بن کر آئے تھے۔ یہ بات آپ کی بھتیجی اور میرے بیٹے کو معلوم ہوگی تو میں بیٹے اور بہو سے نظریں نہیں ملاسکوں گی۔"

"میری زبان پر ایسی کوئی بات نہیں آئے گی۔ اس رات میں ایک حساس انسان بن کر تمہارے کمرے سے چلا گیا تھا۔ تم ایک دیوی ہو تم نے پیار میں آبلہ بدن ہو کر ہم جیسے کو انسانیت کا درس دیا ہے مجھے کرشنا کے بارے میں بتاؤ؟"

"کیا بتاؤں؟ اس حد تک آپ جانتے ہیں کہ گورے گاؤں کے متعصب ہندوؤں نے اسے کس بری طرح زخمی کرکے بستی سے نکالا تھا سپاہی میدان جنگ میں جاکر زخم کھاتے ہیں وہ دھرم کے محاذ پر زخم کھا کر میدان جنگ میں گیا تھا۔ جب وہ برما ویتنام اور کمپوچیا کے محاذ پر جاپانیوں سے لڑتا رہتا تھا تو اس کے اندر بھی ایک جنگ جاری رہتی تھی۔ وہ اپنے آپ سے پوچھتا رہتا تھا کہ وہ کرشنا ہے یا عبدالرحیم کا بیٹا؟ اگر کرشنا ہے تو ہندو اسے مارتے اور ذلیل کیوں کرتے ہیں؟"

وہ اندر ہی اندر لاوے کی طرح پک رہا تھا۔ ایسے ہی وقت وہ برما کے جنگل میں زخمی ہوکر تنہا رہ گیا۔ وہاں چند کمیونسٹ گورے اسے اٹھا کر اپنے محاذ پر لے آئے۔ اس کے زخموں کا علاج کرنے لگے اور یہ نظریہ ٹھونسنے لگے کہ دین یا دھرم کوئی اہمیت نہیں رکھتے ہیں چند ملاّ اور پنڈت سرمایہ دار اور جاگیر دار اپنے مفاد کی خاطر ان پڑھ لوگوں کے دماغوں میں یہ نقش کرتے ہیں کہ انہیں سرمایہ داروں نے نہیں خدا نے غریب بنایا ہے۔ محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والی قسمت بھی خدا ہی لکھتا ہے یہ سرمایہ دار اور جاگیر دار اپنی لوٹ کھسوٹ اور ظلم و ستم کو خدا یا بھگوان کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں جبکہ بھگوان کو کسی نے دیکھا نہیں ہے وہ ہے ہی نہیں تو دکھائی کیسے دے گا اگر ہوتا تو کبھی تو غریبوں کو نئے کپڑے پہنانے اور کباب پراٹھے کھلانے آتا۔

جب میرا کرشنا میدان جنگ سے واپس آیا تو وہ بے دین ہوچکا تھا وہ اندر سے کمیونسٹ پارٹی کا کامریڈ تھا اوپر سے حکومت برطانیہ کا فوجی جب وہ فوج کی وردی پہن کر گورے گاؤں آیا تو سب پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگے دیکھنے والوں میں وہ تمام جوان اور بوڑھے تھے جنہوں نے اسے زخمی کرکے گاؤں سے نکال دیا تھا۔

وہ ان سب کے درمیان سے گزرتا ہوا میرے گھر کی طرف آرہا تھا مجھے اس کی خبر ملی تو میں خوشی سے پاگل ہوگئی۔ دوڑتی ہوئی گھر سے باہر آئی اور تمام بستی والوں کے سامنے اس سے لپٹ گئی۔ اس نے مجھے دونوں بازوؤں میں اٹھالیا۔ پھر اسی طرح اٹھائے ہوئے وہاں سے چلتا ہوا مندر کی سیڑھیوں پر آیا اوپر پہنچ کر مجھے مندر کے فرش پر اتار دیا نیچے دور تک بستی کے مرد عورتیں بچے اور بوڑھے کھڑے ہوئے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے اس کے فوجی بننے کا یقین نہ آرہا ہو۔

وہ بلند آواز میں بولا۔ "میں وہی کرشنا ہوں جسے تم لوگوں نے یہاں سے مار پیٹ کر نکال دیا تھا۔ مجھ پر الزام تھا کہ میں ہندو نہیں بہروپیا ہوں اور تمہارا یہ دعویٰ تھا کہ یہ ہندو لڑکی میری آغوش میں نہیں آئے گی۔"

پورا مجمع خاموش تھا وہ بولا میں ابھی تمہارے سامنے اسے آغوش میں لے کر یہاں آیا ہوں۔ یہاں وہ تمام جیالے ہیں جنہوں نے اس رات مجھے میرے خون میں نہلا دیا تھا۔ آؤ سامنے آؤ۔ اگر ہمت نہیں ہے تو دور سے پتھر مارو۔ اٹھاؤ پتھر۔ اپنے گھر سے لاٹھیاں لے آؤ مجھ پر حملے کرو۔"

وہ سب خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے کچھ نوجوان وہاں سے جانے کے لیے پلٹ رہے تھے کرشنا نے اپنی گن سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ "خبردار جو یہاں سے جانا چاہے گا میں اسے گولی ماردوں گا۔"

جانے والے سہم کر اپنی جگہ ساکت ہوگئے اس نے پوچھا۔ "کیا ہوئی تمہاری وہ ہندو غیرت؟ کمیونسٹ درست کہتے ہیں کہ تم جیسے لوگ دھرم کے ٹھیکیدار ہوتے ہیں ایک بے قصور پجاری کو مندر سے اور ایک بے گناہ پریمی کو بستی سے یہ کہہ کر نکال دیتے ہو کہ وہ ہندو نہیں ہیں۔

میرے پتا جی تمہاری زیادتی برداشت نہ کرسکے اپنے گھر سے اپنے دیس سے بے دیس ہوکر مرگئے تم سب اس غریب پجاری کے قاتل ہو۔

تم نے اس بیچارے کو مندر سے نکالا تھا میں اسی مندر میں کھڑا ہوں تم نے مجھے ہندو نہیں بہروپیا کہا اب بولو میں کون ہوں؟

اس نے ایک بوڑھے کو نشانے پر لے کر کہا "تم سرپنچ ہو۔ سب کے سامنے پنچایت کا فیصلہ سناؤ میں کون ہوں؟"

بوڑھے نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا۔ "تم ہندو ہو۔"

پنچایت میں فیصلہ سنانے والے باقی چار بوڑھوں نے بھی گردنیں ہلا ہلا کر کہا۔

"ہاں تم ہندو ہو ہمارے ہندو بیٹے ہو۔ میرا سے شادی کرسکتے ہو۔"

"اس نے اپنی گن کا رخ دائیں سے بائیں بستی والوں کی طرف کرتے ہوئے پوچھا۔ جسے پنچ کے فیصلے سے انکار ہو وہ ہاتھ اٹھا کر کہہ دے کہ میں ہندو نہیں ہوں۔"

کسی میں انکار کرنے کی جرات نہیں تھی وہ سب کہنے لگے تم ہندو ہو ہمارے کرشنا ہو ہمارے کرشنا ہو"

وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ "اب مجھے ہندو کہہ رہے ہو تو پھر اپنی عقل سے سمجھو کہ دھرم کیا ہے؟ دھرم وہ لاٹھی تھی جو اس رات تمہارے ہاتھوں میں تھی اس لاٹھی سے تم نے میرا ہندو دھرم چھین کر مجھے مسلمان بنادیا اور دھرم وہ بندوق ہے جو ابھی میرے ہاتھ میں ہے اور بندوق تم سب کی زبان سے کہلوا رہی ہے کہ میں ہندو ہوں۔

لیکن نہیں آج میں تم سب کے سامنے اعلان کرتا ہوں کہ میں ہندو نہیں ہوں میں ہندو دھرم کا کرشن مراری نہیں ہوں ایک پریم پجارن کی پوجا میں رہنے والا کرشنا ہوں اور اپنی میرا کو یہاں سے لے جارہا ہوں۔ کوئی ہے روکنے والا؟

میں آسمان کی طرف ایک گولی چلا رہا ہوں اور وارننگ دے رہا ہوں۔ پہلی گولی کی آواز سنتے ہی یہاں سے بھاگ کر اپنے گھروں میں چھپ جاؤ۔ کوئی باہر نظر آئے گا تو دوسری گولی اس کے سینے میں اتاردوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے ہوائی فائر کیا مرد عورتیں بوڑھے اور بچے خوفزدہ ہوکر چیخیں مارتے ہوئے وہاں سے گرتے پڑتے اور ایک دوسرے کو روندتے ہوئے بھاگنے لگے چند منٹوں میں سناٹا چھاگیا۔ دور تک بستی ویران ہوگئی۔ سبھی نے اپنے اپنے گھروں میں جاکر کھڑکیاں اور دروزاے بند کرلیے۔

کسی نے ہمیں جاتے نہیں دیکھا۔ کرشنا مجھے بمبئی لے آیا۔ میں نے کہا۔ "جتنی جلدی ہوسکے مجھ سے بیاہ کرلو۔"

"بیاہ تو ضرور ہوگا لیکن جلدی کیوں ہے؟"

"اس لیے کہ مجھے اپنی بدنصیبی سے ڈر لگتا ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "کیسی بدنصیبی؟"

"وہ بات یہ ہے کہ ماں نے مجھے کئی بار بیچنے کی کوششیں کیں۔ میں نے اس کی کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ میری تنہائی میں جو بھی گاہک آیا وہ تمہارے نام کی مالا جپتا ہوا بھاگ گیا۔"

کرشنا نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم بند کمرے میں خوفناک بلا بن جاتی ہو؟"

میں نے گلے کا صرف ایک بٹن کھول کر اسے کرشنا کی آبلہ مہر دکھائی وہ حیرانی سے بولا۔ "یہ کیا؟ کیا تم نے خود کو جلایا ہے؟"

میں نے اسے پیتل کا سانچا دکھا کر کہا۔ "میں نے لباس کے اندر بدن کے ہر حصے میں تمہارے نام کی مہر لگائی ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟ کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تمہارے تمام بدن پر میرے نام کے آبلے پڑے ہیں؟ مجھے دکھاؤ۔"

اس نے لباس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں پیچھے ہٹ کر بولی۔ "نہیں ابھی نہیں تم اسے بیاہ کے بعد دیکھوگے۔"

"مگر تم نے اپنے آپ پر یہ ظلم کیوں کیا؟"

"گاہکوں کو دور کرنے کا یہی ایک طریقہ رہ گیا تھا کیونکہ میں کمزور تھی اکیلی تھی۔ ماں کا اور بازاری غنڈوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔"

اس نے فرط محبت سے مجھے گلے لگا لیا۔ میری محبت اور وفا کے عوض جتنا پیار دے سکتا تھا مجھے خوب پیار دیتا رہا پھر اس نے کہا۔ "ہم کورٹ میرج کریں گے۔"

میں نے کہا "کورٹ میں نہیں اپنے دھرم کے مطابق شادی کریں گے۔"

"میں تمہیں صاف صاف کہہ دوں کہ میرا کوئی دھرم نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "عدالت میں ہماری شادی کا جو کاغذ ہوگا۔ اس پر تمہیں اپنا مذہب لکھنا ہوگا۔"

"میں اس فارم میں مذہب کا خانہ خالی چھوڑ دوں گا۔"

"میں اس خانے میں ہندو دھرم لکھوں گی۔"

"تمہاری مرضی ہے لیکن میرے باپ کے خانے میں اسی کا نام ہوگا جس کا لہو میری رگوں میں ہے۔"

میں سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے کہا۔ "دنیا کی ہر چیز بدل جاتی ہے نیت بدل جاتی ہے نظر بدل جاتی ہے آدمی اپنا مذہب بھی بدل دیتا ہے حتیٰ کہ ماں بھی بدل دیتا ہے مگر باپ کبھی نہیں بدلتا۔ وہ تو ایک ہی رہے گا۔ عبدالرحیم..."

ہم نے کورٹ میرج کرلی۔ برٹش سرکار نے فوجی خدمت کے صلے میں کرشنا کو زمین الاٹ کی۔ اس نے ناگ پور میں زمینیں حاصل کیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بمبئی میں میری دھندا کرانے والی ماں کے حوالے سے کوئی مجھے پہچانے۔

ہم نے نئی جگہ زندگی کا آغاز کیا۔ کرشنا نے یہ خوبصورت کوٹھی بنائی۔ میں نے پوچھا۔ "تمہارے پاس اتنی دولت کہاں سے آگئی ہے؟"

وہ بولا۔ "میری پشت پر کمیونسٹ پارٹی ہے ذرا دیس آزاد ہونے دو۔ پھر دیکھو ہمارا شمار

حکمران طبقے میں ہوا کرے گا۔"

ایک برس بعد میں نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ زچگی کا کیس بگڑ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ میں آئندہ ماں نہیں بن سکوں گی۔ میں نے کرشنا سے کہا۔ "تم نے میڈیکل رپورٹ سن لی اب میں کبھی ماں نہیں بن سکوں گی۔ تم میری ایک خواہش پوری کردو۔"

"بولو کیا چاہتی ہو؟"

"بیٹے کا نام میری پسند سے ہوگا۔"

وہ ہنس کر بولا۔ "اچھا تو ہندوانہ نام رکھوگی؟"

"ہاں اپنے دھرم کے مطابق اس کا نام دھرم چند ہوگا۔"

"نام سے کچھ نہیں ہوتا میں نے بھی اپنا نام تبدیل نہیں کیا کیونکہ یہ نام تمہارے بدن پر آبلوں سے لکھا ہے میں تمہاری اس محبت کے صلے میں جو بھی دوں وہ کم ہے۔"

میرا خیال تھا میرا دودھ پینے والا میری گود میں پرورش پانے والا میرے ہی دھرم سے متاثر رہے گا لیکن وہ عمر کے منزلیں طے کرتا ہوا باپ کے نقش قدم پر چلنے لگا۔ کیمونسٹ پارٹی کے لیڈر کامریڈ اگروال تھے۔ دھرم چند ان کا شاگرد تھا۔ اپنے استاد سے ایسی عقیدت تھی کہ اس نے اپنے نام کے ساتھ اگروال کا اضافہ کرلیا اور اب دھرم چند اگروال کہلانے لگا ہے۔

میرا بیٹا بہت تعلیم یافتہ اور ذہین ہے اس نے سیاست کے میدان میں بڑی مشکلات کا سامنا کیا ہے وہ کئی بار جیل گیا جب بھی واپس آیا تو پہلے سے زیادہ شہرت حاصل کی کرشنا اور کامریڈ اگروال نے اسے فولاد بنا دیا تھا۔

تین برس پہلے میرے بیٹے نے الیکشن میں کامیابی حاصل کی۔ آج وہ ایم ایل اے ہے۔ میرا کرشنا یہ خوشیاں دیکھنے کے لیے اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اس نے موت سے پہلے وصیت کی تھی کہ اس کی چتا نہ جلائی جائے اس کے باپ دادا کی رسومات کے مطابق دفن کیا جائے۔ میرے بیٹے نے باپ کی ہدایات پر صرف عمل نہیں کیا بلکہ خود ابھی سے یہ وصیت لکھ دی ہے کہ اسے بھی باپ کی طرح دفن کیا جائے۔"

میرا جوگن بولتے بولتے خاموش ہوگئی۔ کمرے میں رکھی ہوئی بھگوان کی مورتی کو تکنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا میری بھتیجی سلمیٰ اس گھر میں بہو بن کر آنے کے لیے راضی تھی؟"

"پہلے راضی نہیں تھی میرے بیٹے کو ہندو سمجھ کر کتراتی تھی دھرم چند اس کا دیوانہ ہوگیا تھا آج بھی اسے پہلے دن کی طرح چاہتا ہے بالکل باپ پر گیا ہے کرشنا بھی مجھے آخری سانس تک چاہتا رہا۔

دھرم نے پریشان ہو کر مجھ سے کہا۔ "ماں جی! میں کیا کروں؟ وہ راضی نہیں ہو رہی

ہے۔"
میں نے کہا۔ "گورے گاؤں کے لوگ بھی راضی نہیں تھے مجھے تیرے باپ کے ساتھ جانے نہیں دیتے تھے مگر وہ میرا دیوانہ بستی والوں کو بندوق دکھا کر مجھے لے آیا۔"
میری بات ادھوری رہ گئی۔ فون کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کال سنی۔ پھر ریسیور رکھ کر بولا۔ "میں ایک بہت ضروری کام سے جارہا ہوں۔ پھر آکر بات کروں گا۔"
وہ چلا گیا۔ یہ سیاست بازی ایسی ہوتی ہے کہ آنے جانے اور کھانے پینے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ میرا دھرم کئی کئی دنوں تک گھر نہیں آتا تھا لیکن فون کے ذریعے اپنی خیریت کی اطلاع دیتا رہتا تھا۔ اس رات گیارہ بجے اس نے فون پر کہا "ماں جی! میں اپنے باپ کا بیٹا ہوں میں بھی بندوق دکھا کر سلمٰی کو لے آیا ہوں۔"
میں نے پریشان ہو کر پوچھا "کیا بک رہا ہے؟ کیا تو نے غنڈوں جیسی حرکت کی ہے؟"
"میں نے وہی کیا ہے جو ڈیڈی نے آپ کے ساتھ کیا تھا۔"
"گدھے کہیں کے جلدی بتا سلمٰی کہاں ہے؟"
"شہر کے باہر ہمارے فارم میں ہے"
"میں ابھی آرہی ہوں۔ خبردار! پرائی لڑکی کو ہاتھ نہ لگانا۔"
میں نے کوٹھی سے باہر آکر ڈرائیور کو آواز دی۔ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ہمارا ایک فارم شہر سے پچیس میل کے فاصلے پر ہے وہاں ہم نے ایک چھوٹا سا بنگلا بھی بنایا ہے وہاں پہنچ کر دھرم سے پوچھا "سلمٰی کہاں ہے؟"
اس نے اسے ایک کمرے میں بند کر رکھا تھا میرے حکم پر اس نے دروازے کے تالے کو کھولا۔ میں نے کمرے میں جاکر دیکھا سلمٰی ایک دیوار سے لگی بیٹھی تھی اور رو رہی تھی میں نے دھرم کے منہ پر ایک طمانچہ مارا تو وہ روتے روتے چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔
دھرم نے پوچھا۔ "تم مجھے کیوں مار رہی ہو؟"
میں نے کہا۔ "تو نے میری پوری بات نہیں سنی تھی۔ تیرا باپ بستی والوں کو بندوق دکھا کر مجھے لایا تھا اور تو لڑکی کو بندوق دکھا کر لایا ہے۔ میں تیرے باپ کے ساتھ راضی تھی یہ تیرے ساتھ راضی نہیں ہے پھر تو نے اسے ہاتھ کیوں لگایا؟"
"ماں جی! آپ کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ ابھی تک اسے ہاتھ نہیں لگایا ہے میں ایک ایم ایل اے ہو کر ایسی حرکت کیسے کرسکتا ہوں میرے آدمی اسے اٹھا کر لائے ہیں۔"
میں نے اسے دوسرا طمانچہ مار کر کہا۔ "تو جسے دھرم پتنی بنانا چاہتا ہے اسے تیرے آدمیوں نے ہاتھ لگایا تجھے شرم نہیں آئی۔ جا کہیں جاکے ڈوب مر۔"
اس نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ میں نے کہا "میں نے اپنے اور تیرے باپ کے

بارے میں اس لیے بتایا تھا کہ تیرے اندر حوصلہ پیدا ہو اور پہلے تو اسے راضی کرے یا اسے مجھ سے ملائے تاکہ میں اسے سمجھا سکوں۔"
سلمٰی نے کہا۔ "میں جان دے دوں گی مگر ایک ہندو سے شادی کے لیے راضی نہیں ہوں گی۔ مجھے مار ڈالو یا زہر لاکر دو۔ میں رسوائیاں اٹھانے کے لیے واپس نہیں جاؤں گی۔"
"کوئی تمہیں بدنام نہیں کرے گا تمہاری عزت محفوظ ہے۔"
"مگر کوئی میری پارسائی کا یقین نہیں کرے گا۔ میرا باپ اتنا غیرت مند ہے کہ اب میری صورت نہیں دیکھے گا۔"
دھرم نے بتایا کہ اسے شام چھ بجے اغوا کیا گیا تھا اور اب آدھی رات گزر چکی تھی۔ بدنامی کا داغ اس پر لگ چکا تھا۔
میں نے کہا۔ سلمٰی! میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ تمہارے ماں باپ کو سمجھاؤں گی کہ ایسا غلطی سے ہوا ہے۔"
وہ بولی۔ "میرے گھر اور میرے محلے والے سمجھیں گے کہ آپ ... بیٹے کی غلطی اور بے حیائی چھپانے کے لیے جھوٹ بول رہی ہیں۔"
"تو پھر میں تمہیں بہو بناکر تمہارے میکے لے جاؤں گی۔"
"میں اپنے گھر سے اپنے میکے سے جدا ہوسکتی ہوں اپنے مذہب سے کبھی الگ نہیں ہوسکتی تم ماں بیٹے زبردستی کروگے تو میں خودکشی کرلوں گی۔"
میں نے اس کے پاس آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ہم زبردستی نہیں کریں گے۔ تم دیکھ رہی ہو کہ میں تمہیں گھر پہنچانا چاہتی ہوں۔ میرا بیٹا بھی شرمندہ ہے۔ آرام سے بیٹھو اور میری باتیں سنو۔"
میں نے اس کا بازو تھام کر اسے ایک چارپائی پر بٹھایا پھر اس کے پاس بیٹھ کر بولی۔ "میں ہندو ہوں مگر میرا بیٹا ہندو ہے نہ سکھ ہے نہ مسلمان نہ عیسائی یہ کمیونسٹ ہے ناستک یعنی بے دین ہے۔"
وہ بولی۔ "تو میں کیا کروں؟ آپ کا بیٹا کچھ بھی ہو مجھے آپ لوگوں سے کیا لینا ہے؟"
"بیٹی! غصہ تھوک کر ٹھنڈے دماغ سے سوچو یہ ہندو نہیں ہے تمہیں دل و جان سے چاہتا ہے۔"
"آپ اتنی باتیں کیوں بنا رہی ہیں؟ کیا میں نادان ہوں اتنا نہیں سمجھتی کہ ہندو ماں کا بیٹا ہندو ہی ہوگا۔"
"تم واقعی نادان ہو۔ اولاد کو ماں سے نہیں باپ سے پہچانا جاتا ہے یہ مسلمان باپ کا بیٹا ہے۔"
سلمٰی نے سوالیہ نظروں سے دھرم کو دیکھا۔ وہ بولا۔ "میری ماں جی کبھی جھوٹ نہیں

بولتی ہیں۔ میرے ڈیڈی میرے دادا اور پردادا سب ہی مسلمان تھے۔"

وہ بولی۔ "آپ کیا ہیں؟ آپ دین سے کیوں نکل گئے؟ کیا تکلیف تھی آپ کو مسلمان بن کر رہنے میں؟"

"بیٹی! تم نے یہ بہت اچھا سوال کیا۔ کوئی ایک مذہب اختیار کرکے رہنے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی ہے۔ میں نے اس لادین بیٹے کو کئی بار سمجھایا ہے کہ خدایا بھگوان کو مان لو۔ اگر خدا نہیں ہے تو اسے مان لینے سے تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوگا اور اگر خدا ہے تو اس کے آگے سرجھکاتے رہنے سے جہنم کی آگ سے محفوظ رہوگے۔"

وہ بولا۔ "ماں جی! میں نہ تو ادھر کا رہا ہوں نہ ادھر کا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو یہ سوچ کر الجھتا رہا کہ ہندو بنوں گا تو میرے باپ دادا کی یہ نسل ایک دھرم میں جاکر ختم ہو جائے گی اور اگر مسلمان کہلاؤں گا تو ماں کو دکھ پہنچے گا کہ میں نے اس کے دودھ کا قرض نہیں چکایا ہے آخرکار میں نے ناستک بن کر ہندو مسلمان ہونے کا جھگڑا ہی ختم کردیا ہے۔"

سلمٰی نے کہا۔ "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ آپ کی ایک آنکھ کے صرف ماں کو دیکھو اور دوسری آنکھ کے صرف باپ کو دیکھو تو آپ اس جھگڑے سے پریشان ہوکر اپنی آنکھیں ہی پھوڑلیں نہ ماں کے رہیں نہ باپ کے یہ کون سی دانشمندی ہے؟"

یہ بات میرے بیٹے کے دل کو لگی۔ اس نے تسلیم کیا جب اس نے باپ کو نہیں چھوڑا ماں سے منہ نہیں پھیرا تو مذہب سے کیوں پھر گیا ہے؟

وہ پریشان ہوکر بڑی دیر تک ٹہلتا رہا۔ میں سلمٰی کو لے کر دوسرے کمرے میں آکر بولی۔ "تم اس کے دل میں سمائی ہوئی ہو۔ اس لیے اس کے دل پر اثر کر رہی ہو۔ اسے تنہائی میں سوچنے اور الجھنے دو یہ الجھتے الجھتے سلجھ جائے گا جدائی میں ماں سے زیادہ محبوبہ کی باتیں متاثر کرتی ہیں۔"

ہماری وہ رات بحث مباحثہ میں کٹ گئی۔ صبح میں نے اپنے ایک بوڑھے نوکر کو سلمٰی کے والدین کے پاس بھیجا' حالانکہ مجھے خود جانا چاہئے تھا لیکن میرے بیٹے نے اسے اغوا کرایا تھا میں اس بات سے شرمندہ ہوکر نہیں گئی۔

سلمٰی کے باپ نے بوڑھے ملازم سے کہا۔ "اگر بیٹی چپ چاپ گم ہوجاتی تو ہم یہ کہہ کر پردہ ڈال دیتے کہ وہ اپنے گاؤں نانی کے گھر رہنے کے لیے گئی ہے لیکن غنڈوں نے اسے بھرے بازار سے اغوا کیا ہے اب تک اس کے متعلق اتنی شرمناک کہانیاں گھڑلی گئی ہوں گی کہ وہ واپس آئے گی تو میں شرم سے مرجاؤں گا۔"

وہاں سلمٰی کے دادا اور دوسرے بزرگ تھے وہ کہہ رہے تھے کہ سلمٰی کو گھر نہ لایا جائے اس کے ننھیال لے جاکر کسی بھی ایرے غیرے سے اس کی شادی کردی جائے لیکن زینت بیگم اپنی تعلیم یافتہ بیٹی کو کسی جاہل گنوار کے پلے نہیں باندھنا چاہتی تھیں۔ وہ بیٹی

سے ملنے آئیں۔ مجھ سے بھی ملاقات ہوئی۔ میں نے انہیں دھرم کا خاندانی پس منظر سمجھایا تو وہ بولیں۔ "یہ مسلمانوں کا خاندان ہے میں مطمئن ہوں۔"

سلمٰی نے کہا۔ "میں مطمئن نہیں ہوں۔ میں صرف خدا کی وحدانیت کا کلمہ پڑھنے والے سے شادی کروں گی۔"

میں نے بیٹے سے کہا۔ "لڑکی کا مطالبہ درست ہے اگر تم اسے دل و جان سے چاہتے ہو تو سب سے پہلے اس کی عزت کے لیے سوچو اور احساس کرو کہ تم نے اسے بدنام کیا ہے۔ پھر یہ سمجھو کہ جو اپنے محبوب کے خدا کو نہیں مانتا وہ محبوب کو کیا مانے گا۔ سلمٰی سے صرف جذباتی لگاؤ ہے تو منکر مذہب رہو دلی لگاؤ ہے تو ابھی کلمہ پڑھو مجھے دلی لگاؤ تھا تب ہی میں نے تمہارے مسلمان باپ کو قبول کیا تھا۔ اپنے دل میں جھانک کر دیکھو اور آخری فیصلہ کرو۔"

دھرم نے کہا۔ "مجھے کلمہ پڑھنے سے انکار نہیں ہے لیکن میری سیاسی مجبوریاں ہیں۔ ابھی میں کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر ہوں۔ اس لیے کوئی میرے دین دھرم کی بات نہیں چھیڑتا ہے میں مسلمان ہونے کا اعلان کروں گا تو پارٹی اپنی پوزیشن کمزور نہیں ہونے دے گی۔ یہ سب جانتے ہیں کہ اس دیس میں کوئی مسلمان لیڈر ایسی اونچی پوزیشن حاصل نہیں کرسکتا جو میں حاصل کرچکا ہوں میں کمیونسٹ بن کر اس دیس میں کوئی وزارت حاصل کرسکتا ہوں لیکن مسلمان بن کر اسمبلی میں ایک سیٹ حاصل نہیں کرسکوں گا۔"

یہ ایسی حقیقت ہے جسے بھارت کے تمام مسلمان اچھی طرح جانتے ہیں زینت بیگم نے تسلیم کیا۔ "درست کہتے ہو تم مسلمان بن کر منظر عام پر آؤ گے تو تمہارا سیاسی کیریئر ختم ہوجائے گا۔"

ہم بڑی دیر تک اس موضوع پر بحث کرتے رہے پھر یہ طے پایا کہ اس کا نام دھرم چند اگروال ہی رہے گا گھر میں نام بدل دیا جائے گا۔ نام سے کوئی فرق نہیں پڑتا کام اور عمل دیکھا جاتا ہے اسی شام میرے بیٹے نے غسل کیا۔ زینت بیگم نے اسے وضو کرنا سکھایا پھر کلمہ پڑھایا حالانکہ وہ بنیادی طور پر مسلمان تھا تاہم اس نے پہلی بار کلمہ پڑھا۔ ایک قاضی صاحب آئے انہوں نے بڑی رازداری سے نکاح پڑھادیا۔

میرے بیٹے کی سیاسی پوزیشن کو مضبوط تر بنائے رکھنا ہم سب کا فرض ہے اس لیے سلمٰی اور زینت بیگم نے قسم کھائی کہ وہ اپنے سگے رشتے داروں کے سامنے بھی دھرم چند کو مسلمان نہیں کیمونسٹ کہا کریں گی۔"

میں نے میرا جوگن کی زبان سے یہ ساری باتیں سننے کے بعد کہا۔ "تم ہندو ہو' تمہارا بیٹا نام کا ہندو کام کا کمیونسٹ اور ذات کا مسلمان بن کر بھارت سرکار کو دھوکا دے رہا ہے گویا تم بیٹے کے ذریعے اپنے ملک کو نقصان پہنچا رہی ہو؟"

"میرے بیٹے نے آج تک سرکار کو کوئی سیاسی دھوکہ نہیں دیا ہے بھارت پاکستان کو ہمیشہ سے اپنا بدترین دشمن سمجھتا ہے۔ میرے بیٹے نے پاکستان کی کبھی حمایت نہیں کی۔ اس نے ایک مسلمان لڑکی سے شادی کی لیکن کسی پاکستانی کو اپنا رشتے دار نہیں بنایا۔ پاکستان یوں بھی روس نواز نہیں ہے اور نہ ہی وہاں کوئی کمیونسٹ پارٹی ہے۔ اس لیے کسی پاکستانی سیاست داں سے میرے بیٹے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"لیکن دیس بھگتی کا تقاضا ہے کہ سرکار سے اپنی اصلیت نہ چھپائی جائے۔"

"پورے بھارت میں ایسا کون سیاستداں ہے جو اپنی اصلیت نہیں چھپاتا؟ ہر نیتا کے منہ میں کچھ ہوتا ہے اور دل میں کچھ۔ کوئی درپردہ روس کا چمچہ ہے کوئی اسرائیل کا دلال ہے اور کوئی امریکہ کا ایجنٹ ہے یہ سب وزارتوں کا حلف اٹھانے کے وقت قسمیں کھاتے ہیں کہ کسی بھی ملک کی دلالی نہیں کریں گے لیکن یہ کرتے ہیں سیاست کا مفہوم یہ ہے کہ جھوٹ اور چالبازی سے اس حد تک دھن دولت اور اقتدار حاصل کرو کہ اپنا یہ دیس قائم رہے یہ قائم رہے گا تو آئندہ بھی لوٹ کھسوٹ کے مواقع حاصل ہوتے رہیں گے۔

میرے بیٹے کو کوئی الزام نہیں دے سکتا وہ ملک کی پالیسیوں کے مطابق سیاست کر رہا ہے اس نے صرف ایک ہی بات چھپائی ہے کہ وہ عبدالرحیم کا پوتا ہے یہ ایک مجبوری ہے کسی کو سیدھے دروازے سے آنے سے روکا جائے گا تو وہ چور دروازے سے آئے گا۔"

بھائی عظیم الدین خاموش ہوگئے فجر کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ انہوں نے کہا۔

"جلّ جلالہٗ وجلّ شانہٗ لو میاں! داستان سناتے سناتے صبح ہوگئی۔ آؤ نماز پڑھ آئیں۔ پھر نیند پوری کریں گے۔"

ہم نے مسجد میں جاکر نماز ادا کی پھر گھر آکر سوگئے۔ عظیم بھائی نے سلمیٰ کی جو روداد سنائی تھی وہ سترہ برس پہلے کی تھی یعنی وہ انیس سو پینتالیس میں پہلی بار میرا جوگن سے ملے تھے دوسری بار انیس سو پچھتر میں اس سے ملاقات ہوئی اور اب انیس سو ترانوے میں یہ داستان مجھے سنائی تھی۔

میں نے دوسرے دن عظیم بھائی سے کہا "میں واپسی میں ایک دن کے لیے ناگ پور جاؤں گا اور سلمیٰ سے ملاقات کروں گا۔"

وہ بولے۔ "میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں فوراً پاکستان چلے جاؤ جب سے بابری مسجد کو شہید کیا گیا ہے ہندو اور مسلمانوں میں کشیدگی بڑھ رہی ہے۔ کرائم برانچ کے جاسوس پاکستان سے آنے والوں کو پریشان کر رہے ہیں ان کا سختی سے محاسبہ کیا جارہا ہے ان کے سامان کی چیکنگ اس لیے ہوتی ہے کہ وہ کہیں شہید کی جانے والی مسجد کی تصاویر اور کوئی دستاویز تو نہیں لے جارہے ہیں؟"

میں نے پوچھا۔ "یہاں سے ایسا مواد لیجانے میں کیا اعتراض ہے؟ ساری دنیا کے

اخبارات نے یہ تصاویر اور خبریں شائع کی ہیں۔ تمام ممالک کے ٹیلیویژن نے مسجد کو شہید کرتے دکھایا ہے۔ دنیا کے تمام لوگوں نے ہندو قوم کا یہ مذہبی جرم دیکھا ہے اب چھپانے کے لیے کیا رہ گیا ہے؟ ہم پاکستانیوں کی تلاشیاں کیوں لی جاتی ہیں؟"

"ان سیاسی سوالات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔"

میں نے یہی مناسب سمجھا کہ واقعی فوراً واپس چلا جاؤں۔ اس رات تمام رشتے داروں سے رخصت ہوکر میں ٹرین میں سوار ہوا۔ اسٹیشن کے بک اسٹال سے ایک اخبار خرید لیا۔ اسے کھول کر پڑھا تو ایک دردناک خبر پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ خبر یہ تھی کہ دیویا بھارتی نے اپنے فلیٹ کی بالکونی سے چھلانگ لگا کر خود کشی کرلی۔

دیویا سے میرا دور کا بھی تعلق نہیں تھا مگر میں جانتا ہوں جب یہ خبر پاکستان پہنچی ہوگی تو میری طرح وہاں کے لاکھوں فلم بین سوگوار ہوں گے دیویا اگرچہ ہندو تھی لیکن اس سے ہمارے مذہبی جذبات وابستہ تھے کیونکہ وہ ایک مسلمان کی بیوی تھی۔ وہ اسکرین پر اتنی خوبصورت اور اتنی معصوم نظر آتی تھی کہ سیدھی دل میں سما جاتی تھی۔ میں نے اس کے متعلق بہت کچھ پڑھا تھا وہ بہت ہی خوشحال زندگی گزار رہی تھی۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اس نے خودکشی کیوں کی ہے؟

میرے ساتھ ایک ہندو مسافر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے اخبار مانگا اور اپنا اخبار مجھے پڑھنے کو دیا اس دوسرے اخبار میں دیویا بھارتی کی موت پر تبصرہ کیا گیا تھا اور لکھا گیا تھا کہ پچھلے کئی دنوں سے دیویا کو فون موصول ہو رہے تھے اسے دھمکیاں دی جاتی تھیں اور کہا جاتا تھا کہ اس نے مسلمان سے طلاق نہ لی اسے نہ چھوڑا تو اس سے دنیا چھڑا دی جائے گی۔

یہ بھارت کے مشہور فلمی صحافی نے لکھا تھا۔ وہ دیویا کے بہت قریب رہ چکا تھا دیویا نے کئی فلم سازوں کو فون پر ملنے والی دھمکیوں کے متعلق بتایا تھا۔ بمبئی کی فلم انڈسٹری میں متعصب ہندوؤں کی اکثریت ہے وہاں کے مشہور غنڈے بال ٹھاکرے کے سامنے پولیس دم نہیں مارتی جہاں سے وہ گزرتا ہے وہاں سے پولیس والے ڈیوٹی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

اس اخبار میں بال ٹھاکرے پر شبہ کیا گیا تھا دیویا کی موت کو خودکشی نہیں قتل قرار دیا گیا تھا۔ یہ شبہ تھا کہ اس نے بالکونی سے چھلانگ نہیں لگائی تھی اسے غنڈوں نے بلندی سے اٹھا کر نیچے پھینک دیا تھا اور اب اس مرڈر کیس پر اسی طرح مٹی ڈالی جائے گی جیسے بال ٹھاکرے کے دوسرے جرائم پر ڈالی جاتی ہے۔

میں دوسری صبح ناگ پور پہنچا یوسف بھائی نے بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا وہاں بھی میں نے جوان بچوں کو دیویا بھارتی کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے سنا۔ میں نے غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر ناشتے کے دوران کہا میں کوشش کروں گا کہ مجھے آج ہی کی فلائٹ

میں جگہ مل جائے یہاں کے حالات اچھے نہیں ہیں۔

زینت بھابی نے کہا "ہمیں شرمندگی ہے ایسے حالات میں تمہیں کچھ روز رکنے کے لیے بھی نہیں کہہ سکتے۔"

یوسف بھائی کے بڑے بیٹے نے کہا "چچا جان! آپ یہاں سے بمبئی پھر بمبئی سے کراچی جائیں گے۔ بمبئی میں بڑے فسادات ہو رہے ہیں۔ اس لیے آپ وہاں طیارے میں ہی رہیں یا پھر ایئرپورٹ سے باہر نہ جائیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ تم بھارتی مسلمانوں کا حوصلہ ہے کہ پینتالیس برس سے متعصب ہندوؤں کی لگائی ہوئی آگ میں جلتے رہتے ہو۔ ان کے بچھائے ہوئے کانٹوں کے بستر پر سوتے ہو۔ پھر بھی پانچوں وقت کی اذانوں کا گلا کسی کو گھونٹنے نہیں دیتے ہندوؤں کو غصہ ہے کہ پاکستان وجود میں کیوں آیا؟ یہ غصہ وہ پاکستان پر نہیں اتار سکتے بھارت کے نہتے مسلمانوں پر اتارتے ہیں۔ آفریں ہے تم لوگوں پر تم سب نے متعصب ہندوؤں کے ترشول (نیزوں) پر اسلام کو زندہ رکھا ہے۔"

اب سے کچھ عرصہ پہلے مشہور اداکارہ شرمیلا ٹیگور نے ایک مسلمان کرکٹر سے شادی کی تھی۔ ہندوؤں نے اس کی یہ سزا دی کہ اس کی فلموں کا بائیکاٹ کیا۔ جس سینما میں اس کی فلم چلنے والی تھی اس سینما کو آگ لگا دی گئی۔ یوسف بھائی کی منجھلی بیٹی فوزیہ نے ایک اخبار میز پر پھینکتے ہوئے کہا "آج کی تازہ خبر یہ ہے کہ کٹر ہندوؤں کی جماعت نے فلم پروڈیوسر اور ڈسٹری بیوٹروں کو وارننگ دی ہے کہ وہ مسلمان اداکاروں کو اپنی فلموں میں کاسٹ نہ کریں اور ان کی جو فلمیں بن چکی ہیں انہیں ریلیز نہ کریں ورنہ سینما گھروں کو آگ لگا دی جائے گی۔"

میں نے اخبار دیکھا۔ جن مسلمان اداکاروں کی فلموں پر پابندیاں لگائی گئی تھیں ان میں عامر خان سلمان خان اور سنجے دت کے نام سرفہرست تھے اگرچہ سنجے دت ہندو باپ کا بیٹا ہے مگر اس کی ماں نرگس برائے نام مسلمان تھی اس لیے اس مسلمان ماں کے بیٹے پر بھی عذاب نازل ہوا تھا۔

میری سیٹ رات کی ایک فلائٹ میں کنفرم ہوگئی میں نے یوسف بھائی اور زینت بھابی سے کہا "آپ دونوں نے مجھ سے سلمیٰ کی باتیں چھپائیں لیکن مجھے اندر کی ایک ایک بات معلوم ہوگئی ہے میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

زینت بھابی نے کہا "میرے لیے یہ خوشی کی بات ہے کہ آپ میری بیٹی سے ملنا چاہتے ہیں لیکن آپ کا وہاں جانا مناسب نہیں ہے وہ سیاست سے تعلق رکھنے والا خاندان ہے انٹیلی جنس والوں سے یہ بات چھپی نہیں رہے گی کہ ایک پاکستانی ان سے ملنے جارہا ہے ہمارا داماد دھرم چند اگروال نہیں چاہتا کہ کسی پاکستانی سے اس کا رشتہ ظاہر ہو۔"

مجھے یہ سن کر دکھ ہوا میں ان کی مجبوریاں سمجھ رہا تھا۔ دراصل میں صرف سلمیٰ کو نہیں میرا جوگن کو بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ لوگ ہندوستان آکر تاج محل ضرور دیکھتے ہیں میں محبت کی انوکھی اور لازوال مثال قائم کرنے والی عورت کو ایک نظر دیکھنے کا آرزو مند تھا۔

میں نے کہا "بھابی! میں آپ لوگوں کی مجبوریاں سمجھ رہا ہوں۔ کوئی بات نہیں میرے لیے یہی خوشی کی بات ہے کہ سلمیٰ ایک مسلمان گھرانے میں ہے۔"

"جی ہاں۔ یہ سلمیٰ کی خوش نصیبی ہے لیکن ایک کی خوش نصیبی دیکھ کر دوسری تمام بدنصیب لڑکیوں کو نہیں بھولنا چاہیے نہ جانے سلمیٰ کی طرح کتنی مسلمان لڑکیاں اغوا کی جاتی ہیں کتنے ہی شہروں اور گھروں میں اسلامی غیرت کو ٹھیس پہنچتی ہے اس کا کوئی حساب نہیں ہے آپ پاکستانی لوگ صرف بابری مسجد کے توڑے جانے سے جوش میں آتے ہیں۔"

میں نے کہا "بھابی! مسجد کے لیے توڑنے کا لفظ استعمال نہیں ہوتا ہے یوں کہیں کہ مسجد شہید کی گئی کیونکہ مسجد مقدس ہے محترم ہے۔"

"تو پھر عورت کو پہلے محترم کہا جائے کیونکہ یہ مسجد بنانے والے پیدا کرتی ہے۔"

آپ لوگ یہاں سے جاتے وقت نظریہ پاکستان لے گئے۔ بابری مسجد چھوڑ گئے۔

کلام پاک ادھر لے گئے غلط تلفظ ادھر چھوڑ گئے۔

کلمہ اُدھر لے گئے سلمیٰ کو یہاں چھوڑ دیا۔

آپ صرف یہ کیوں دیکھتے ہیں کہ ایک بابری مسجد توڑی گئی تو رام مندر بنا۔ یہ حساب کیوں نہیں کرتے کہ شہر شہر گھر گھر سلمیٰ ٹوٹتی ہے تو ہر سلمیٰ کے بطن سے ہندو نسل پیدا ہوتی ہے۔"

میرا سر جھک گیا میری سمجھ میں آیا کہ ہمارے اندر غیرت بے شک ہے لیکن غیرت کا وسیع تر احساس ابھی پیدا نہیں ہوا ہے۔

میں روانگی کے لیے اپنا سامان آنگن میں لاکر رکھ رہا تھا تب دروازے کے باہر ایک گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ میں سمجھا میرا بھتیجا ائرپورٹ جانے کے لیے ٹیکسی لایا ہے ذرا دیر بعد آنگن کا باہر والا دروازہ کھلا اور میں چونک گیا میں نے آنے والی خاتون کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا مگر گیروے رنگ کی ساڑی نے کہہ دیا کہ پاکستان جانے سے پہلے میری ایک بہت بڑی آرزو پوری ہو رہی ہے اور میں محبت کا چلتا پھرتا تاج محل دیکھ رہا ہوں۔

وہ ہاتھی دانت کے دستے کی چھڑی ٹیکتی ہوئی آنگن میں آئی۔ زینت بھابی دونوں بازو پھیلائے اس کی طرف بڑھتی ہوئی بولیں۔ "ارے میرا بہن! اچانک کیسے آگئیں؟ خیریت تو ہے؟"

وہ دونوں آپس میں بول رہی تھیں میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میرا جوگن کو دیکھ رہا تھا میری شدید خواہش تھی کہ میں اس کے بدن پر آبلوں سے لکھے ہوئے کرشنا کے نام کو

پڑھوں۔

میری اس خواہش میں میرا اور کرشنا کے لیے احترام تھا پھر بھی یہ خواہش خلاف تہذیب تھی۔

ان لحات میں یہ آگہی ملی کہ میرے سامنے رام مندر کھڑا ہے۔

اس مندر کے بدن پر مسلمان کرشنا کا نام کندہ ہے۔

اس مندر کے بطن سے مسلمان دھرم چند پیدا ہوا ہے۔

تواریخ کی جو دھیا بائی ایک مندر تھی جس نے شہزادہ سلیم کو جنم دیا شرمیلا ٹیگور اور دیویا بھارتی جیسے بے شمار پیار کے مندر ہیں جنھوں نے مسلمانوں کی نسل کو آگے بڑھایا ہے۔

مجھے آگہی ملی کہ ہندوستان کی مٹی میں بابری مسجد کی بنیاد اتنی مضبوط ہے کہ اس مسجد کی صرف دیواریں گرائی جاسکتی ہیں اس کی بنیاد کوئی ہلا نہیں سکتا وہاں ایک رام مندر بنے گا تو سینکڑوں رام مندروں سے بابری مسجدیں پیدا ہوتی رہیں گی۔

میں میرا جوگن کو دیکھ رہا تھا زینت بھابی ہمیں ایک دوسرے سے متعارف کرا رہی تھیں میں نے آگے بڑھ کر اس کے رو برو آکر کہا "پیار کے اس مندر کو میرا سلام..."

شجرہ
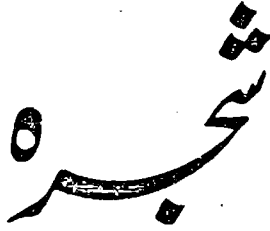
جو شجر زیادہ پھل دیتا ہے

اسے زیادہ پتھر مارے جاتے ہیں۔

جو عورت اولاد کا پھل نہ دے

اسے زیادہ طعنے مارے جاتے ہیں۔

مرد چاہتا ہے اس کا خاندانی شجرہ پھلتا پھولتا جائے۔

لیکن ببول کے کانٹوں میں گلاب نہیں کھلتا۔

اپنے خاندان کا شجرہ بنانے والو!

دیکھو، تمھاری عورت نے کیا کرشمہ دکھایا ہے۔

ببول کے کانٹوں میں گلاب کھلایا ہے۔

راہ داری کے ایک سرے پر ماں کا کمرا تھا۔ دوسرے سرے پر بیوی کا کمرا اور وہ دونوں کے درمیان کھڑا ہوا تھا۔

اس کو کہتے ہیں دو کشتیوں میں پاؤں رکھنا اور دونوں کے درمیان ڈوب مرنا۔ ماں نے اپنی کمرے کے دروازے پر سے دھمکی دی "اگر اس کلموہی کے پاس جائے گا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔"

بیوی نے اپنے کمرے کی دہلیز پر سے کہا "دودھ پینے کی عمر ہو تو بچہ ماں کی گود میں جاتا ہے تم تو دروازہ کھول کر بیٹے کو بلا رہی ہو۔ میں دروازہ بند کر کے تماشا دکھاتی ہوں اُدھر جاتا ہے دیکھو یا ادھر پروانہ آتا ہے؟"

یہ کہتے ہی بہو نے ایک زوردار آواز سے اپنے کمرے کے دروازے کو بند کر لیا۔ یہ نفسیاتی حملہ تھا۔ مرد سے کوئی بات منوانا ہو تو ادائیں دکھاؤ' نہ مانے تو سامنے آ کر چھپ جاؤ دروازہ بند کر کے شجر ممنوعہ بن جاؤ تو فطری اور نفسی تقاضوں کے مطابق وہ گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

وہ تیزی سے چلتا ہوا بند دروازے کی طرف جانے لگا تو رخ بیوی کی طرف ہو گیا اور پشت ماں کی طرف۔ ایسے میں ماں کی پکار دور ہوتی چلی گئی۔

اس نے بند دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا "دروازہ کھولو۔"

اندر سے آواز آئی۔ "نہیں کھولوں گی۔"

عورت جب پہلی بار دلہن بن کر آتی ہے تو کمرے کا دروازہ کھلا رکھتی ہے۔ مرد فاتح کی شان سے اندر آتا ہے۔ وہ پہلی رات کا سکندر ہوتا ہے۔ اس کے بعد دروازہ عورت کی مرضی سے کھلتا ہے اور عورت کی ضد سے بند ہوتا ہے اور بند دروازہ کہتا ہے آؤ سکندر اعظم! ماں کا دودھ پیا ہے تو دروازہ کھول کر دکھاؤ۔

اس نے راہ داری کے آخری سرے پر ماں کو دیکھا وہ کہہ رہی تھی۔ "غلاظت کی اس پوٹ کو خاندان سے باہر پھینک دے۔"

وہ بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔ ماں اچھی باتیں سمجھاتی ہے۔ منہ میں مچھلی کا کانٹا آئے تو نگلنا نہیں چاہیئے۔ تھوک دینا چاہیئے۔

اس خاندان کے لوگ بڑے نفاست پسند تھے ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے لیکن یہ ناقابل تردید سچائی ہے کہ آدمی چار دن کا بھوکا ہو اور کھانے میں مکھی گر جائے تو نفاست پسندی کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔ آنکھوں دیکھی مکھی نگلی نہیں جاتی۔ اس لیے مکھی پھینک دیتے ہیں کھانا نہیں پھینکتے۔

وہ اسے پھینکنا نہیں چاہتا تھا بند دروازے پر دستک دیتے ہوئے بولا "پلیز دروازہ کھولو۔"

اندر سے آواز آئی "پہلے کھڑکی سے بات کرو۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا کھڑکی کے پاس آیا۔ اندر سے کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا ہوا تھا۔ کمرے کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا چھت سے پنکھا لٹک رہا تھا پنکھے سے رسی لٹک رہی تھی اور رسی کے نچلے سرے پر پھندا بنا ہوا تھا۔

پھندا ابھی خالی تھا اس میں بیوی کی گردن آنے والی تھی وہ لٹکنے والے پھندے کے نیچے ایک کرسی رکھ رہی تھی۔ وہ تڑپ کر بولا۔ "یہ کیا حماقت ہے وہاں سے کرسی ہٹاؤ دروازہ کھولو۔"

وہ بولی "یہ قصہ ختم ہو جانا چاہیے۔ میں مر جاؤں تو میرے بچوں کو کسی فلاحی ادارے میں بھیج دینا۔"

اس نے عاجزی سے کہا۔ "بچے یہ تماشا دیکھیں گے تو ہمارے متعلق کیا رائے قائم کریں گے؟"

"یہ تم سوچو کہ بچے کیا کہیں گے اور دنیا کیا کہے گی؟"

دنیا ہمیں کچھ نہیں دیتی آدمی اس سے بہ زور بازو اور بہ زور ذہانت چھین کر اپنا مان مرتبہ بڑھاتا ہے۔ دنیا خود کچھ نہیں دیتی مگر عزت اور ذلت کا حساب ضرور لیتی ہے وہ عزت دولت اور شہرت کی جس بلندی پر تھا وہاں سے نیچے گرنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ نیچے نہ گرنے کی بات سوچ رہا تھا اور اس کی بیوی کرسی پر چڑھ گئی تھی پھندا ایک ایسی اونچی جگہ ہوتا ہے جہاں سے کرسی کو لات مار کر گرانے کے باوجود گرانے والا نیچے نہیں گرتا۔ موت کے بعد بھی بلندی پر لٹکتا رہتا ہے۔

وہ پھندے کو اپنی گردن میں ڈالتے ہوئے بولی "میں نے ایسی موت کا انتخاب کیا ہے کہ مرنے کے بعد بھی نہیں گروں گی لیکن تم اپنے مقام سے گر جاؤ گے۔"

وہ پھندے کو اپنی گردن میں کستے ہوئے بولی "یہ فیصلے کی آخری گھڑی ہے۔ بولو میں کرسی کو لات ماروں یا تم اپنی ماں کو ٹھوکر مارو گے؟"

اس کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی وہ ایک ساعت کے لیے سانس لینا بھول گیا۔ وہ فیصلے کا آخری لمحہ تھا اس نے سر گھما کر بند دروازے کو دیکھا وہ نہیں کھل سکتا تھا۔ اور کھل بھی سکتا تھا لیکن اس سے پہلے پچھلی زندگی کے دروازے کھلتے چلے گئے۔

شائستہ نے زندگی میں پہلی بار ایسی محل نما کوٹھی میں قدم رکھا تھا۔ جو قیمتی آرائشی سامان سے سجی ہوئی تھی۔ وہ کوٹھی اندر سے بہت بڑی تھی۔

وہ دادی ماں کا ہاتھ تھام کر ایک جھگی سے آئی تھی۔ اس لیے تالاب کی مچھلی کی طرح سمندر کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ وہاں بڑے سارے شاہانہ صوفے پر ایک داڑھی والے بزرگ اپنی بیگم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے آس پاس کے صوفوں پر دو نوجوان تھے۔ دادی ماں اس بڑے خاندان میں دائی ماں کہلاتی تھیں۔ وہ داڑھی والے بزرگ اور دونوں جوان بیٹے سب ہی دائی ماں کے ہاتھوں سے پیدا ہوئے تھے۔ بڑے گھروں کی بہوئیں منہگے میٹرنٹی ہومز میں بچے پیدا کرنے جاتی ہیں لیکن ولایت علی کے خاندان میں یہ عقیدہ راسخ ہوگیا تھا کہ دائی ماں کے تجربہ کار ہاتھوں سے بچے صحیح سلامت دنیا میں آتے ہیں۔

دائی ماں نے شائستہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر داڑھی والے بزرگ سے کہا "ولایت میاں! یہ میری پوتی ہے شائستہ۔"

ولایت علی نے کہا "ماشاءاللہ بہت پیاری بچی ہے۔"

چھوٹے صاحبزادے وکالت علی نے شائستہ کو نظر بھر کر دیکھا پھر دل میں کہا "بڑی بھرپور بچی ہے۔"

بڑے صاحبزادے صداقت نے سنجیدگی سے سوچا "ایک جوان لڑکی یہاں رہے گی تو دنیا والے کیا کہیں گے؟"

ولایت علی کی بیگم سعدیہ نے سوچا "میں سمجھ رہی تھی کہ غریب کی بچی ہے کالی پیلی ہوگی۔ گھر کا کام کرے گی اور کسی کونے میں پڑے گی۔ مگر یہ تو..."

بیگم سعدیہ کی سوچ مکمل ہونے سے پہلے ہی ولایت علی نے کہا۔ "دائی ماں ہم جو زبان دیتے ہیں اس پر جان دے کر بھی عمل کرتے ہیں ہمارے وعدہ کے مطابق تمہاری پوتی آج سے ہماری بیٹی ہے۔ یہ ہمارے خاندان کے ایک فرد کی طرح یہاں رہے گی تم تمام فکروں سے آزاد ہوجاؤ۔"

دائی ماں نے ہاتھ جوڑ کر کہا "ولایت میاں! تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ میں مرجاؤں گی تو میری پوتی یاد رکھے گی۔"

بیگم سعدیہ نے پوچھا "یہ کچھ پڑھنا لکھنا جانتی ہے؟"

"جی ہاں اول نمبر سے دس جماعتیں پاس کرچکی ہے۔"

وکالت نے پوچھا "دائی ماں! یہ منہ سے کیوں نہیں بولتی ہے؟"

وہ کیا بولتی؟ جب سے آئی تھی کوٹھی کی شاہانہ شان و شوکت دیکھ دیکھ کر دنیا کو بھول رہی تھی۔ جھگی کی تاریکیوں میں رہ کر روشنی کے خواب دیکھتی آئی تھی۔ ایک دم سے روشنی میں پہنچ کر آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔

ولایت نے بڑا سا حقہ گڑگڑایا پھر مسکرا کر کہا "شائستہ بیٹی! جن چیزوں کو تم حسرت سے دیکھ رہی ہو یہ آج سے تمہاری ہیں۔"

وہ حیران رہ گئی۔ یہ آج سے میری ہیں؟ یہ بڑے لوگوں کی سخاوت ہے یا محض رسمی فقرہ ہے؟

کسی نے اس کی ماں کو ایسے ہی سبز باغ دکھائے تھے ایسے ہی خوابوں اور خیالوں سے بہلاتا رہا تھا۔ دادی ماں نے شائستہ کی ماں کو سمجھایا کہ یہ دولتمند غریب لڑکیوں کو کھلونا سمجھتے ہیں لیکن وہ سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ جوانی میں کوئی نصیحت سنائی نہیں دیتی۔ سنائی دے تو سمجھ میں نہیں آتی۔ شائستہ کی ماں اپنے عاشق سے کہتی تھی شادی کرلو۔ وہ کہتا تھا محبت کرنے والے شادی نہیں کرتے۔ شادی کرنے سے محبت فنا ہوجاتی ہے۔"

دادی ماں نے بیٹی کو سمجھایا' کچھ منایا کچھ زبردستی کی اور اس کی شادی اپنے ہی طبقہ کے ایک مزدور سے کردی۔ یہ باتیں شائستہ کو ہوش سنبھالنے کے بعد معلوم ہوئیں کہ اس کی ماں کسی کی وفادار نہ رہ سکی۔ ساری زندگی ایک دولتمند اور ایک مزدور کے درمیان الجھتی رہی۔ نہ غریب شوہر کی ہوسکی اور نہ دولت والے کو حاصل کرسکی۔

ماں کی نادانی نے شائستہ کو سمجھا دیا تھا کہ لڑکیوں کو خواب تو دیکھنا چاہیے لیکن کھلی آنکھوں سے سبز باغ نہیں دیکھنا چاہیے اگر کوئی کہے کہ یہ دنیا تمہاری ہے تو اسے سخاوت سمجھو یا رسمی فقرہ مان لو۔ یقین تب کرو جب اپنی حکمت عملی سے دنیا جیت لو۔

شائستہ نے ولایت علی کے بڑے صاحبزادے صداقت کو دیکھا۔ صداقت نے کہا "کسی کی جوان بیٹی کو اپنے گھر میں رکھنا مناسب نہیں ہوتا لیکن ابا جان نے شائستہ کو بیٹی کہہ کر عزت دی۔ ہم بھی اسے اپنے گھر کی عزت اور غیرت سمجھیں گے۔"

دائی ماں نے خوش ہوکر کہا "ماشاءاللہ میرے بیٹے کا دل شاہوں جیسا ہے اور صورت شہزادوں جیسی ہے۔"

دائی ماں کی زبان سے صداقت کی تعریف سن کر بیگم سعدیہ کے تیور بدل گئے۔ وہ سوتیلا تھا۔ اس کی برتری برداشت نہیں ہوتی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئیں پھر اپنے بیٹے

وکالت سے بولیں "تم کسی شاہ کا خون نہیں ہو کہ شہزادے کہلاؤ۔ تم اپنے باپ ہی کی اولاد ہو۔ چلو یہاں سے۔"

صداقت کے چہرے پر پھٹکی آگئی۔ بیگم سعدیہ نے اس کی ماں پر کیچڑ اچھالی تھی۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر سوتیلے بھائی سے بولا "تمہارا نام وکالت ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی وکیل کی اولاد ہو۔ میرے ہی باپ کا خون ہو۔"

بیگم جاتے جاتے پلٹ کر بولیں۔ "میرے منہ نہ لگنا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

ولایت علی نے کہا "صداقت! کیا جوابا" ایسا کہنا ضروری تھا۔ تم تو بڑی سے بڑی بات پی جاتے ہو۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولا "جی ہاں میں بیگم امی کے جوتے بھی کھا سکتا ہوں مگر اپنی ماں کے خلاف ایک لفظ بھی برداشت نہیں کرسکتا۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا شائستہ کے سامنے سے گزر کر باہر چلا گیا۔ بیگم سعدیہ نے شوہر سے کہا "آپ نے اس کے ہاتھ میں کاروبار دے کر اسے خود سر بنا دیا ہے یہ سب سر چڑھانے کا نتیجہ ہے کہ یہ میرے بھی سر پر چڑھ کر بولنے لگا ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے بیگم! تم جانتی ہو یہ زیادہ بولتا نہیں ہے۔ آج تمہاری باتوں نے اسے بولنے پر مجبور کردیا تھا۔ اس کے بعد دیکھ لو کہ کیسے سر جھکا کر چلا گیا ہے۔"

"آپ اس کی حمایت میں ضرور بولیں گے۔ کبھی وکالت کے لیے بھی کچھ سوچتے اور کرتے ہیں؟"

"یہ لڑکا کاروبار سے دلچسپی لے گا تو میں اس کے لیے بھی کچھ کروں گا۔"

"ضرور دلچسپی لے گا کل ہی سے آپ کے ساتھ مل میں جائے گا اسے آپ مل کا ایک شعبہ دیں گے یہ صداقت کا محکوم بن کر وہاں کام نہیں سنبھالے گا۔"

وہ جانے لگیں وکالت بھی صوفے سے اٹھا اور شائستہ کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر ماں کے پیچھے چلا گیا۔

ولایت علی نے بیگم کے اس انداز پر دائی ماں کو بے بسی سے دیکھا پھر کہا "تم تو جانتی ہو یہ اپنے وکالت کے معاملے میں ایسی ہی جذباتی ہیں۔"

دائی ماں برسوں سے اس گھر کے ہر فرد کے مزاج کو سمجھتی تھی شائستہ نے پہلے ہی دن سمجھ لیا کہ بیگم سعدیہ کی چاپلوسی کرکے ہی وہاں قدم جمائے جاسکتے ہیں۔ ولایت علی مجازی خدا ہونے کے باوجود یوں بے بسی اور نرمی سے بولتے تھے جیسے لفظوں سے سجدے کر رہے ہوں۔

وکالت شوخ اور غیر سنجیدہ تھا کھل کر قہقہے لگاتا تھا ہمیشہ آؤٹنگ رائیڈنگ اور شاپنگ کی باتیں کرتا تھا اور یہ شائستہ کو اچھا لگتا تھا۔ اس نے پہلی بار اسے مہنگی شاپنگ کرائی اور اس کی کلائی پکڑی تو وہ کلائی چھڑا کر بولی "ابھی نہیں پہلے تمہارے گھر میں مجھے اپنی پوزیشن

معلوم کرنے دو۔"

"تم یہ دیکھو میرے دل میں تمہارا کیا مقام ہے۔"

"سوری پہلے میری جگہ اپنے گھر میں بناؤ دل کا معاملہ جوانی تک رہتا ہے اور گھر کی چھت بڑھاپے میں بھی سایہ دیتی ہے۔"

وہ وکالت سے ہنستی بولتی تھی مگر دل کو صداقت لگتا تھا۔ سامنے ہوتا تھا تو نگاہوں میں بھر جاتا تھا کوئی اور نظر نہیں آتا تھا۔ وہ انتظار کرتی تھی کہ کبھی وہ وکالت کی طرح اسے چھیڑے گا لیکن کاروبار میں مصروف رہنے والے کو چھیڑنے کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی اور وہ اس لیے مایوس نہیں ہوتی تھی کہ اس نے وکالت کو چانس میں یا التوا میں رکھا تھا۔ ناکامی کی صورت میں اس پر مہربان ہوسکتی تھی۔

وہ ہر بات اپنی دادی ماں کو بتا دیتی تھی۔ مگر یہ ایسا معاملہ تھا جسے چھپا رہی تھی لیکن بوڑھی تجربہ کار نگاہیں اسے تھالی کے بینگن کی طرح اِدھر کبھی اُدھر لڑھکتے دیکھ رہی تھیں اس نے ایک رات اسے سمجھایا۔ "بیٹی! ولایت علی سے میرا خون کا رشتہ نہیں ہے پھر بھی وہ ایک ماں کی طرح میری عزت کرتا ہے۔ خدا کے لیے میری عزت خاک میں نہ ملا۔"

"دادی ماں! میں کچھ بھی تو نہیں کر رہی ہوں۔"

"تیری ماں بھی یہی کہتی تھی اور بڑے آدمی کے پھیر میں آتی رہتی تھی۔ تو بھی یہی غلطی کر رہی ہے۔"

"زندگی رہی تو دیکھ لینا۔ میں ایسی غلطی نہیں کروں گی۔"

"زندگی اب نہیں رہی ہے۔ کسی دم کی مہمان ہوں اسی لیے نصیحت کرتی ہوں۔ یہ ولایت علی کا بڑا پن ہے کہ اس نے تجھے بیٹی بنایا ہے۔ نوکرانی بنا کر رکھتا تب بھی اس کا احسان ہوتا تو یہاں آتے ہی چاند تارے نوچ لینا چاہتی ہے۔ بیٹی! زمین پر واپس آجا۔"

بوڑھی نصیحتیں رینگتی ہیں کہ جوانی کے ساتھ دوڑ نہیں سکتیں۔ اس عالی شان محل میں پہنچ کر دادی ماں باہر کا کچرا دکھائی دیتی تھیں جو ہوا کی گستاخی سے اڑ کر چلا آتا تھا۔ وہ بیچاری سمجھاتے سمجھاتے تھک گئی۔ تھک کر ایک دن ہمیشہ کے لیے سو گئی۔ اس کی موت پر شاید وہ زیادہ آنسو نہ بہاتی لیکن آنسو ہمدردیاں جیتنے کا سب سے موثر ذریعہ ہوتے ہیں۔ وہ اس لیے رونے لگی کہ صداقت اور وکالت باری باری اس کے کمرے میں آتے تھے اور اس کی دلجوئی کرتے تھے۔ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ جاتے تھے۔ آنسو پونچھنے کے لیے اپنا رومال دیتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا وقت آتا ہے جب آنسوؤں کو سکہ رائج الوقت بنا کر منافع کمانے کا موقع ملتا ہے۔

ولایت علی اپنی بیگم کی ضد کے مطابق وکالت کو اپنے ساتھ مل میں لے جاتے تھے۔ بیگم سعدیہ نے خاص طور پر مطالبہ کیا تھا کہ بیٹے کو اکاؤنٹ کے شعبے میں رکھیں تاکہ ماں بیٹے کو کاروبار کی صحیح آمدنی کا علم ہوتا رہے لیکن وکالت حساب کتاب کی پیچیدگیوں سے

گھبرانے لگا۔ ادھر کی رقم ادھر ڈال کر اپنے جیب خرچ میں اضافہ کرنے لگا۔

ولایت علی نے بیٹے کو برا بھلا کہا۔ دھمکیاں دیں کہ اکاؤنٹ کے شعبے سے نکال دیں گے۔ دھمکیوں کے بعد اس نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن ہاتھ کھول کر خرچ کرنے کا عادی تھا۔ اس لیے اکاؤنٹ کے شعبے میں نہ چل سکا باپ نے اسے یارن کے شعبے میں بھیج دیا۔

ابتدا سے ولایت ٹیکسٹائل ملز کا کرتا دھرتا صداقت علی ہی تھا۔ وہ اپنی ذہانت سے منافع کی شرح بڑھاتا تھا۔ کاروباری معاملات میں باپ کا معتمد خاص تھا تمام چیکوں پر وہی دستخط کرتا تھا اور انکم ٹیکس والوں سے بھی وہی نمٹ لیا کرتا تھا۔ باپ کو کسی معاملے میں فکر کرنے یا جھکنے نہیں دیتا تھا۔

اس نے کاروبار میں خود کو اس قدر مصروف کرلیا تھا کہ اپنی ذات سے بے خبر رہنے لگا تھا۔ اپنی عمر کے تقاضوں کو بھولنے لگا تھا کہ اس عمر میں پھول مہکتے ہیں اور جذبات بہکتے ہیں۔ شاعری کی کتاب کھلتی ہے اور خیالوں کی پریاں رات گزارنے آتی ہیں۔

شائستہ اس کے کمرے کی صفائی کرتی تھی۔ اس کے کپڑے دھوتی اور استری کرتی تھی۔ بستر کی چادریں اور کھڑکیوں دروازوں کے پردے بدلتی تھی۔

وہ سوچتا تھا کہ ایسا کون کرتا ہے جبکہ سوتیلی ماں کے ڈر سے کوئی ملازم اس کی خدمت کے لیے نہیں آتا تھا۔ صرف جمعہ کے دن وہ خود کسی ملازم کو بلا کر صفائی کرواتا تھا۔

اس محل نما کوٹھی میں بیگم سعدیہ کا رعب اور دبدبہ تھا۔ بیگم صاحبہ کے خوف سے کوئی صداقت کے کمرے میں بستر کی چادر بدلنے بھی نہیں جاتا تھا۔ اگر کوئی زیادہ خدمت گزاری دکھنا چاہتا تو بیگم سعدیہ اس کی چھٹی کردیتی تھیں لیکن شائستہ کی ابھی تک چھٹی نہیں ہوئی تھی۔

اس گھر میں شائستہ کو ایک ذمے داری سمجھ کر قبول کیا گیا تھا۔ اتنی بڑی آسانی سے ملازموں کی طرح وہاں سے نکالا نہیں جاسکتا تھا۔ بیگم سعدیہ اسے دھیمے لہجے میں سمجھاتی تھیں اور ایسے ہی لہجے میں دھیمی سی دھمکیاں بھی دے ڈالتی تھیں۔

اس نے بچپن سے جوانی تک اپنی ماں کی سسکتی ہوئی زندگی اور موت دیکھی تھی اور اس حد تک سمجھ دار ہوگئی تھی کہ اس کے سمجھ داری فائدہ کمانے والی مکاری بن گئی تھی۔ وہ راتوں کو بیگم کا سر سہلا کر اور پاؤں داب کر سلادیتی تھی تاکہ پہرا دینے والی سے صبح تک نجات مل جائے۔ صداقت کا کوئی کام ایسے کردیتی تھی جیسے گھریلو فرائض ادا کرنے کے دوران اس کا بھی کام یونہی کردیا ہو۔

پھر اس نے بیگم سعدیہ کا دل جیتنے کے لیے ایک کامیاب چال چلی۔ صداقت رات کو دیر سے آتا تھا۔ صبح جلدی چلا جاتا تھا۔ شائستہ اس کے کمرے میں آتی تھی اس وقت وہ باتھ روم میں ہوتا تھا ادھر یہ اس کی ذاتی ڈائری پڑھ کر معلوم کرلیا کرتی تھی کہ پچھلے دن اس نے کتنی رقم بینک میں جمع کی ہے اور وہ کون کون سی کمپنی کے شیئرز خرید رہا ہے؟ یہ

معلومات وہ بیگم سعدیہ تک پہنچاتی تھی اور بیگم خوش ہو کر اسے گلے لگالیتی تھیں۔

صرف چند ماہ کے اندر وہ بیگم سعدیہ کی پکی سہیلی اور وکالت کے دل کی دھڑکن بن گئی۔ وکالت نے بڑی رازداری سے اس کا بینک اکاؤنٹ کھلوا دیا تھا۔ اس کے لیے قیمتی زیورات لاتا تھا۔ اس کے باوجود وہ صرف آنچل کی ہوا دیتی تھی اور وہ بدن کے شہر سے آنے والی ہواؤں میں سانس لینے کے لیے دیوانہ ہوتا جاتا تھا۔

ایک رات صداقت باہر سے آیا پھر اپنے کمرے کے سامنے پہنچ کر ٹھٹک گیا۔ دروازہ بند تھا لیکن اندر سے روشنی جھلک رہی تھی جبکہ وہ ہر رات کمرے میں آکر سوئچ آن کرتا تھا۔ وہ روشنی بتا رہی تھی کہ اندر کوئی موجود ہے۔

وہ سوچتا ہوا دروازے تک آیا پھر اسے ہاتھ لگایا تو وہ ایک راز کی طرح کھلتا چلا گیا۔ اندر کمرے کے وسط میں ایک چھوٹی سی میز پر ایک کیک رکھا ہوا تھا۔ اس پر لگی ہوئی موم بتیاں اس کے انتظار میں سلگ رہی تھیں اس نے قریب آکر دیکھا کیک پر لکھا ہوا تھا۔ "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔ صداقت علی..."

یہ خوشی کی بات تھی مگر اس کے چہرے سے ناگواری جھلکنے لگی۔ موم بتیوں کے ٹپکتے ہوئے آنسو بتا رہے تھے کہ انتظار کی آگ زیادہ دیر کی نہیں ہے چند لمحات پہلے یہاں سے کوئی گیا ہے۔

اس نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ ایک ادائے ناز سے دروازے پہ کھڑی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ پھر وہ دونوں ہاتھوں سے بے آواز تالیاں بجاتے ہوئے اس کے قریب آنے لگی۔ وہ اتنی رات کو اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ زندگی میں پہلی بار ایک جوان لڑکی ایسے وقت کمرے میں آئی تھی جب عزت اور شرافت کو پسینہ آجاتا ہے۔

اس نے سہمی ہوئی سرگوشی میں پوچھا "یہ سب کیا ہے؟ یہاں کیوں آئی ہو؟"

"آج آپ کی سالگرہ ہے سوچا آپ کو تو یاد ہوگی نہیں میں خود ہی مبارکباد دے دوں۔"

"اچھا اچھا ٹھیک ہے اب جاؤ۔"

"کہاں جاؤں؟"

"یہ کیا سوال ہے؟ اپنے کمرے میں جاؤ اور سوجاؤ۔"

"کیا بھوکی سو جاؤں؟"

وہ روٹی کے حوالے سے بول رہی تھی لیکن لہجے میں جو بھوک تھی اس کا مفہوم سمجھ میں آرہا تھا مگر وہ سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔ انجان بن کر بولا "تم نے ابھی تک روٹی نہیں کھائی؟"

"آپ کا انتظار کررہی تھی سوچا سالگرہ کی خوشی میں آپ کے ساتھ...؟"

اس نے ایسی جگہ فقرہ چھوڑا کہ "آپ کے ساتھ" کوئی بھی بات جوڑی جاسکتی تھی وہ

گھبرا رہا تھا دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ دروازہ کھلا تھا کوئی بھی کھلے ہوئے لفافے کی طرح نہیں پڑھ سکتا تھا۔

وہ مطمئن تھی کہ کوئی نہیں آئے گا۔ ولایت علی وقت پر سونے اور وقت پر جاگنے کے عادی تھے۔ بیگم سعدیہ کو اس نے ایک خواب آور گولی دے کر ان کے پاؤں دبا کر آرام سے سلا دیا تھا۔ وکالت دو دن کے لیے سیرو تفریح کے لیے گیا ہوا تھا۔ وہاں کا گھرداماد اپنی بیوی صائمہ کے ساتھ کمرے میں بند ہوچکا تھا وہ گھر کے تمام افراد کا ٹائم ٹیبل اچھی طرح جانتی تھی۔ اس لئے مطمئن تھی۔

صداقت نے کہا "میری سالگرہ منانا چاہتی ہو تو گھر والوں کو بلاؤ۔"

"گھر والے نہیں آئیں گے۔"

"جب تم آسکتی ہو تو وہ کیوں نہیں آئیں گے؟"

وہ ہمدردی جتانے کے انداز میں بولی "کون آتا ہے آپ کے کمرے میں؟ کوئی ملازم بھی نہیں آتا۔ آپ کی تنہائی دیکھ کر میرا دل کڑھتا ہے۔"

"یہاں کوئی نہیں آتا اسی لیے تم کمرے کی صفائی کرتی ہو اور میری ہر چیز کو سلیقے سے اس کی جگہ رکھتی ہو۔"

وہ مسکرا کر بولی "میں تو چھپ کر آپ کی خدمت کرتی رہی آپ کو کیسے معلوم ہوگیا؟"

"بہت سے کام دکھانے کے انداز میں چھپ کر کیے جاتے ہیں اور چھپانے کے انداز میں دکھا کر کیے جاتے ہیں۔ میں بزنس مین ہوں بازار کا اتار چڑھاؤ دیکھ کر گاہکوں کے مزاج کو سمجھ لیتا ہوں۔ جاؤ کھانا لگاؤ میں چینج کرکے آتا ہوں۔"

وہ خوش ہوگئی جلدی سے کیک اٹھانے کے لیے آگے بڑھی۔ اس نے کہا "اسے رہنے دو میں لے آتا ہوں تم چلو۔"

وہ مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر آگئی۔ یہ پہلی کامیابی تھی تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔ صداقت باہر سے کھا کر آنے کے باوجود اس کی خاطر دوبارہ کھانے پر راضی ہوگیا تھا۔ آج اصول پرست اپنا اصول بدل رہا تھا۔ آئندہ بھی اس کی خاطر بہت کچھ بدل سکتا تھا۔

دس منٹ کے بعد جب وہ کھانے کی میز پر پہنچا تو اس کے ہاتھوں میں کیک کی چھوٹی سی ٹرے تھی۔ اس نے وہ ٹرے شائستہ کے سامنے رکھ دی۔ اس کی تمام موم بتیاں بجھی ہوئی تھیں اور کیک کی سطح پر سے صداقت کا نام مٹا دیا گیا تھا۔

شائستہ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ صداقت نے کہا "میں نے صرف اپنا نام مٹایا ہے یہ کھانے کی چیز ہے اس لیے اسے نہیں پھینکا۔"

"کیا اس لیے پھینک دیتے کہ میں نے اسے پیش کیا تھا؟"

"مجھ سے سوال نہ کرو ایک بات یاد رکھو میرا مزاج وکالت سے مختلف ہے مجھے ہیپی برتھ ڈے ٹو یو جیسی فضول خرچی اور عیاشی پسند نہیں ہے۔"

"میں آئندہ آپ کی پسند کا خیال رکھوں گی۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"میں چاہتا ہوں کھانے میں یا کسی اور سلسلے میں میرا انتظار کبھی نہ کرو۔ آج رات میرے کمرے میں آنے کی غلطی کی ہے آئندہ یہ غلطی دن کو بھی نہ کرنا۔"

یہ کہتے ہی وہ پلٹ کر چلا گیا۔ جب تک وہ جوان لڑکی اس کے کمرے میں تھی وہ عزت کے خیال سے کمزور بنا ہوا تھا اسے بہانے سے ڈائننگ روم میں بھیج کر شہ زور بن گیا تھا اس کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر شائستہ کو غلطی کا احساس ہوا۔ یہ کمرے سے نہ نکلتی تو وہ بھی بزدلی کے خول سے نہ نکلتا۔

ناکامی تو ہوئی تھی لیکن یہ جان گئی تھی کہ وہ کن حالات میں بزدل بن جاتا ہے صداقت کا خیال تھا کہ اس نے شائستہ کو اچھا سبق سکھایا ہے۔ اب وہ ایسی اوچھی حرکتیں نہیں کرے گی۔

وہ صبح اپنا کمرا کھلا چھوڑ کر جاتا تھا اس روز اس نے دروازے کو لاک کردیا تاکہ عدم موجودگی میں شائستہ کمرے کے اندر نہ جائے۔ بند دروازہ دیکھ کر واپس چلی جائے۔ وہ کم از کم اس الزام سے محفوظ رہے گا کہ ایک جوان لڑکی کو اپنے کمرے میں بلاتا ہے۔ الزام لگانے والے یہ نہیں مانتے کہ لڑکی خود آئی ہے۔

وہ دوسری رات کچھ اور دیر سے آیا تاکہ وہ جاگتی ہو تو تھک کر سوجائے اس نے کوٹھی میں داخل ہوکر دیکھا۔ وہاں معمول کی طرح سناٹا تھا۔ سب سو رہے تھے۔ وہ ڈپلیکیٹ چابی سے دروازہ کھول کر آتا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا وہ نظر نہیں آرہی تھی۔ دل کو اطمینان ہوا اپنے کمرے کے سامنے آیا اور دروازے کے ہینڈل کو دبا کر دیکھا وہ صبح سے مقفل تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنی چابی سے دروازے کو کھولا۔اندر تاریکی تھی۔ اس نے سوئچ کو آن کیا تو کمرا روشن ہوگیا۔ وہ پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی دل دھک سے رہ گیا۔

اس نے گھبرا کر پوچھا "تم اندر کیسے آئیں؟"

وہ اٹھتے ہوئے بولی "جیسے پہلے آتی تھی۔"

"پہلے کب؟"

"بیگم امی مجھے اس کمرے کی صفائی کرنے سے منع کرتی تھیں۔ میں نے ایک موم میں اس دروازے کے کی ہول کا سانچہ بنا کر ایک چابی والے کو دیا تھا اس نے ڈپلیکیٹ چابی بنا دی تب سے میں چھپ کر آتی تھی کمرے کی صفائی کرنے کے بعد دروازے کو لاک کرکے چلی جاتی تھی۔"

"تم آخر چاہتی کیا ہو؟"

وہ قریب آئی اور اسکے منہ کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولی۔ "آہستہ کوئی سن لے گا۔"

اس نے منہ کی طرف آنے والے ہاتھ کو ہٹا کر پوچھا "کس سے ڈر رہی ہو؟ ڈرتے تو

چور ہیں۔"

شائستہ نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ "ابھی آپ کو ڈر نہیں لگ رہا ہے؟"

"ہاں تم یہاں ٹھہرو گی تو میں بدنام ہو جاؤں گا۔"

"محبت میں بدنامی یک طرفہ نہیں ہوتی۔"

"محبت؟" اس نے پوچھا "یہ کیا بکواس ہے؟"

"ہاں میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

وہ سختی سے بازو پکڑ کر اسے دروازے کی طرف کھینچتے ہوئے بولا "نکل جاؤ یہاں سے ورنہ ..."

وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا دروازے پر بیگم سعدیہ کھڑی ہوئی تھیں صداقت کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی وہ خود کو چھڑا کر دوڑتی ہوئی بیگم سعدیہ کے پاس آئی۔ پھر قدموں میں گر کر رونے لگی۔

"یہ کیا بے حیائی ہے؟" بیگم سعدیہ نے چیخ کر پوچھا۔

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا "بیگم امی! یہ زبردستی میرے کمرے میں گھس آئی تھی۔"

"کیا بکواس کرتے ہو میں نے دن کے وقت یہاں آکر دیکھا تھا دروازہ مقفل تھا کیا تم اسے لاک کر کے نہیں گئے تھے؟"

"جی ہاں۔ مگر...."

"مگر کیا؟ یہ لڑکی چابی کے سوراخ سے گھس کر اندر آگئی تھی... یا دروازہ توڑ کر آئی تھی؟"

"اس کے پاس میرے کمرے کی ڈپلیکیٹ چابی ہے۔"

شائستہ نے روتے ہوئے کہا "یہ جھوٹ ہے بیگم امی! آپ میری تلاشی لے لیں۔ میرے پاس چابی وابی کچھ نہیں ہے انہوں نے مجھے بہانے سے یہاں بلایا تھا۔"

وہ گرج کر بولا۔ "جھوٹ مت بولو میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔"

بیگم سعدیہ نے پوچھا۔ "کیا تم منہ توڑنے کی دھمکی دے کر اس کا منہ بند کر رہے ہو؟"

ولایت علی کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ "کیا ہو رہا ہے؟ اتنا شور کیوں مچا رہی ہو۔"

"آپ کے خاندان کی عزت کا ماتم کر رہی ہوں میں عین وقت پر یہاں نہ آتی تو اس غریب لڑکی کی عزت لٹ گئی ہوتی جسے آپ نے بیٹی بنا کر رکھا ہے۔"

ولایت علی نے شدید حیرت اور بے یقینی سے بڑے بیٹے کو دیکھا۔ چھوٹے بیٹے وکالت نے ان کے پیچھے آکر کہا "بھائی جان! میں نے یہ سنا تھا کہ آپ چھپے رستم ہیں لیکن ابا جان سے آپ کے خلاف کبھی کچھ نہیں کہا کیونکہ یہ صرف مجھے ہی آوارہ سمجھتے ہیں۔ آج تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے' آپ نے خود ہی ثبوت دے دیا ہے۔"

ولایت علی نے صداقت سے پوچھا "یہ تمہارے کمرے میں کیسے آئی؟"

صداقت سے پہلے ہی بیگم سعدیہ نے کہا "صاحبزادے فرماتے ہیں کہ یہ دروازہ لاک ے کے گئے تھے۔ اس کے باوجود شائستہ اندر پہنچ گئی تھی۔ جھوٹ بولنے کا بھی ایک سلیقہ تا ہے اس دروازے کی دوسری چابی کسی کے پاس نہیں ہے۔ شائستہ کے پاس تو ہو ہی ں سکتی۔ آپ کہیں تو میں اس کی تلاشی لیتی ہوں۔"

"نہیں آج تک میرے گھر میں ایسی شرمناک بات نہیں ہوئی میں شرم سے مرا جا رہا ں۔ شائستہ میرے ساتھ آؤ۔"

وہ حکم دے کر اپنے بیڈ روم کی طرف جانے لگے۔ بیگم سعدیہ نے شائستہ کو قدموں ے اٹھایا۔ پھر کہا "آؤ میرے ساتھ میں تمہیں انصاف دلاؤں گی۔"

وہ شائستہ کو لے کر بیڈ روم میں آئیں۔ ولایت علی صوفے پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ م سعدیہ نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ پھر کہا "شائستہ ہم نے تمہیں بیٹی بنا کر رکھا ہے۔ یہاں تمہارے لیے کوئی کمی نہیں کی۔ آج بھی تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو گی۔ بات ہے سچ سچ بولو۔ تم صداقت کے کمرے میں کیوں گئی تھیں؟"

وہ روتے روتے بولی "میں خود نہیں گئی تھی۔ انہوں نے بلایا تھا۔"

"کیوں بلایا تھا؟ اتنی رات کو تم ایک جوان لڑکے کے کمرے میں کیوں گئی تھیں؟"

"میں تو حکم کی بندی ہوں۔ کچن میں دودھ گرم کر رہی تھی انہوں نے آکر کہا ... سر ں درد ہو رہا ہے۔ ایک کپ چائے بنا کر لے آؤ۔ میں چائے لے کر گئی تو انہوں نے نہوں نے ..."

وہ بات ادھوری چھوڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کہنے لگی۔ "اگر ۔ اگر آپ عین قت پر نہ آتے تو میں کسی کو منہ دکھانے..."

وہ پھر بات ادھوری چھوڑ کر رونے لگی۔ ولایت علی شرم سے نظریں جھکائے ہوئے تھے اور کہہ رہے تھے "مجھے ڈوب مرنا چاہیے۔ میں نے جسے بیٹی بنایا ہے اب اس سے ظریں نہیں ملا سکتا۔ بیگم اسے لے جاؤ اور صداقت کو بلاؤ۔"

بیگم سعدیہ نے شائستہ سے کہا "آؤ میرے ساتھ۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر آئیں۔ باہر وکالت اس کی بہن صائمہ اور بہنوئی حشمت کھڑے وئے تھے۔ بیگم نے صائمہ سے کہا۔ "شائستہ کو اپنے کمرے میں لے جاؤ اور وکالت تم مداقت سے جا کر کہو ابا جان بلا رہے ہیں۔"

شائستہ صائمہ کے ساتھ چلی گئی۔ وکالت بھائی کو بلانے گیا۔ بیگم نے شوہر کے پاس آکر کہا "گھر میں بیٹی داماد ہیں۔ صداقت نے ایسی حرکت کی ہے کہ داماد سے بھی نظریں نہیں ملائی جاتیں۔ میں صاف صاف کہہ دیتی ہوں۔ یہ لڑکا یہاں رہے گا تو میں اپنے بچوں کو لے کر چلی جاؤں گی۔"

ولایت علی کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بیگم نے کہا "خاموش رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ آپ کو دو ٹوک فیصلہ کرنا ہوگا۔"

وہ جھنجھلا کر بولے "میرا سر نہ کھاؤ۔ خاموش رہو۔ مجھے سوچنے دو۔"

"یہ تو میں جانتی ہوں کہ مجھے ہی خاموش کرائیں گے۔ آپ کا بیٹا رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔ میرا منہ بند کرانے سے بات نہیں دبے گی۔ کیا آپ نے اسی دن کے لیے اسے بیٹی بنایا تھا؟"

ولایت علی سر اٹھا کر کچھ کہنا چاہتے تھے۔ پھر صداقت کو آتے دیکھ کر چپ ہوگئے۔ اٹھ کر کھڑے ہوگئے ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے گئے۔ پھر بولے "جو ہوگیا اسے بحث کا موضوع بناتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے۔"

"ابا جان! یہ مجھ پر الزام ہے میں نے اسے نہیں بلایا تھا وہ خود آئی تھی۔"

بیگم سعدیہ نے پوچھا "بند کمرے میں خود کیسے چلی آئی تھی جبکہ اس کے پاس دوسری چابی نہیں ہے۔ چوری کرنے والا سینہ زوری کرے کوئی بات نہیں لیکن ایسی شرمناک بات پر باپ سے بحث کرنا انتہائی بے شرمی ہے۔"

ولایت علی نے کہا "میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ اس معاملے پر بحث نہیں ہوگی۔ ہم شریف لوگ ہیں اپنی زبان پر مرجاتے ہیں۔ اور اس زبان سے میں نے اسے بیٹی کہا ہے۔ اس لیے میرا فیصلہ ہے کہ وہ بدنام نہیں ہوگی۔ ہمارے گھر کی عزت بن کر رہے گی۔ اسے تمہاری شریک حیات اور میری بہو بنا کر ہی اس کے ساتھ انصاف کیا جاسکتا ہے۔"

صداقت نے چونک کر باپ کو دیکھا۔ پھر کہا "نہیں ابا جان! آپ غصے اور جوش میں غلط فیصلہ نہ کریں۔"

"غلط فیصلہ؟" وہ غصے سے بھڑک گئے۔ "کیا میں غلط فیصلے کرتا ہوں اتنا بڑا کاروبار اتنا بڑا خاندان کیا یہ غلط فیصلوں سے چل رہا ہے۔ میں تمہاری غلطی پر پردہ ڈالنا چاہتا ہوں تو کیا یہ غلط کر رہا ہوں؟"

"غلطی کیسی ابا جان؟ میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔"

"وہ تمہارے کمرے میں تھی۔ اس کے بعد کسی سوال کی اہمیت نہیں ہے کہ وہ کیوں آدھی رات کو وہاں تھی؟ خود آئی تھی یا بلائی گئی تھی؟ غیرت کا تقاضا ہے کوئی سوال نہ کیا جائے۔ وہ شریف لڑکی ہے۔ صورت شکل کی اچھی ہے۔ دس جماعتیں پاس ہے۔ وہ ہماری بیٹی بن سکتی ہے تو بہو بھی بن سکتی ہے۔"

"سوری ابا جان! میں اس لڑکی سے کبھی شادی نہیں کروں گا۔"

"تم میرے فیصلے سے انکار کر رہے ہو؟"

"جسے میں غلط سمجھتا ہوں اور اسے غلط کہتا ہوں تو آپ کو غصہ آتا ہے۔ آپ سمجھتے ہیں میں آپ کے فیصلے کو غلط کہہ رہا ہوں جبکہ یہ سارا معاملہ ہی غلط ہے۔"

بیگم سعدیہ نے کہا "کیا غلط غلط کی رٹ لگا رہے ہو۔ شادی کے لیے ہاں یا نا میں جواب دو۔"

"میں جواب دے چکا ہوں۔"

ولایت علی نے پوچھا "انکار کا انجام جانتے ہو؟"

"جانتا ہوں۔ باپ کے ہاتھوں بیٹے کا انجام کبھی برا نہیں ہوتا۔"

جواب ایسا تھا کہ باپ سوچ میں پڑ گیا۔ بیگم سعدیہ نے کہا۔ "آپ فلمی ڈائیلاگ سے متاثر نہ ہوں۔ آپ کو یہ سوچنا ہے کہ ایسے شرمناک واقعے کے بعد شائستہ یہاں کس حیثیت سے رہے گی؟"

ولایت علی نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا "جب تک شائستہ کی شادی نہیں ہوگی اور وہ اس گھر سے رخصت نہیں ہوگی تب تک صداقت یہاں نہیں رہے گا۔"

بیگم سعدیہ خوشی سے کھلنا چاہتی تھیں۔ لیکن یہ مسکرانے کا بھی موقع نہیں تھا۔ وہ بولیں۔ "کیوں صداقت! کیا اب بھی باپ کے فیصلے سے انکار کرکے گھر سے نکلنا چاہوگے؟"

وہ بولا "ساری عمر کا جنم خریدنے سے بہتر ہے آدمی گھر کی جنت سے نکل جائے۔"

"لچھے دار باتوں سے یہ حقیقت چھپا رہے ہو کہ تم نے باپ کی توہین کی ہے۔"

وہ کوئی جواب دیے بغیر تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے باہر گیا اور نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ ولایت علی کو یوں لگا جیسے بیٹا ہاتھوں سے چھوٹ کر گم ہوگیا ہو۔ وہ دل تھام کر صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئے۔ بعض اوقات آنکھیں ایسی باتوں کو تسلیم کرنے پر مجبور کردیتی ہیں جنہیں دل ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔ ولایت علی نے دل سے بیٹے کو خطا وار تسلیم نہیں کیا تھا اور آنکھوں دیکھی سچائی سے بھی انکار نہیں کر رہے تھے۔

بیگم سعدیہ نے پاس آکر بیٹھتے ہوئے کہا "میں نے دنیا دیکھی ہے۔ یہ اچھی طرح جانتی ہوں کہ صداقت گھر سے جائے گا تو سوتیلی ماں بدنام ہوگی۔ میں کسی کے لینے میں ہوں نہ دینے میں پھر بھی میں ہی بری کہلاؤں گی۔ میری تو دعا ہے کہ شائستہ جلد سے جلد اپنے گھر کی ہو جائے تاکہ صداقت واپس آجائے۔"

انہوں نے کہا "جوان بیٹے کا گھر سے جانا اچھا نہیں ہے۔ تم چاہو تو بگڑی ہوئی بات بن سکتی ہے۔"

"کیا آپ چاہتے ہیں میں صداقت کو جانے سے روک لوں؟"

"ہاں، شائستہ خوبصورت ہے، سلیقہ شعار ہے، اس گھر کی بہو بننے کے لائق ہے۔ اس کی شادی وکالت سے ہو جائے تو میرے دل سے یہ بوجھ ہٹ جائے گا کہ اس گھر میں اس کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔ شادی کے بعد صداقت واپس آجائے گا۔"

وکالت دروازے کے پاس کھڑا سن رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا۔ شائستہ نے اسے اتنا ترسایا تھا، اتنا ترسایا تھا کہ اسے حاصل کرنے کے لیے شادی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ

سمجھ رہا تھا' والدین اسے بہو بنانے پر آمادہ نہیں ہوں گے لیکن آج ولایت علی نے اپنے ضمیر کی آواز پر یہ فیصلہ کیا تھا جو بڑے بیٹے کو قبول نہیں تھا اور چھوٹا تین بار قبول کرنے کو تیار تھا۔

بیگم سعدیہ نے بھڑک کر کہا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ شائستہ کی شادی میرے وکالت سے؟ نہیں ہرگز نہیں۔"

"آخر کیوں نہیں؟"

"جس پر بڑے نے بُری نیت ڈالی ہے وہ چھوٹے کی دلہن نہیں بنے گی۔"

"ہم گھر والے شائستہ کے لیے ایسا کہہ رہے ہیں تو باہر والے کیا کہیں گے۔ کیا ہم اسے بیٹی بنا کر اس کی زندگی برباد کر رہے ہیں؟"

"آپ کچھ بھی کہہ لیں میرا دل نہیں مانتا۔ میں اپنے بیٹے کے لیے اپنی پسند کی دلہن لاؤں گی۔"

وکالت نے دروازے کے پاس سے ماں کو ناگواری سے دیکھا۔ پھر وہاں سے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے جانے لگا۔ اس کی بہن صائمہ اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر بولی "کیا فیصلہ ہوا؟"

"بھائی جان کی چھٹی ہوگئی ہے شائستہ کہاں ہے؟"

"اپنے کمرے میں۔"

وہ جانے لگا۔ صائمہ نے پوچھا "کہاں جا رہے ہو؟ کیا تمہیں بھی بدنام ہونا ہے؟"

"بدنامی ہوتی ہے تو ہو جائے' امی کا دماغ چل گیا ہے۔ ابا جان اسے میری دلہن بنانا چاہتے ہیں اور وہ انکار کر رہی ہیں۔"

وہ بڑبڑاتا ہوا زینے سے اترنے لگا۔ صائمہ سوچتی رہ گئی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ پہلے بڑا بدنام ہوا اب چھوٹا اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ امی اور ابا جان کے درمیان بھی اسی سلسلے میں رسہ کشی ہو رہی ہے۔

وکالت علی ایک بیڈ روم میں آیا۔ شائستہ بیٹھی ہوئی سر جھکائے سوچ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ مسکرا کر رازداری سے بولی "کیسی ایکٹنگ کی؟"

"تمہارا جواب نہیں ہے۔ امی کی پلاننگ نے اور تمہاری اداکاری نے بھائی جان کی چھٹی کردی ہے۔ وہ یہاں سے بوریا بستر باندھ رہے ہیں۔ انہوں نے تم سے شادی سے انکار کردیا تھا۔"

"شادی؟"

"ابا جان نے فیصلہ کیا تھا کہ بھائی جان سے تمہاری شادی کرائی جائے۔"

"ہرگز نہیں۔" وہ وکالت کے بازو سے لگ کر بولی "میں تمہارے سوا کسی اور کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ تمہاری امی نے کہا تھا اگر میں صداقت کو ذلیل کرکے یہاں سے نکالنے

میں ان کا ساتھ دوں تو وہ مجھے منہ مانگا انعام دیں گی۔ میری شادی تم سے نہ ہوئی تو اپنی جان دے دوں گی۔"

"اوہ شائستہ! تم مجھے اتنا چاہتی ہو کہ میری خاطر جان دے سکتی ہو؟"

"میں اپنی زبان سے محبت کا دعویٰ نہیں کرتی۔ تم میرا ہاتھ پکڑنے کے چکر میں رہتے ہو۔ تمہاری محبت میں ہوس ہے میری محبت میں تمہارے لیے عقیدت اور عزت ہے۔"

"اوہ شائستہ! ایسے بولوگی تو میں قربان ہو جاؤں گا۔"

"صرف قربان ہونے سے ہم ایک دوسرے کے جیون ساتھی نہیں بن سکیں گے۔ تمہاری امی نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے منہ مانگا انعام دیں گی۔ میں انعام میں تمہیں چاہتی ہوں۔"

"تمہاری محبت اور وفا دیکھ کر مجھے امی پر غصہ آرہا ہے۔ جب بھائی جان نے انکار کردیا تو ابا جان تمہاری شادی مجھ سے کرنا چاہتے تھے لیکن امی انکار کر رہی ہیں۔"

"تم نے انکار سنا اور کچھ نہیں کہا؟"

"کہوں گا۔ پہلے امی سے دو ٹوک فیصلہ کروں گا۔ پھر ابا جان سے کہوں گا کہ ان کا فیصلہ سر آنکھوں پر۔ میں شائستہ سے شادی کروں گا۔"

بیگم سعدیہ نے دروازے پر آکر غصے سے پوچھا "یہاں کیا کر رہے ہو؟ اپنے کمرے میں جاؤ۔"

"جارہا ہوں۔ آپ یہ بتائیں ہماری شادی سے انکار کیوں کیا ہے؟"

"میں بہتر سمجھتی ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

"میں بچہ نہیں ہوں۔ اپنی بہتری خوب سمجھتا ہوں۔"

بیگم سعدیہ نے گھور کر شائستہ کو دیکھا پھر پوچھا "تم اسے بہکا رہی ہو؟ بیٹے کو ماں سے چھیننا چاہتی ہو؟"

شائستہ نے کہا "ضروری نہیں ہے کہ بہو ماں سے اس کے بیٹے کو چھین لے۔ یہ اندیشہ ہر ماں کو رہتا ہے پھر بھی وہ بہو لاتی ہے۔"

ماں نے حکم دیا "وکالت اپنے کمرے میں جاؤ مجھے اس سے کچھ باتیں کرنے دو۔"

"بات تو میری ہی ہوگی۔ پھر میں کیوں جاؤں۔ یہ کیا ہے امی' کچھ دیر پہلے ہم سب ایک تھے۔ ہم نے بہترین پلاننگ پر عمل کیا اور کامیاب ہوئے پھر آپ یہ اتحاد کیوں توڑ رہی ہیں؟"

"یہ لڑکی ہمارے اتحاد کی بہت بڑی قیمت مانگ رہی ہے۔"

شائستہ نے کہا "آپ اسے قیمت کہہ رہی ہیں جبکہ میں محبت مانگ رہی ہوں۔ تم کیا سمجھتے ہو وکالت کیا میں قیمت مانگ رہی ہوں؟"

"نہیں تم وفا کی دیوی ہو محبت مانگ رہی ہو۔"

بیگم سعدیہ نے غصے سے کہا ”ارے او دیوی کے دیوتا! کیوں اس کے فریب میں آرہا ہے؟“

وہ بولی ”میں نے صداقت سے فریب کیا۔ بولو وکالت کس کی خاطر ایسا کیا۔“

”امی اس نے میری خاطر ایسا کیا ہے۔ اور آپ اسے فریبی کہتے ہیں؟“

”میں کہتی ہوں یہاں سے جاؤ مجھے بات کرنے دو۔“

وکالت نے شائستہ کو دیکھا۔ شائستہ نے کہا ”تم ہی بتاؤ اگر میں تم سے وفا نہ کروں اور ابھی ابا جان کے سامنے سر پر کتاب رکھ کر حلفیہ کہہ دوں کہ صداقت بھائی فرشتہ ہیں۔ ان کے کمرے کی ڈپلیکیٹ چابی بیگم امی کے پاس ہے۔ انہوں نے مجھے کمرے میں پہنچا کر باہر سے دروازہ لاک کیا تھا... یہ حقیقت کھلے گی تو کیا ہوگا۔“

بیگم سعدیہ کو چپ سی لگ گئی۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ ابھی تو محض شائستہ دھمکی دے رہی ہے مگر وکالت سے رشتہ نہ ہوا تو وہ اس دھمکی پر عمل بھی کر سکتی ہے۔

شائستہ نے کہا ”دیکھو وکالت میں فی الحال تمہاری خاطر ایسا نہیں کر رہی اگر کرنا چاہوں تو صداقت بھائی صبح یہاں سے جائیں گے اور صبح تک پھر بازی پلٹ جائے گی۔ میرا کیا ہے' باہر سے آئی باہر ہانک دی جاؤں گی مگر تمہاری پوزیشن کیا ہوگی؟ صداقت بھائی پر ابا جان کا اعتماد پہلے سے بڑھ جائے گا۔ اس گھر میں تمہارے ساتھ تمہاری امی کی پوزیشن بھی دو کوڑی کی رہ جائے گی۔“

بیگم سعدیہ گھور گھور کر اسے دیکھ رہی تھیں۔ یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ ان کے ٹکڑوں پر پلنے والی اس انداز میں بلیک میل کرے گی۔ وہ ذرا نرم پڑ کر بولیں ”تم نے تو نمک حرامی کی انتہا کر دی۔ کیا ہمارے احسانات کا بدلہ اس طرح دوگی؟“

”احسان تو محترم ولایت علی صاحب کا ہے انہوں نے مجھے بیٹی بنایا اور میں آپ کے ساتھ مل کر اس محسن کو دھوکا دے رہی ہوں۔ ان کے بے گناہ بیٹے کو گناہ گار بنا رہی ہوں۔ ہم سب نمک حرام ہیں۔ آپ بیوی بن کر ان کا نمک کھا رہی ہیں' میں لے پالک بن کر کھا رہی ہوں۔ ہم دونوں کیا کر رہے ہیں؟ اس کا جواب ہے آپ کے پاس؟“

”میں بحث نہیں کرنا چاہتی۔ اپنی اوقات میں رہ کر مجھ سے جو مانگو گی وہ تمہیں دوں گی۔“

”محبت خیرات مانگنے سے نہیں ملتی وہ تو دل سے دی جاتی ہے۔ کیوں وکالت؟“

وہ بولا ”ایکزیکٹلی' بالکل ایک دم سچ ہے' درست ہے۔“

شائستہ نے کہا ”ایک اور سچ سن لو۔ جب میں تمہاری شریک حیات نہیں بن سکوں گی تو صبح یہاں سے چلی جاؤں گی۔ پھر میرے جانے کے بعد صداقت بھائی واپس آجائیں گے۔“

بیگم یہ بھی نہیں چاہتی تھیں کہ وہ واپس آئے۔ وہ تو اسے گھر سے نکالنے کے بعد مل

سے بھی نکالنے کے چکر میں تھیں۔ شائستہ نے کہا ”ایک اور سچ سن لو۔ میں اس گھر کی بہو بن کر رہوں گی تو ابا جان سے صاف صاف کہہ دوں گی کہ جس نے مجھ پر بری نیت کی میں اس کے ساتھ ایک چھت کے نیچے نہیں رہوں گی۔ یوں میرے یہاں مستقل رہنے سے اس کی واپسی کا چانس ختم ہو جائے گا۔“

وہ بڑے پتے کی بات کر رہی تھی۔ دور کی کوڑی لائی تھی اور ثابت کر دیا تھا کہ اس کی دوستی میں فائدے ہیں۔ دشمنی میں سراسر نقصان ہے لیکن وہ بے حد فائدہ مند ہونے کے باوجود بیگم سعدیہ کا دل دھڑکا رہی تھی۔ ایک ماں ایسی لڑکی کو بہو نہیں بناتی جو شادی سے پہلے ہی اس پر حاوی ہو رہی ہو اور بیٹے کو لٹو کی طرح گھما رہی ہو۔

بیٹے نے پوچھا ”امی! آپ کیا سوچ رہی ہیں۔“

”میں سوچ رہی ہوں' تم چاہو تو اس لڑکی کو سمجھا سکتے ہو اگر یہ بہو بننے کی ضد نہ کرے تو میں ساری زندگی اس کی احسان مند رہوں گی' اس کی عزت کرتی رہوں گی۔ کہیں اس کی شادی کر کے اسے دو سو گز کے پلاٹ پر مکان بنوا کر دوں گی۔“

شائستہ نے کہا ”میں مکان نہیں گھر چاہتی ہوں اور گھر محبت کرنے والے سے بنتا ہے۔ کیوں وکالت؟“

”ایکزیکٹلی بالکل ایکدم سچ...“

”بکواس مت کرو۔ تم تو ابھی سے اس کے میاں مٹھو بن گئے ہو۔“

شائستہ نے بیگم سے کہا ”ایک بات اور آپ کی سمجھ میں نہیں آرہی۔ صداقت بھائی کی دلہن اس گھر میں آئے گی تو وہ اپنے شوہر کے حق میں آپ کی دشمن ہوگی۔ جس طرح صداقت بھائی آپ کے بیٹے کے حقوق چھین رہے ہیں اسی طرح بہو آپ کے حقوق چھیننا شروع کر دے گی۔ ایسے وقت میں ہی کام آؤں گی اور ایسے وقت آپ کو عقل آئے گی کہ کسی بھی بیٹے کی ماں کو بہو سے نجات ممکن نہیں ہے۔ آپ مجھ سے پیچھا چھڑا کر کسی دوسری کو گلے باندھ لیں گی۔ میں تو یہاں پہلے دن سے دوست ہوں۔ آپ کی ہر سازش میں ساتھ رہتی ہوں۔ اس کی کیا ضمانت ہے کہ جسے آپ پسند کر کے لائیں گی وہ ہر معاملے میں آپ کا ساتھ دے گی۔“

بیگم اسے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ اس کی باتیں دل کو لگ رہی تھیں۔ انہوں نے پوچھا ”تم اتنی ہی وفادار ہو تو میرے بیٹے کو کیوں بہکا رہی ہو؟“

”آپ جسے بہکانا کہتی ہیں' وہ میری محبت ہے۔ آپ میرا حق مجھے دے کر دیکھیں میں دشمن دکھائی نہیں دوں گی کتا وفادار ہوتا ہے لیکن منہ سے روٹی چھینو تو وہ بھی کاٹنے کو دوڑتا ہے۔“

وہ سر جھکا کر سوچتی ہوئی وہاں سے جانے لگیں۔ جب وہ کمرے سے باہر جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو وکالت نے کہا ”کمال ہے تم نے امی کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔“

"اس میں کمال کی کیا بات ہے۔"

"یہ بات ہے کہ امی ابا جان جیسے سخت اصول پرست بزنس مین کو سوچنے کا بھی موقع نہیں دیتیں۔ اپنے حق میں فیصلے کراتی رہتی ہیں۔ آج تم نے اپنے حق میں فیصلہ کرنے کے لیے انہیں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔"

"میں تمہاری امی کی بہت عزت کرتی ہوں۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"مگر وہ کام نکلتے ہی مجھے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکنا چاہتی ہیں۔"

"میں دیکھ رہا ہوں۔ سمجھ رہا ہوں۔"

"صرف سمجھتے ہی رہو گے یا مجھے دلہن بنانے کے لیے کچھ کرو گے؟"

"تم بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

"ماں کو یقین دلاؤ کہ تم مجھ سے زیادہ انہیں چاہتے ہو۔"

"تم سے زیادہ ماں کو؟ یعنی کہ تم سے زیادہ؟"

ہاں کہنے میں کیا حرج ہے یہ تو ہمارا خدا جانتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو جان سے زیادہ چاہتے ہیں۔"

"ہاں خدا جانتا ہے امی نہیں جانتیں۔ اس لیے امی سے کہوں گا کہ انہیں زیادہ چاہتا ہوں لیکن اس سے کیا ہوگا؟"

"اس سے ماں کے دل کو اطمینان ہوگا۔ پھر تم کہنا کہ ہماری بہت سی کمزوریاں شائستہ کے ہاتھوں میں ہیں۔ اس سے شادی کرنے ہی میں فائدے ہیں۔ شادی کر کے شائستہ کو فالتو سامان کی طرح کسی اسٹور روم میں ڈال دوگے۔"

"ایسا کہوں تو میرا منہ جلے۔ میں تمہیں اس گھر کی ملکہ بنا کر رکھوں گا۔"

"میں جانتی ہوں مگر امی کو بہلاؤ انہیں راضی کرو۔ کھانا پینا چھوڑ دو پھر دیکھو وہ ایک ٹانگ پر راضی ہوجائیں گی۔"

"اچھا جارہا ہوں ایک بار اپنا ہاتھ پکڑنے دو۔"

وہ ہاتھ پیش کرتے ہوئے بولی "شام سے بڑی تکلیف ہے آج صرف چھو لو کل پکڑ لینا"

اس نے ہاتھ کو چھو کر پوچھا "پتا نہیں وہ کل کب آئے گی؟"

"جب تمہاری امی راضی ہوجائیں گی۔"

لاحاصل بدن کے ایک حصے کو چھو کر اس کے اندر بجلی سی دوڑ گئی۔ وہ حوصلوں سے بھر گیا۔ ابھی محض ایک کرن ملی تھی پورا آفتاب نہیں نکل رہا تھا۔ ماں سے لڑنے جھگڑنے کے بعد ہی وہ آفتابی بدن مل سکتا تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے باہر گیا شائستہ نے دروازہ بند کرلیا۔

دوسری صبح چھ بجے صداقت نے اپنا تمام ضروری سامان سمیٹ کر کار کی ڈگی میں رکھا۔ پھر انٹرکام پر بیگم سعدیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میں جارہا ہوں اگر آپ چاہتی ہیں کہ ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں تو میری ایک شرط ہے۔"

"بولو میں سن رہی ہوں۔"

"شائستہ کی شادی وکالت سے کردیں۔"

"مجھے تمہارا مشورہ نہیں چاہیے۔"

"یہ مشورہ نہیں آپ جیسی سوتیلی ماں کے لیے دھمکی ہے۔ اگر میں نے ابا جان کا فیصلہ مان کر شادی کرلی تو آپ بہت خسارے میں رہیں گی۔ پہلا خسارہ یہ کہ میرے دامن پر لگایا ہوا داغ دھل جائے گا پھر سے ابا جان کا چہیتا بیٹا بن جاؤں گا... پھر اس گھر سے آپ میرے قدم نہیں اکھاڑ سکیں گی بلکہ شائستہ میری دلہن بن کر آپ کے قدم اکھاڑے گی اور مل میں وکالت کو میں پچھاڑتا رہوں گا۔"

بیگم سعدیہ کے ہوش اڑ گئے۔ شائستہ جیسی تیز طرار لڑکی صداقت کی شریک حیات بنے گی تو تمام سوتیلوں کو ناچ نچادے گی۔ عقل چیخ چیخ کر سمجھانے لگی کہ وہ مہرہ صداقت کی بساط پر نہیں جانا چاہیے۔

انہوں نے پچھلی رات شائستہ کو صداقت کے کمرے میں پہنچا کر اس دروازے کو دوبارہ باہر سے لاک کردیا۔ ان کا خیال تھا دونوں جوان ہیں۔ بہکنے لگیں گے تو وہ ولایت علی کو یہ تماشا دکھائیں گی لیکن توقع کے خلاف صداقت نہ بہکا نہ اگلی کو بہکنے دیا۔ جس کے نتیجے میں بیگم سعدیہ صرف صداقت کو بدنام کرسکیں۔ شائستہ کو پارسا ثابت کرنا پڑا۔ اگر حالات یوں نہ ہوتے تو شائستہ کو بھی بدنام ہو کر اس گھر سے نکلنا پڑتا۔

انہوں نے ایسی سازش کرتے وقت یہ نہیں سوچا تھا کہ ولایت علی ضمیر کی آواز پر ایک لاوارث لڑکی کو بہو بنانے پر آمادہ ہوجائیں گے بڑا راضی، نہیں ہوگا تو اسے چھوٹے کی شریک حیات بنانا چاہیں گے۔ اب تو بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی تھی۔ صداقت نے شائستہ کو قبول کرنے کی دھمکی دے دی تھی۔ اس تمام گھریلو سیاست میں شائستہ نے اہمیت اختیار کرلی۔ وہ جس کی جھولی میں جاتی اسی کو اقتدار حاصل ہوتا۔

صداقت نے کہا "میں جارہا ہوں۔ مجھے شام تک دفتر میں یہ خوشخبری ملنا چاہیے کہ آپ اسے اپنی بہو بنا رہی ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو میں کبھی واپس نہیں آؤں گا جہاں شائستہ رہے گی اس چھت کے نیچے میں نہیں رہوں گا۔"

"میں اسے بہو بنالوں گی لیکن یہ کیسی ذلالت ہے کہ تم میرے بیٹے کو مل کے کسی شعبے میں ٹکنے نہیں دیتے کیا اسے اپنا محتاج بنا کر رکھنا چاہتے ہو؟"

"جس روز وہ شائستہ کو دلہن بنائے گا اسی دن میں ابا جان سے کہوں گا کہ صوبہ سندھ میں سپلائی ہونے والے تمام مال کا حساب کتاب اور وہاں کی تمام آمدنی وکالت کے نام کردی

جائے۔"

وہ خوش ہوکر بولیں "اگر ایسا ہوجائے تو جھگڑا کس بات کا ہوگا؟ تمام جھگڑے ختم میں دو دن کے اندر اسے اپنی بہو بناؤں گی تم اپنی زبان پر قائم رہنا۔"

صداقت رابطہ ختم کرکے چلا گیا۔ بیگم دوڑی دوڑی ولایت علی کے کمرے میں آئیں۔ وہ باتھ روم میں تھے۔ یہ دروازہ پیٹ کر بولیں۔ "آپ کہاں ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟"

اندر سے آواز آئی "لاحول ولاقوۃ آدمی ٹائلٹ میں اور کیا کرتا ہے۔"

"ایک خوشخبری ہے فوراً آئیں۔"

"ایک تو ویسے ہی قبض کی شکایت ہے اوپر سے فوراً بلا رہی ہو۔ خوشخبری وہیں سے سناؤ۔"

"میں شادی کے لیے راضی ہوں۔"

"ہوش میں تو ہو کس سے شادی کروگی۔"

"توبہ ہے میں شائستہ اور وکالت کی شادی کی بات کر رہی ہوں۔"

"واقعی! تم نے خوش کردیا۔"

"لیکن یہ شادی دو دن کے اندر ہوگی۔"

"ایسی جلدی بھی کیا ہے۔"

"میں چاہتی ہوں میرا بیٹا اپنے پیروں پر کھڑا ہوجائے۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ شادی کے دن کھڑا ہوجائے گا۔"

"کیا آپ تمام باتیں ٹائلٹ میں بیٹھ کر سمجھنا چاہتے ہیں؟"

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ انہوں نے باہر آکر کہا "تم عورتوں کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے۔ یہی بات کل مان لیتیں تو میں صداقت کی غلطی کو درگزر کردیتا پتا نہیں وہ ہے یا جاچکا ہے۔"

"وہ جاچکا ہے۔ میں وکالت کی بات کر رہی ہوں آپ صداقت کا ذکر چھیڑ رہے ہیں۔"

"وکالت کی بات ہوچکی ہے۔ تم اس کی شادی کر رہی ہو اور دو دن میں کر رہی ہو تاکہ وہ ذمے داریوں کو سمجھے اور کاروبار میں دلچسپی لے۔"

"یہی چاہتی ہوں مگر وہ آپ کا لاڈلا میرے لاڈلے کو مل میں برداشت نہیں کرے گا۔"

"نہ کرے میں وکالت کی شادی کے بعد اس کا حصہ الگ کردوں گا۔"

"حصہ برابر ہونا چاہیے ایک کا زیادہ اور دوسرے کا کم نہیں ہونا چاہیے۔"

"تم تو پیچھے پڑ جاتی ہو اسے پہلے پہل جو حصہ دیا جائے گا اس میں وہ منافع دکھائے خود کو زیادہ کا اہل ثابت کرے تو اسے زیادہ ملے گا۔"

بیگم نے سوچا اتنی سازشوں اور بھاگ دوڑ کے بعد صداقت گھر سے چلا گیا اور وکالت کو کچھ حصہ مل رہا ہے۔ ابتدا میں یہ بہت ہے۔ آگے اور بھی راستے کھلتے جائیں گے۔

دو دن بعد شادی نہ ہوسکی، دو ہفتے بعد ہوگئی صداقت نے اپنے ابا جان سے یہ طے کرلیا کہ وہ وکالت کی فیملی سے دور رہے گا۔ اس کوٹھی میں کبھی نہیں جائے گا۔ ایک باپ کے دو بیٹے الگ الگ گھر آباد کریں گے۔ ولایت علی نے کہا "یہی مناسب ہے میں آئے دن کے جھگڑوں سے تنگ آگیا ہوں۔ تم دونوں بھائی خواہ کتنی ہی دور رہو تمہاری اولادیں میرے ہی شجرے سے پھوٹنے والی شاخیں کہلائیں گی۔ تمہیں بھی اب جلد ہی گھر بسانا چاہیے۔"

"میں تو اپنی شادی کاروبار سے کرچکا ہوں۔ اس سے فرصت ملے گی تو ضرور گھر بسانے والی شادی کروں گا۔"

بیگم سعدیہ قدرے خوش تھیں قدرے ناخوش یوں بھی انسان ہر حال میں خوش نہیں رہتا۔ بیگم کی مسکراہٹوں کے پیچھے شائستہ کا ناقابل برداشت وجود چرکے لگا رہا تھا۔ یہ ایک آزمودہ گھریلو ٹوٹکا ہے کہ ابلے ہوئے انڈے کا چھلکا دھاگے سے باندھ کر دیوار پر لٹکا دیا جائے تو اس کمرے میں چھپکلی نہیں آتی۔ اگرچہ قیمتی پردوں اور مہنگی تصویروں سے سجی ہوئی دیواروں پر انڈے کے چھلکے بہت ہی برے لگتے ہیں تاہم چھپکلیوں سے نجات مل جاتی ہے۔ بیگم نے بھی صداقت سے نجات حاصل کرنے کے لیے شائستہ کو اپنے بیٹے کے گلے میں لٹکا دیا تھا۔ وہ آنکھوں میں کھٹکتی تھی اور کلیجے میں چبھتی تھی پھر بھی اسے برداشت کرنا پڑتا تھا۔

ولایت علی نے ایک صوبے میں اپنا مال سپلائی کرنے کی ذمے داری اور اس مال کی تمام آمدنی وکالت کے نام لکھ دی۔ شائستہ نے اس سے کہا "خود کو اہل ثابت کرنے کے لیے تمہیں وقت کے مطابق کام اور آرام کرنا ہوگا۔ اگر کام کے وقت دوستوں سے ملاقات کروگے یا تفریح کے لیے جاؤگے تو میں تم سے ناراض ہوجاؤں گی۔"

نئی دلہن کو ناراض نہیں کیا جاتا۔ اس نے وعدہ کیا کہ مستقل مزاجی سے کاروبار کرے گا۔ لیکن وہ وعدوں سے بہلنے والی نہیں تھی۔ یہ خوب سمجھتی تھی کہ بیوی پرانی ہوتی جائے تو شوہر اسے گھر کی چار دیواری تک محدود کردیتا ہے باہر کے معاملات میں اسے مداخلت کرنے نہیں دیتا۔ وہ ایسا وقت نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس لیے مختلف طریقوں سے اسے اپنا عادی بنانے لگی۔

کوئی چیز روز ملتی رہے تو اسے دیکھتے دیکھتے اکتاہٹ سی ہونے لگتی ہے اور وہ تھوڑی ملے پوری پلیٹ نہ ملے۔ ایک چمچہ ملے۔ پوری بوتل سامنے ہو اور ایک گھونٹ نصیب ہو تو اس کی ہوس اس کی طلب بڑھتی رہتی ہے۔ یہ تو انسانی فطرت ہے، بچے کو مقررہ مقدار میں دودھ دیا جائے اور بے وقت نہ پلایا جائے تو بچہ نارمل اور تندرست رہتا ہے اور ابتدا ہی سے بچے کو بے وقت کی بھوک برداشت کرنے کی عادت ہوتی جاتی ہے۔ شائستہ بلا کی ذہین تھی، وہ شادی شدہ بچے کو ایسی ہی حکمت عملی سے اپنا عادی بنا رہی تھی۔

وکالت چند ماہ تک ڈیوٹی کا پابند رہا۔ صبح مل کے دفتر میں جاتا تھا۔ شام کو واپس آتا

تھا۔ اس نے بڑی حد تک کاروبار کو سمجھتے ہوئے سابقہ منافع کو برقرار رکھا تھا۔ اگر یہی مستقل مزاجی ہوتی تو آئندہ منافع بڑھ سکتا تھا لیکن وہ کچھ غیر سنجیدہ ہونے لگا شائستہ اکثر اس سے فون پر گفتگو کرتی تھی۔ پھر کبھی کبھی چپراسی فون اٹینڈ کرنے لگا۔ کبھی معلوم ہوتا۔ صاحب بینک گئے ہیں، کبھی خبر ملتی کسی پارٹی سے ملنے گئے ہیں، کبھی وہ خود فون پر ملتا تھا اور بے حد مصروفیات اور الجھنوں کا ذکر کرتا تھا۔ شائستہ نے کہا "کل سے میں بھی دفتر جایا کروں گی۔"

"تم وہاں کیا کروگی؟"

"کام کروں گی۔ تمہارا بوجھ ہلکا کروں گی۔ مجھے اپنی تعلیم سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

"نہیں، یہ مناسب نہیں ہے۔ ولایت علی خان کی بہو دفتر میں آکر کام کرے گی تو لوگ کیا کہیں گے؟"

"میں ملازمت کروں گی تو باتیں بنائی جائیں گی اور اپنے میاں کا کاروبار سنبھالوں گی تو وہ مثالی عورت کہلاؤں گی جو اپنے شوہر کی ترقی کے راستوں پر شانہ بشانہ رہتی ہے۔"

"تم تو لاجواب کردیتی ہو لیکن یہ مجھے ذاتی طور پر اچھا نہیں لگتا۔"

"شروع میں یہ کاروبار بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ ابتدا میں اکثر باتیں بوجھ لگتی ہیں۔ پھر اس بوجھ کا احساس رفتہ رفتہ ختم ہوجاتا ہے تم اپنے ساتھ نہیں لے جاؤ گے تو میں پیچھے پیچھے چلی آؤں گی۔"

"مجھے یہ ضد پسند نہیں ہے تمہیں گھر سنبھالنا چاہیے۔"

"پہلے شوہر کو سنبھالنا چاہیے۔"

"کیا میں بھٹک رہا ہوں؟"

"اگر نہیں بھٹک رہے ہو گے تو پھر گھر سنبھالنا شروع کروں گی۔"

"میں نے ایک بار کہہ دیا ہے تم دفتر نہیں جاؤ گی۔"

وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی۔ وکالت نے پرواہ نہیں کی۔ وہ رات کو کھانے کی میز پر نہیں آئی۔ بیگم سعدیہ نے کہا "تم نے اسے سر پر چڑھا لیا ہے۔ خبردار! کھانے کے لیے اس کی خوشامد نہ کرنا۔"

اس نے بھی غصے میں فیصلہ کیا تھا کہ اسے نہیں منائے گا۔ پھر یاد آیا کہ آج جمعرات ہے۔ بھری مراد ہے۔ شب خیرات ہے۔ اگر یہ رات تنہائی میں گزرے گی تو پھر وہ اگلی جمعرات تک خیرات نہیں دے گی۔

اس کی اس حرکت پر وہ کڑھتا تھا۔ اسے سمجھاتا تھا، مناتا تھا، لڑتا جھگڑتا تھا۔ پھر تھک ہار کر سو جاتا تھا۔ اس نے انتقاماً سابقہ گرل فرینڈز سے دوستی کی تجدید کی۔ کاروباری مصروفیت کے وقت بے وقت کی مصروفیت میں پڑا۔ کچھ آرام آیا، کچھ شائستہ کی ضرورت ماند پڑی۔ لیکن یہ ایسی ہی بات تھی جیسے اسپرو کی ٹکیہ سے عارضی طور پر سر کا درد جاتا

ہے۔ پھر کسی وقت درد جکڑ لیتا ہے۔ یہی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ شائستہ دور رہ کر کیسے جکڑ لیتی ہے؟

اسے یہ تاریخی حقیقت یاد نہیں آتی تھی کہ آدمی ہزار ہا اشجار کے میوے کھالے پھر بھی شجر ممنوعہ کا بھوکا رہتا ہے۔ جو چیز دسترس سے دور رکھی جائے وہ انسان کو کھینچتی ہے۔ ایسی کتنی ہی سمجھ دار بیویاں ہیں جو شوہروں کو اپنی طرف کھینچنا جانتی ہیں اور بڑھاپے میں بھی انہیں سدا بہار نظر آتی ہیں۔

وہ کھانے کی میز سے اٹھ کر جانے لگا ماں نے پوچھا "کیا جورو کے پاس جارہے ہو؟"

"ہاں آج جمعرات ہے۔" وہ بے خیالی میں بول گیا۔

بیگم سعدیہ نے حیرانی سے دیدے پھاڑ کر پوچھا "ارے جمعرات ہے تو کیا ہوا؟ کیا تو فقیر کی اولاد ہے؟"

وہ فقیر کی اولاد ڈائننگ روم سے باہر جاچکا تھا۔ بیگم کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا کہ وہ کیسے جذب کے عالم میں مجذوب کی طرح جمعرات کی کرامات بیان کرگیا ہے۔"

جب وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ شائستہ تھی۔ اس نے ڈائننگ ٹیبل کے پاس شائستہ کو بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی۔ پھر خود بیٹھتے ہوئے کہا۔ "امی! میں نے سوچا ہے اپنی شائستہ کی تعلیم سے فائدہ اٹھایا جائے۔ کل جمعہ ہے پرسوں سے یہ میرے ساتھ دفتر جایا کرے گی۔"

بیگم نے گھور کر کہا "لڑکے! تھوڑی دیر پہلے کہہ رہا تھا۔ یہ کسی قیمت پر نہیں جائے گی۔ اپنی زبان سے کہہ رہا تھا' یہ سر پر چڑھ گئی ہے اور اتنی جلدی پھر سر پر چڑھا لایا۔"

شائستہ نے پوچھا "وکالت! سر میں کیا ہوتا ہے؟"

"بھیجا ہوتا ہے۔"

وہ بولی "یہاں سب کچھ ہے بھیجا نہیں ہے۔"

بیگم سعدیہ کڑک کر بولیں "تم مجھے طعنہ دے رہی ہو کہ میرے سر میں بھیجا نہیں ہے؟"

"میں کہہ رہی تھی یہاں گوشت وغیرہ کا سالن ہے بھیجا فرائی نہیں ہے۔ آپ تو عرصہ سے جانتی ہیں میں بڑے شوق سے بھیجا کھاتی ہوں۔"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر غصہ سے تلملاتی ہوئی جانے لگیں۔ ایسے وقت یہ ناز ہوتا ہے کہ بہو کے سامنے بیٹا روکے گا۔ لیکن پیچھے سے بیٹے کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ "سمجھ میں نہیں آتا امی! شائستہ کے بھیجا کھانے سے آپ چڑتی کیوں ہیں؟"

وہ پلٹ کر بولیں "یہ تیرا بھیجا تو کھا چکی ہے پھر تیری سمجھ میں کیا خاک آئے گا۔"

بیگم کو رونا آرہا تھا لیکن وہ بہو کو آنسو دکھا کر شکست کا اعتراف کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ اس لیے اپنے کمرے میں جاکر دروازے کو بند کرکے رونے لگیں۔

ایک بار کاتب تقدیر نے کہا "مانگ کیا مانگتا ہے بلندی یا طوالت؟"

انسان نے خوب سوچ سمجھ کر کہا "بلندی۔"

تب سے انسان کو مسرتوں کی بلندیاں ملتی ہیں مسرتوں کی طوالت نہیں ملتی۔ بیگم سعدیہ

کی بھی یہ بدبختی تھی۔ انہیں تمام مسرتیں حاصل ہوئی تھیں۔ سوتیلا ہمیشہ کے لیے چلا گیا تھا۔ سگا کاروبار سے لگ گیا تھا۔ وہ ایئرکنڈیشنڈ کوٹھی ائرکنڈیشنڈ کاروں اور ائرکنڈیشنڈ مسرتوں کی تجوری میں رہتی تھیں لیکن ان مسرتوں کو شائستہ کاٹتی رہتی تھی۔

دوسری صبح ناشتے کی میز پر ولایت علی بھی تھے۔ جمعہ کو مل بند رہتی تھی۔ اس لیے سب ہی ایک میز پر جمع ہوکر ہنستے بولتے تھے۔ ان کی بیٹی صائمہ اور داماد حشمت بھی شریک رہتے تھے۔ اس روز شائستہ نے ولایت علی سے کہا "ابا جان! آپ اصولوں کے پابند ہیں۔ آپ نے کتنوں کی زندگی کو خوشحال بنادیا ہے۔ مجھے بھی زمین سے آسمان تک پہنچا دیا ہے لیکن اپنی بیٹی اور داماد کے لیے کچھ نہیں کر رہے ہیں۔"

چونکہ یہ بات بیگم سعدیہ کی بیٹی کے حق میں تھی اس لیے وہ دل میں خوش ہوئیں۔ ولایت علی نے کہا "بیٹی! میں نے داماد صاحب کو مل میں بہت بڑا عہدہ دیا۔ وہاں یہ حضرت ناکام رہے۔ کاروبار کے لیے خاصی بڑی رقم دی۔ اسے انہوں نے ڈبو دیا۔ اب میں کیا کرسکتا ہوں؟ یہی آخری صورت ہے کہ یہ یہاں پڑے رہیں۔"

بیگم سعدیہ نے کہا "غلطی سب سے ہوتی ہے۔ ہمارے داماد سے بھی ہوگئی۔ آپ ایک بار پھر آزما کر دیکھیں۔"

شائستہ نے کہا "شادی کے بعد بیٹیاں سسرال میں اچھی لگتی ہیں۔ صائمہ تین برس سے میکے میں ہے۔"

بیگم نے تڑخ کر کہا "ہے تو کیا ہوا؟ یہ اس کے باپ کا گھر ہے۔"

شائستہ نے پوچھا "صائمہ کے شوہر کا گھر کہاں ہے؟ میں فخر سے کہتی ہوں کہ یہ میرے شوہر کا گھر ہے۔ کیا آپ کی بیٹی کو یہ فخر حاصل ہے؟ اگر نہیں ہے تو آپ نے اور ابا جان نے بیٹی سے یہ فخر چھین لیا ہے۔"

وکالت نے ڈانٹ کر کہا "تم ابا جان کی شان میں گستاخی کر رہی ہو۔"

بیگم نے بیٹے سے کہا "تم نے اسے اتنا سر پر چڑھایا ہے کہ اب یہ تمہارے باپ کو طعنے دینے لگی ہے۔"

ولایت علی نے گرج کر کہا "خاموش رہو۔ شائستہ نے گالی نہیں دی ہے۔ یہ جو کہہ رہی ہے اس پر غور کرو۔ ہماری بیٹی کو شادی کے تین سالوں میں کیا حاصل ہوا ہے۔ کیا یہ رشتے داروں کو اور اپنی سہیلیوں کو فخر سے کہہ سکتی ہے کہ اس کا اپنا ایک گھر ہے؟ کیا یہ کہہ سکتی ہے کہ اس کا شوہر بہت بڑا افسر یا معروف بزنس مین ہے؟"

بیگم نے کہا "نہیں ہے تو آپ بنا سکتے ہیں۔"

شائستہ نے کہا "نہیں بناسکتے جب تک حشمت بھائی پر ذمے داریوں کا بوجھ نہیں پڑے گا' یہ محنت نہیں کریں گے۔ سسرال سے محنت کے بغیر رقم ملتی رہے گی تو پھر یہ کوئی کام

کیوں کریں گے؟"

حشمت نے کہا "بھابی! آپ میری انسلٹ کر رہی ہیں۔"

"اگر محنت مزدوری کی بات کرنے سے انسلٹ ہوتی ہے تو وکالت کو بھی کام نہیں کرنا چاہیے گھر میں بیٹھ کر اباجان کی کمائی کھانا چاہیے۔"

وکالت نے کہا "شائستہ کی باتیں پہلے بری لگتی ہیں۔ پھر دل پر اثر کرتی ہیں۔ پہلے میں بھی نکما تھا کاروبار سے اور محنت سے دور بھاگتا تھا۔ میری بیوی نے میری زندگی کا رخ بدل دیا ہے۔ صائمہ بھی حشمت بھائی کو ہماری راہ پر لگا سکتی ہے۔"

حشمت نے کہا "امی اور اباجان جو فیصلہ کریں گے میں اس پر عمل کروں گا۔"

بیگم نے کہا "میں کہتی ہوں، حشمت کو مل میں پھر ایک موقع دیں۔ یہ بھی وکالت کی طرح صبح جائے گا شام کو آئے گا۔"

شائستہ نے کہا "یہاں رہیں گے تو آرام طلب رہیں گے۔ ائرکنڈیشنڈ کمرے سے نکلنے کو جی نہیں چاہے گا۔ حشمت بھائی جب تک اپنی محنت سے ایک مکان نہ بنالیں تب تک کرائے کے مکان میں رہیں۔"

"تم کون ہوتی ہو میری بیٹی داماد کو کرائے کے مکان میں بھیجنے والی؟ تمہارا کون سا گھر تھا۔ فٹ پاتھ سے یہاں آئی ہو۔ رہنے کو کوٹھی مل گئی ہے تو لمبی لمبی باتیں کرنے لگی ہو۔"

شائستہ نے ولایت علی سے کہا "ابا جان! امی کو سمجھائیں کہ میں نے حکم نہیں دیا ہے مشورہ دیا ہے۔ رہ گئی فٹ پاتھ سے یہاں آنے والی بات تو اس سے صائمہ اور حشمت کو سیکھنا چاہیے کہ میں چھوٹی سے بڑی اور معمولی سے غیر معمولی کیسے ہوگئی۔"

وکالت نے کہا "امی آپ نے طعنہ دیا تھا لیکن شائستہ نے اسی بات کو سبق آموز بنا دیا ہے۔ اچھا سبق سیکھنے میں آپ کی بیٹی کی بھلائی ہے۔"

وہ غصے سے بولیں "بہن کو گھر سے نکال دینے میں بھلائی ہے تو ماں کو بھی نکال دو۔ بیوی کے کلیجے کو ٹھنڈک پہنچانے کے لیے ایسی ہی بھلائیاں کرتے رہو۔"

ولایت علی نے کہا "بیگم! فضول باتوں سے کام کی باتیں پیچھے رہ جاتی ہیں اور کام کی بات یہ ہے کہ کل سے حشمت مل کے دفتر میں کام کرے گا۔ اسے تنخواہ کے علاوہ مکان کا کرایہ بھی دیا جائے گا۔"

وہ ناشتے کی میز پر سے اٹھتے ہوئے بولے "حشمت! مکان کا کرایہ ایک ہزار روپے ماہانہ سے زیادہ نہ ہو۔ ایک ماہ کے اندر مکان تلاش کرکے صائمہ کے ساتھ وہاں منتقل ہوجاؤ۔"

یہ حکم دے کر وہ چلے گئے۔ بیگم نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چمچے کو پلیٹ پر پٹختے ہوئے کہا "میں اس گھر میں نہیں رہوں گی۔ اپنی بیٹی کے ساتھ ہی چلی جاؤں گی۔ یہ گھر اب رہنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ پہلے اس نے میرے بیٹے پر جادو کیا۔ اب میرے شوہر پر بھی کر

رہی ہے۔"

شائستہ نے میز پر سے اٹھتے ہوئے ملازم سے کہا "عبدل! باورچی سے کہو میں آج لنچ میں بھیجا فرائی کھاؤں گی۔"

اس خصوصی ڈش کا مطلب بیگم خوب سمجھتی تھیں اور کوئی توجہ نہیں دیتا تھا کہ وہ کس کا بھیجا کھایا کرتی ہے۔ اس وقت یہ سن کر بیگم کو سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی۔ وہ چیخنے لگیں۔ برتن اٹھا کر پھینکنے لگیں۔ قسمیں کھاتے ہوئے کہنے لگیں کہ اس گھر میں وہ رہیں گی یا شائستہ اور اگر شائستہ رہ گئی تو اسے زندہ نہیں چھوڑیں گی۔

وہ آگ لگا کر جاچکی تھی۔ بیگم جلتے کڑھتے ہوئے سوچ رہی تھیں کہ آج یہ نند کو گھر سے نکال رہی ہے۔ کل ساس کو بھی دھکے دے کر بے گھر کرے گی۔ وہ بہو سوتیلے بیٹے سے زیادہ خطرناک ہوگئی تھی۔ اس سے تو سوتیلا ہی بھلا تھا۔ مگر اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ یوں ایک اور بات سمجھ میں آئی کہ سوتیلے نے اس لڑکی کو ان کی بہو بنا کر چالاکی دکھائی ہے۔ زندگی بھر کا عذاب ان پر نازل کردیا ہے۔

بیگم نے بڑی بھاگ دوڑ کی۔ ولایت علی سے کہا۔ حشمت کو ضرور کام کرنا چاہیے لیکن بیٹی کو گھر سے بے گھر نہ کریں لیکن ٹکا سا جواب ملا کہ یہ بیٹی کا گھر نہیں ہے۔ اسے شوہر کے ساتھ اپنا گھر بنانے دیا جائے۔ پھر یہ بھی سمجھایا کہ بیٹی اپنے ماں باپ کی زندگی تک ہی میکے میں جبرا" رہتی ہے پھر بھائی اور بھاوج اسے ایک دن بھی ٹکنے نہیں دیتے۔

صائمہ بھی میکے سے نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس نے بھائی سے التجا کی بھابی کے خلاف کان بھرے۔ وکالت نے کہا شائستہ میں کوئی خرابی ہے تو اسے میں بھگت لوں گا لیکن تمہاری بھلائی علیحدگی میں ہے۔ میکے والوں سے علیحدہ رہو۔ ہم تمہاری خیریت معلوم کرتے رہیں گے اور برے وقتوں میں تمہاری مدد کرتے رہیں گے۔ تمہاری بہتری کے لیے دانشمندانہ فیصلہ ہوچکا ہے۔ اس پر عمل ضروری ہے۔"

آخر ایک ماہ بعد بیگم کی بیٹی اور داماد گھر سے چلے گئے۔ حشمت سے عیش و عشرت کی زندگی چھوٹی تو وہ مجبورا" کام کرنے لگا۔ مہینے اور سال گزرنے لگے۔ کبھی صائمہ روتی دھوتی آتی تھی کبھی بیگم بیٹی کے گھر جاتی تھیں۔ چوری چھپے رقم دے کر اس کی مدد کرتی تھیں اور شائستہ کو گالیاں دیتی رہتی تھیں۔

گالیاں پڑنے کے باوجود بہو پھل پھول رہی تھی۔ ساس اور نند فکر اور پریشانی سے سوکھ رہی تھیں۔ ایک بچے کے بعد صائمہ کی صحت اور گرگئی۔ بیگم نے نواسے کو گود میں لے کر کہا "ایسی دکھ بیماریوں میں اسے تم کیسے سنبھالوں گی؟ میں صبح شام تمہارے پاس نہیں رہ سکتی۔ حشمت کی آمدنی اتنی نہیں ہے کہ ایک آیا رکھ سکے۔ وہ کلموہی مرتی بھی نہیں ہے۔ مرے گی تو نیاز کی سو دیگیں پکواؤں گی۔"

صائمہ نے کہا "وہ کوسنے سے نہیں مرے گی' آپ تدبیر سے کام لیں۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کیا تدبیر کروں؟"

"آپ نے نواسے کو گود میں لیا ہوا ہے کیا گود میں پوتے کو کھلانے کا ارمان نہیں ہے؟"

"ضرور ہے مگر وہ تو ..."

"ماں نہیں بن رہی ہے۔ چار برس ہوگئے۔ خاندان کا ایک وارث پیدا نہیں ہوا اور آپ چپ بیٹھی ہیں۔"

بیگم سعدیہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ شائستہ کی بہت بڑی کمزوری ہاتھ آئی تھی۔ وہ ماں نہیں بن رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ بانجھ ہے ورنہ کھیتی کو ہری ہونے میں چار برس نہیں لگتے۔

بیگم نے پہلے یہ بات ولایت علی کے کانوں میں ڈالی۔ "کیوں جی! آپ کا کوئی نام لیوا اس گھر میں نہیں آئے گا؟"

"بھئی میرا نام لینے والے دو بیٹے ہیں۔"

"کیا بیٹے کے بیٹے نہیں ہوں گے؟ یہ نسل یہیں رک جائے گی؟ آپ کو پوتے پوتیوں کا ارمان نہیں ہے؟"

وہ گہری سنجیدگی سے بولے "ہاں ہے تو سہی۔ بیٹا اور بہو اس معاملے میں کچھ بے پرواہ ہیں۔"

"یہ بے پروائی نہیں قدرت کی مار ہے۔ بہو بانجھ ہے۔ اگر بانجھ نہ ہوتی تو چار برس میں چار ہو جاتے۔"

"بھئی میں اس معاملے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ بیٹے سے معلوم کرو کہ ہمیں اور کتنا انتظار کرنا ہوگا؟"

"انتظار بہت ہوچکا ہے۔ اگر اولاد اب نہ ہوئی تو میں دوسری بہو لے آؤں گی۔"

"ہاں۔ صداقت بھی عرصے سے ٹال رہا ہے۔ اس کی بھی بہو آنی چاہیے۔"

"دوسری بہو کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں صداقت کی دلہن لانا چاہتی ہوں۔ جب وہ الگ رہتا ہے اور الگ گھر بسائے گا تو اس کی اولاد سے مجھے کیا دلچسپی ہوگی۔"

"اچھا تو تم شائستہ پر سوکن لانا چاہتی ہو؟"

"ہاں ڈنکے کی چوٹ پر لاؤں گی آپ میری حمایت کریں گے۔ بیٹے کو تسلیم کرنا ہوگا کہ خاندانی شجرہ قائم رکھنے اور آگے بڑھانے کے لیے اولاد ضروری ہے۔ اولاد ایک بیوی سے نہ ہو تو مذہب اور قانون کے مطابق دوسری شادی کی جاسکتی ہے۔"

"جائز بات سب کے لیے قابل قبول ہوتی ہے۔ جب بھی شائستہ جائز اور معقول باتیں

کرتی ہے۔ میں تمہاری ناراضگی کی پرواہ کیے بغیر وہ باتیں مان لیتا ہوں۔ آج تمہاری باتیں معقول ہیں۔ جاؤ بیٹے سے بات کرو۔"

"مجھے کہیں جاکر بات نہیں کرنی ہے۔ یہیں آپ کے سامنے کروں گی۔"

وہ ملازمہ کو بلا کر بولیں "وکالت سے کہو اس کے ابا جان تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں' ابھی اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔"

ملازمہ جانے لگی تو روک کر تاکید کی "اور سنو۔ بہو بیگم سے یہ نہ کہنا' میں یہاں موجود ہوں۔"

"جی بیگم صاحب بہو بیگم سے نہیں کہوں گی۔"

ملازمہ کے جانے کے بعد ولایت علی نے مسکرا کر کہا "بہو سے ڈرتی ہو؟"

"ڈرے گی میری جوتی۔ میں نے تو اس لیے جھوٹ بولنے کو کہا ہے کہ سچ معلوم ہوگا تو وہ میری بات کاٹنے یہاں دوڑی آئے گی۔"

بیگم! ایک بات یاد رکھو۔ بات سچی اور کھری ہو تو اسے کوئی نہیں کاٹ سکتا اور نہ ہی بات بنا کر وہ بات بدل سکتا ہے۔ سچائی کی یہی طاقت ہے کہ وہ بدلتی نہیں ہے۔"

"پھر بھی آپ اس گھر کے بڑے ہیں۔ آپ بیٹے سے یہ دوسری شادی والی بات منوالیں۔ میں آپ کی کنیز بن کر رہوں گی۔"

"آج کل تم کیا ہو؟"

"چھوڑیں مذاق نہ کریں۔ مجھے اپنے بیٹے کی اولاد چاہیے۔"

"وہ تو مجھے بھی چاہیے۔ لیکن دوسری بھی بانجھ نکلی تو؟"

"تو تیسری بہو لاؤں گی۔ چوتھی لاؤں گی۔ آپ بدشگونی والی باتیں نہ کریں۔ اللہ نے چاہا تو آپ کا خاندانی شجر پھلتا پھولتا جائے گا۔"

وکالت نے آکر سلام کیا' باپ نے کہا "آؤ بیٹھو ابھی ہم شجر کی باتیں کر رہے تھے۔ خاندانی شجری باتیں ......"

بیگم سعدیہ نے دروازے کی طرف دیکھا۔ اطمینان نہیں ہوا۔ اٹھ کر دروازے سے باہر آئیں۔ ادھر شائستہ نہیں تھی۔ انہوں نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے شوہر سے پوچھا "کیا کہہ رہا ہے ہمارا بیٹا؟"

"میں سمجھ رہا ہوں امی! یہ تو اللہ دیتا ہے۔ ایک دروازے سے نہ ملے تو دوسرے دروازے سے دیتا ہے۔ بہو بانجھ ہے تو کوئی بات نہیں میں دوسری لے آؤں گی۔"

جی؟ مم ...... مگر......"

مگر کیا؟ تمہاری بیوی مگرمچھ ہے کہ تمہیں کھا جائے گی۔"

یہ بات نہیں ہے۔"

"پھر کیا بات ہے؟ اعتراف کیوں نہیں کرتے کہ اس سے ڈرتے ہو۔"

"امی وہ بانجھ نہیں ہے۔"

"کیا اس نے تمہیں سمجھایا ہے۔"

اس نے سر جھکا لیا۔ ماں نے پوچھا "کیا اس نے میڈیکل چیک اپ کرایا ہے؟"

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ اس بار ولایت علی نے کہا۔ "ہمارے خاندان میں کسی بزرگ نے دو شادیاں نہیں کیں۔ شاید اس لئے کہ ضرورت پیش نہیں آئی۔ پہلی منکوحہ سے ہی اولادیں ہوتی رہیں' میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"جی!" اس نے پھر سر جھکا لیا۔

"اس سے کہو۔ ہم اور چھ ماہ انتظار کریں گے۔ اس کے بعد تمہاری دوسری دلہن لائی جائے گی۔"

بیگم سعدیہ نے کہا "تم اس کی باتوں میں نہ آنا۔ وہ باتوں سے جیت جاتی ہے۔ تم سے یہ ضرور کہے گی کہ دوسری سے بھی اولاد نہ ہوئی تو کیا کرو گے؟ اس سے کہہ دینا دوسری کو طلاق دے دو گے۔ لیکن شادی ضرور کرو گے۔"

"جی اچھا۔" وہ جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

"صرف جی اچھا کہنے سے بات نہیں بنے گی۔ مرد بنو مرد' کیا بیوی کے سامنے اسی طرح جی اچھا کہو گے۔"

"جی نہیں۔"

بیگم اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آئیں۔ پھر محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر بولیں۔ "میری نظروں میں ایک سے ایک حسین لڑکیاں ہیں۔ دیکھو گے تو دیکھتے ہی رہ جاؤ گے۔ جس کی طرف انگلی اٹھاؤ گے اسے دلہن بنا کر لے آؤں گی۔"

وہ کمرے سے جانے لگا۔ بیگم اس کے ساتھ چلتی ہوئی دروازے تک آ کر بولی "بیٹا! تمہیں میری قسم ہے' بس فولاد بن جاؤ۔ تن کر کہہ دو کہ بس تمہیں اولاد کی سخت ضرورت ہے۔ اس لئے دوسری دلہن ضرور لاؤ گے۔ ضرور' ضرور لاؤ گے۔ وہ راستے کا پتھر بنے تو اسے راستے سے ہٹا دیں گے۔"

وہ سمجھاتے ہوتے دروازے سے باہر آ گئیں۔ پیچھے سے ولایت علی نے آواز دی۔ " بیگم! واپس آ جاؤ۔ وہاں سے بہو کی سرحد شروع ہونے والی ہے۔

وہ واپس آئی' دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھا کر کچھ کہنا چاہا تو ولایت علی نے کہا "کیا کرتی ہو کعبہ ادھر ہے۔"

وہ ادھر گھوم گئیں۔ آج انہیں جدھر گھمایا جاتا' ادھر گھوم جاتیں۔ گھوم گھوم کر تمام مزاروں پر دعائیں مانگتیں۔ پوتوں اور پوتیوں کے لئے نہیں ایک اور بہو کی آمد کے لئے

دعائیں مانگتیں۔ ایک خنجر سے موت آ رہی ہو تو دوسرے خنجر سے زندگی نہیں ملتی لیکن ساس ایک سے زخم کھاتے کھاتے دوسری بہو ضرور مانگتی ہے۔

وکالت اپنے بیڈ روم میں آیا۔ وہ ہچکچا رہا تھا کہ دوسری شادی کی بات کیسے چھیڑے؟ وہ شائستہ سے متاثر بھی تھا۔ دل میں آتش بازی ہونے لگی تھی۔ پتا نہیں ماں نے کتنی حسین لڑکیاں دیکھی تھیں۔ وہ بھی دیکھنے اور کسی ایک کو جیت لینے کے لئے بے چین ہو گیا تھا۔

شائستہ نے پوچھا "کیا بات ہے؟ ابا جان نے کیوں بلایا تھا؟"

وہ پلنگ پر بیٹھتے ہوئی بولا "وہ پوچھ رہے ہیں' کروڑوں روپے کی دولت اور جائیداد کا وارث کب آئے گا۔"

"تم نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے تو کہا تھا جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا لیکن امی کہتی ہیں ......"

"اچھا تو امی بھی موجود تھیں۔ پھر تو خوب گل کھلے ہوں گے۔ میرے خلاف محاذ قائم ہو چکا ہے۔"

"کیا یہ بات تمہارے خلاف ہے کہ اولاد لازمی ہے؟"

"جب تک ماں نہ بنو' یہ میرے خلاف ہے۔"

"پھر کب بنو گی' چار برس گزر چکے ہیں۔ یہ پانچواں چل رہا ہے ابا جان نے صاف کہہ دیا ہے کہ وہ اور چھ مہینے انتظار کریں گے اس کے بعد ...... وہ رک گیا۔

شائستہ نے پوچھا "اس کے بعد؟"

"وہ دوسری بہو لائیں گے۔"

"تم کیا کہتے ہو؟"

"مجھ سے کیا پوچھتی ہو؟ کیا مجھے بچوں کا ارمان نہیں ہے' کیا میں باپ بننا نہیں چاہتا؟"

"اگر میڈیکل رپورٹ کہہ دے کہ تم باپ بن سکتے ہو اور میں ماں نہیں بن سکتی تو تمہیں دوسری شادی کی اجازت دے دوں گی۔ اپنی ماں سے جا کر کہہ دو' اس کے بغیر وہ مجھ پر سوکن لانے کے خواب دیکھتی رہ جائیں گی۔"

"تم جھگڑا بڑھا رہی ہو۔"

"اگر قانونی تقاضے پورے نہ کئے گئے تو جھگڑا بڑھے گا اور میں جانتی ہوں' تمہاری امی بیگم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئیں گی۔ اس لئے کل صبح ایک وکیل سے رابطہ کروں گی۔ وہ تمہیں نوٹس بھیجے گا کہ دوسری شادی سے پہلے میری اور تمہاری میڈیکل رپورٹ حاصل کرنا لازمی ہے۔"

وہ سمجھ رہا تھا' بات بہت بڑھے گی۔ اس مسئلے پر تمام رات لڑائی ہوتی رہے گی۔ پھر گھر کی چاردیواری میں ساس بہو کے فسادات برپا رہیں گے لیکن شائستہ نے میڈیکل رپورٹ کی بیخ لگا کر بات ختم کر دی۔

بات کیسے ختم ہو سکتی تھی۔ ماں نے ایک حسین دلہن کی رشوت پیش کی تھی۔ وہ چاہتا تھا' دلہن کسی طرح آ جائے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اس لئے وہ پھر ماں کے پاس آیا اور شائستہ کی قانونی دھمکی سنائی۔

وہ سن کر بولیں۔ "کمبخت' نئے نئے' نکتے پیش کرتی ہے۔ بچاؤ کے ہتھکنڈے استعمال کر رہی ہے۔ تم اس کی باتوں میں نہ آنا۔ طبی معائنہ کبھی نہ کرانا۔"

"طبی معائنے میں مضائقہ کیا ہے؟ ہونے دیں۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔"

"اگر وہ دودھ ہوئی اور تو پانی نکلا تو کیا ہوگا؟"

"آں؟" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

ماں نے پھر للچایا "کیا تو نئی دلہن نہیں چاہتا؟ کیا شائستہ سے لاکھ درجے حسین لڑکی تیری زندگی میں آ رہی ہو تو تو نادانی سے اس کا راستہ روک دے گا؟"

وہ ماں کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولا "نہیں امی' یہ شائستہ بڑا رعب دکھاتی ہے۔ ہمیشہ اپنی باتیں منواتی ہے۔ مجھے ایسی بیوی چاہئے جس سے میں اپنی باتیں منوا سکوں۔"

"میں اپنے شہزادے کے لئے ایسی ہی شہزادی لاؤں گی۔ بس تو ایک فیصلے پر جم جا کہ طبی معائنہ نہیں کرائے گا۔"

"آپ کی قسم میڈیکل رپورٹ نہیں لوں گا۔ آپ نے لڑکی کہاں دیکھی ہے؟"

"میں کل ہی اپنے بیٹے کو دکھاؤں گی۔ دوا پر نہیں ماں کی دعا پر بھروسا رکھو۔ دوسری سے تمہاری اولاد ضرور ہو گی۔"

"ہاں ماں کی دعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں۔ میں شائستہ کی باتوں میں نہیں آؤں گا۔"

"اسے سمجھاؤ دوسری شادی کرنے سے اسے نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس کے حقوق اسے ملتے رہیں گے۔؟"

وہ چلا گیا۔ بیگم سعدیہ کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ اگر بیٹا بانجھ نکلا تو بہو کی حیثیت صفر کرنے کا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ بیٹے میں باپ بننے کی صلاحیت ہو یا نہ ہو شائستہ پر سوکن کا عذاب لانا ضروری تھا۔ وہ نئی بہو کو دوست بنا کر کسی موقع پر پہلی کو طلاق دلا سکتی تھیں۔ جیسے کچرے کی طرح اس گھر میں آئی تھی اسی طرح باہر پھینکی جا سکتی تھی۔

اس سلسلے میں شائستہ طبی معائنے پر زور دینے والی تھی۔ اس کا یہ زور توڑا جا سکتا تھا اگر وکالت کے دل و دماغ میں نئی عورت کے حصول کا شوق اتنا مستحکم ہو جاتا کہ دوسری

شادی اس کی ضد بن جاتی۔

دوسرے دن ولایت علی نے بیگم سے کہا "آج دفتر میں صداقت سے میری گفتگو ہوئی تھی۔ میں نے وکالت کی دوسری شادی کی بات چھیڑی تھی۔"

بیگم نے کہا۔ "آپ ہمارے معاملے میں اس سے گفتگو نہ کیا کریں۔"

"کیوں نہ کروں؟ وہ ذہین ہے۔ خاندان کی بہتری کو سمجھ کر ذمے واری سے گفتگو کرتا ہے۔ جانتی ہو اس نے کتنی اچھی بات کہہ دی ہے؟"

"وہ میرے بیٹے کی خوشی نہیں دیکھ سکتا۔ اس نے دوسری شادی پر اعتراض کیا ہوگا۔"

"اس کا اعتراض غلط نہیں ہے۔ ہمارے خاندان میں کبھی کسی نے دوسری شادی نہیں کی۔"

"لیکن یہاں اولاد کا مسئلہ ہے۔"

"صداقت نے یہ مسئلہ حل کر دیا ہے۔ وہ شادی کرنے پر راضی ہو گیا ہے۔"

"کیا؟" بیگم نے اس پہلو سے تو سوچا ہی نہیں تھا کہ بڑے سے اولادیں ہوں گی تو چھوٹے کی دوسری شادی ضروری نہیں سمجھی جائے گی۔ صداقت نے پہلے تو شادی سے انکار کر کے شائستہ کو ان کے سر منڈھ دیا تھا۔ اب اپنی شادی اور اولاد کی باتیں کر کے ان کے منصوبے کو سبوتاژ کر رہا تھا۔

وہ ناگواری سے بولیں "کیا آپ چاہتے ہیں بڑے ۔ اولاد ہو اور میرے بیٹے سے نہ ہو۔ میرے بیٹے کے بچے میری گود میں نہ کھیلیں۔"

"میں نے کب انکار کیا ہے۔ صداقت کو شادی کرنے دو۔ سال دو سال میں اس کی اولاد ہو گی۔ تب تک ہو سکتا ہے شائستہ کی کی بھی گود بھر جائے۔"

"میں دو سال انتظار نہیں کروں گی۔"

"صداقت میری اولاد کی خوشیاں پوری کرنے کی خاطر شادی کے لئے راضی ہو گیا ہے۔ اگر تم وکالت کی دوسری شادی کرو گی تو وہ اپنا معاملہ ٹال دے گا۔ تم دیکھ رہی ہو کہ وہ یہاں سے جانے کے بعد تنہا زندگی گزار رہا ہے۔ اس کی زندگی میں کسی کو آنے دو۔ وکالت کے لئے جلدی نہ کرو۔"

بیگم کو واضح طور سے شکست کے آثار نظر آ رہے تھے۔ صداقت نے شائستہ کی پوزیشن مضبوط کر دی تھی۔ اب تو لے دے کر وہی ایک راستہ رہ گیا تھا کہ وکالت دوسری شادی کے لئے ضدی اور خود سر ہو جائے۔ بیوی ہو' باپ ہو' دنیا ہو' کسی کو خاطر میں نہ لائے اور جلد سے جلد شادی کر لے۔ بعد میں جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

وکالت شام کو چھ بجے مل سے واپس آتا تھا۔ بیگم سعدیہ نے پانچ بجے فون پر بیٹے سے کہا "میری ایک سہیلی ہے۔ اس کی تین بیٹیاں ہیں۔ تینوں لا جواب ہیں۔ دیکھنے سے تعلق

رکھتی ہیں۔ دیکھنا چاہتے ہو تو دفتر ہی میں رہو میں ایک گھنٹے بعد آ کر تمہیں سہیلی کے گھر لے جاؤں گی۔ میرا انتظار کرو گے؟"

وہ بھلا انتظار کیسے نہ کرتا؟ بچے کو مٹھائی اور جوان کو لگائی ملنے والی ہو تو وہ ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر انتظار کرتے ہیں۔ ماں نے ایک گھنٹے بعد آنے کو کہا تھا۔ وہ پہلے ہی کام چھوڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ بار بار گھڑی کو دیکھنے لگا تھا۔ بیگم نے دو گھنٹے بعد آ کر کہا۔ "لڑکی والے ضد کر رہے تھے کہ ہم رات کا کھانا ان کے ساتھ ضرور کھائیں۔ میں نے سوچا ایسی بات ہے تو ہمیں ذرا دیر سے جانا چاہئے اور لڑکی والوں کو انتظار بھی کرانا چاہئے۔ اس طرح لڑکے کی اہمیت بڑھتی ہے۔"

"امی! آپ نے مجھے بھی انتظار کرایا ہے۔ پلیز! اب چلیں۔"

وہ دفتر سے باہر آئے۔ ماں نے بیٹے کے ساتھ کار میں بیٹھتے ہوئے کہا "واپسی میں کافی رات ہو جائے گی شائستہ سے کیا کہو گے؟"

"میں اس سے نہ ڈرتا ہوں نہ اس کے آگے جوابدہ ہوں۔ پھر میں اپنی ماں کے ساتھ ہوں۔ وہ اعتراض کرے گی تو منہ توڑ دوں گا۔"

بیگم نے دل میں کہا "اللہ کرے وہ وقت آئے جب یہ دوسری کے سامنے پہلی کا منہ توڑے۔ میں نیاز کی سو دیگیں پکواؤں گی۔"

پھر یاد آیا کہ سو دیگوں کی منت پہلے ہی مان چکی ہیں اور سو بہت ہوتی ہیں۔ انہوں نے سوچ کر عہد کیا کہ سو ایک دیگیں پکوا کر غریبوں میں کھانا تقسیم کریں گی۔

وہ ایک مکان میں پہنچے۔ وہ مکان کوئی آدھی صدی پرانا ہوگا۔ اس کی دیواریں رنگ و روغن کے لئے ترس رہی تھیں۔ ایک سیکنڈ ہینڈ کار احاطے میں کھڑی ہوئی تھی۔ گھر کے مکین نے باہر آ کر اپنی بیگم کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ بیگم سعدیہ نے ان سے بیٹے کا تعارف کرایا۔ بیٹے نے دلہا کے انداز میں شرما کر سلام کیا۔ پھر وہ اندر آ گئے۔

اس مکان کو اندر سے پرانے فرنیچر کے ذریعے سجانے اور رئیسانہ انداز اپنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ کمرے میں ایک ٹیلیفون تھا۔ خاتون نے بیٹھتے ہی باتوں باتوں میں بتایا کہ ٹیلی فون شام سے خراب پڑا ہے۔ بعد میں کار کے متعلق بھی معلوم ہوا کہ اس میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے' کسی مکینک کو بلایا گیا ہے۔ قالین پر چلنے سے پتا چلتا تھا کہ نیچے کہیں کہیں فرش ٹوٹا ہوا ہے۔ اس کا عیب چھپانے کے لئے جو قالین بچھایا گیا تھا وہ بھی لنڈے بازار کا تھا۔

رات کے وقت ٹی وی آن رہتا ہے لیکن وہ بند تھا۔ اس پر غلاف پڑا ہوا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی قابل دید ہے۔ وہاں کی ہر مہنگی چیز محض نمائش کے لئے تھی۔ خاتون نے بیگم سعدیہ سے کہا۔ "بیٹے وکالت کو یہاں بیٹھنے دیں۔ ہم دوسرے کمرے میں چلتے ہیں۔"

لڑکیوں کے ماں باپ بیگم سعدیہ کے ساتھ دوسرے کمرے کی طرف گئے۔ اسے تنہا چھوڑ دیا لیکن ایک منٹ بعد ہی تنہائی ختم ہو گئی۔ ایک نوجوان لڑکی نے آ کر اسے سلام کیا۔ پھر اس کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی "میرا نام نعمانہ ہے۔"

وہ بولا "میرا نام وکالت علی ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔"

"کیسے جانتی ہو؟"

"آپ کی امی نے آپ کی تصویر ہماری امی کو دی تھی۔ اسے ہم تینوں نے دیکھا ہے۔"

"تینوں کون؟"

"میری اور دو بہنیں ہیں۔ وہ آ گئیں۔"

دو نوجوان لڑکیاں اندر آئیں۔ وہ تینوں کچھ زیادہ حسین نہیں تھیں۔ پھر بھی پرکشش اور بھرپور تھیں۔ البتہ شائستہ سے کم تر تھیں۔ اس وقت برتر لگ رہی تھیں کیونکہ شائستہ بیوی تھی۔ استعمال شدہ تھی اور وہ تینوں نئی' ان چھوئی اور تازہ تھیں۔ انہیں دیکھ کر شائستہ باسی لگ رہی تھی۔

ایک نے اپنا نام رضوانہ اور دوسری نے رخسانہ بتایا وہ ایک ٹھنڈی بوتل' ایک گلاس میں شربت اور ایک کپ چائے لائی تھیں۔ نعمانہ نے کہا "چائے میری طرف سے ہے۔ شربت رضوانہ کی طرف سے اور ٹھنڈی بوتل رخسانہ لائی ہے۔ آپ ان میں سے جس کی چیز قبول کریں گے وہ یہاں رہے گی' باقی دو چلی جائیں گی۔"

وکالت تینوں کو دیکھنے لگا۔ اتنی جلدی فیصلہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ان میں سے کون اچھی' کون بہتر اور کون بہترین ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک کبھی اسے اور کبھی اسے پسند کرتا رہا۔ پھر بولا "میں امتحان نہیں دے سکتا تھا۔ اس لئے تعلیم پوری نہیں کی۔ یہاں بھی امتحان میں پڑ گیا ہوں۔"

رخسانہ نے کہا "ایسی کیا مشکل ہے کہ انتخاب نہیں ہو رہا ہے؟"

"مشکل یہ ہے کہ میں بوتل بھی پیتا ہوں' شربت بھی اور چائے بھی اگر تین منٹ کے اندر تینوں پی لوں تو؟"

وہ کھکھلا کر ہنسنے لگیں۔ رضوانہ نے کہا "میں مشکل آسان کر دیتی ہوں۔ آپ فی الحال کسی ایک کا انتخاب کریں۔ بعد میں احساس ہو کہ انتخاب غلط تھا تو شادی تک فیصلہ بدلا جا سکتا ہے۔"

"پھر تو یہ مرحلہ آسان ہو گیا۔ میں پہلے تمہیں ہی پسند کرتا ہوں۔"

اس نے شربت کا گلاس اٹھایا۔ نعمانہ اور رخسانہ وہاں سے چلی گئیں۔ رضوانہ نے

مسکرا کر پوچھا "مجھ میں ایسی کیا بات ہے؟"

اس نے شربت کا گلاس اٹھایا۔ نعمانہ اور رخسانہ وہاں سے چلی گئیں۔ رضوانہ نے مسکرا کر پوچھا۔ "مجھ میں ایسی کیا بات ہے؟"

"میں اتنی جلدی سمجھ نہیں سکتا مگر کوئی بات ضرور ہے جس کے باعث دوسروں سے مختلف لگتی ہو۔"

"سنا ہے آپ کی شریک حیات بہت خوبصورت ہے؟"

"وہ سایہ دار شجر ہے جو سایہ دیتا ہے پھل نہیں دیتا۔"

"دوسرا بھی ثمردار نہ ہوا تو؟"

"اس کا جواب امی جانتی ہیں۔"

دوسرے کمرے میں بیگم سعدیہ نے نعمانہ اور رخسانہ کو دیکھ کر کہا۔

"اچھا تو میرے بیٹے نے رضوانہ کو پسند کیا ہے؟"

خاتون خانہ نے کہا "لڑکیو! اب یہاں سے جاؤ۔ ہمیں باتیں کرنے دو۔"

لڑکیوں کے ساتھ ان کا باپ بھی اٹھ کر چلا گیا۔ دونوں خواتین ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئیں۔ رضوانہ کی ماں نے کہا۔

"بہن! ہمارے حالات تمہارے سامنے ہیں۔ تم کہتی ہو کل کا کام آج ہو جائے لیکن یوں کھڑے کھڑے تو لڑکی بیاہی نہیں جاتی؟"

"بیاہی جاتی ہے۔ میں کل آؤں گی اور پچیس ہزار دے جاؤں گی۔ اور بولو کیا مسئلہ ہے؟"

"تم ایک بہو پر دوسری بہو لے جا رہی ہو۔ اگر اس سے بھی اولاد نہ ہوئی تو؟"

"یہ تو میں پہلے ہی صاف صاف کہہ چکی ہوں۔ دو برس میں اولاد نہ ہوئی تو طلاق ہو جائے گی اور طلاق کے وقت پچاس ہزار دوں گی۔ وہ میرے بیٹے کو چھوڑنے کی قیمت ہو گی۔"

"پھر میری مطلقہ بیٹی سے کون شادی کرے گا۔"

"یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ اولاد نہ ہوئی تو تیسری بہو لانا ہے۔ یوں میں بہوؤں کا میلہ نہیں لگاؤں گی۔ ایک کو چھوڑوں گی' دوسری کو پکڑوں گی۔"

"تو پھر پہلی کو طلاق کیوں نہیں دلوائی؟"

"یہی تو غلطی ہوئی کہ نکاح سے پہلے لکھت پڑھت نہیں ہوئی۔ رضوانہ کو بہو بنانے سے پہلے تم سے اور رضوانہ کے باپ سے پکے کاغذ پر لکھواؤں گی کہ اولاد نہ ہوئی تو بے چون و چرا طلاق ہو جائے گی۔"

وہ بے چینی سے پہلو بدل کر بولی "رضوانہ کے ابا راضی نہیں ہو رہے ہیں۔ کہتے ہیں

مطلقہ بیٹی کو بیاہنے میں زیادہ جہیز زیادہ رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"ٹھیک ہے میں کچھ رقم بڑھا دوں گی۔ اپنی میاں کو سمجھاؤ رضوانہ مجھے پوتے پوتیاں دے گی تو کتنا مان بڑھے گا۔ اولاد کے حوالے سے ہماری تمام دولت اور جائیداد کی مالک ہو گی۔ شائستہ دو کوڑی کی ہو کر رہ جائے گی۔"

"میں جانتی ہوں' ہماری بیٹی کی بھلائی ہے۔ مگر پچیس ہزار کم ہیں۔"

"تم خرچ کیا کرو گی؟ نکاح تو چپ چاپ پڑھا جائے گا۔ جب تک رضوانہ کے پاؤں بھاری نہیں ہوں گے۔ میں اسے گھر نہیں لے جاؤں گی۔ میرا بیٹا اسے ایک فلیٹ میں رکھے گا۔ نہ برات آئے گی نہ باجے گاجے اور کھانے پینے کا خرچ ہو گا۔ پھر بھی یہ رقم کم ہے تو تیس ہزار لے لو۔"

رضوانہ کی ماں نے بیگم کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کہا "بیٹی کے معاملے میں سودے بازی بہت معیوب ہے۔ میں آخری بات کہتی ہوں۔ چالیس ہزار دے دو اور بہو بنا کر لے جاؤ۔"

بیگم سعدیہ یہ بازی ہارنا نہیں چاہتی تھی۔ لاکھوں لٹانے کے لئے تیار تھیں۔ آخر راضی ہو کر بولیں "کل پکا کاغذ لکھوا کر لاؤں گی' دستخط کے بعد چالیس ہزار دوں گی۔ مغرب کے بعد قاضی وغیرہ کا انتظام پورا رکھنا۔ میں بیٹے کو لے کر آ جاؤں گی۔"

انہوں نے رات کا کھانا وہیں کھایا۔ بیٹے کو ایک ایک بات ہجے کر کے سمجھا دی کہ نکاح کب اور کس طرح ہوگا اور وہ باپ بننے تک دوسری شادی کو راز میں رکھے گا۔ شائستہ کو دوسری عورت کی ہوا تک لگنے نہیں دے گا۔

وہ بیٹا جو بیوی کا غلام بنا رہتا تھا' اب ماں کا فرمانبردار بن گیا تھا۔ ماں نے بڑی دور اندیشی سے یہ طریقہ اپنایا تھا۔ بیٹے کے مزاج کو خوب سمجھ لیا تھا۔ ایک تو وہ عیاش رئیس زادوں کی طرح بازاری عورتوں کے چکر میں نہ پڑتا۔ دوسرے شائستہ کی طرف دھیان دینے اور اس کے اشاروں پر ناچنے کی اسے فرصت ہی نہ ملتی اور وہ شائستہ کے سامنے ہمیشہ ماں کو ترجیح دیتا رہتا۔ اسے پاؤں کی پھٹی ہوئی جوتی سمجھ کر گھر کے کونے میں پھینک دیا کرتا۔

وہ رات کے گیارہ بجے گھر پہنچا۔ شائستہ نے اسے ماں کے ساتھ دیکھا تو ماتھا ٹھنکا۔ شادی کو پانچواں برس تھا ان برسوں میں اس نے کبھی بیٹے کے ساتھ جاتے یا کہیں سے آتے نہیں دیکھا تھا۔ آج یہ نیا اتحاد کچھ رنگ لانے والا لگتا تھا۔

وہ کمرے میں آ کر لباس بدلنے لگا۔ شائستہ نے کہا "میں نے دفتر میں اور تمہارے دوستوں کے ہاں کتنے ہی فون کر ڈالے۔ مجھے معلوم ہوتا کہ اماں کی گود میں ہو تو پریشان نہ ہوتی۔"

وہ بھڑک کر بولا "کیا ماں کے ساتھ کہیں جانے پر برائی ہے؟"

"ہرگز نہیں۔ آج ماں کے ساتھ گئے، کل میرے ساتھ جاؤ گے تو کوئی برائی نہیں ہوگی۔"

"تمہارے ساتھ کہاں جاؤں گا؟"

"جہاں آج امی کے ساتھ گئے تھے۔"

"آں؟" وہ ذرا چونکا پھر سنبھل کر بولا "امی کی سہیلی کے ہاں دعوت تھی۔ دعوت روز روز نہیں ہوتی کہ تمہیں وہاں لے جاؤں۔"

"میں تو انہیں دعوت دے سکتی ہوں۔ مجھے فون نمبر دو۔ میں کل رات پرل میں انہیں انوائٹ کروں گی۔"

وہ گھبرایا پھر بولا "ان کا فون خراب ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ کل صبح دفتر جانے سے پہلے ان کے گھر ہوتے جائیں گے۔"

کل تو شب عروسی تھی۔ نئی دلہن آنے والی تھی۔ اس نے کہا۔

"کل نہیں، کل میں بہت مصروف ہوں۔"

"ایسی کون سی مصروفیت ہے، جس میں میں شریک نہیں ہو سکتی۔"

وکالت کو یوں لگا جیسے وہ اس کی شادی میں شریک ہونے کی ضد کر رہی ہے۔ اس نے جھنجلا کر کہا "تم کیوں میرے پیچھے پڑ جاتی ہو؟ میں جہنم میں جاؤں گا۔ کیا میرے ساتھ جاؤ گی؟"

"میرے پیار کو آزماؤ اور جہنم میں لے چلو۔"

"مجھے معاف کر دو۔ میں تم سے باتوں میں نہیں جیت سکتا۔"

"یعنی میں جیت گئی۔ کل ہم پرل چلیں گے۔"

اس نے گھور کر دیکھا۔ عقل نے سمجھایا۔ بات مان لو۔ کل کسی طرح ٹرخا دینا۔ نہیں مانے گی تو دھوکا دے کر نئی سسرال پہنچ جانا۔

مشکل یہ تھی کہ وہ جیسے اندر کی بات سمجھ لیتی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "تم مجھے گھور رہے ہو یا میرے خلاف سوچ رہے ہو۔"

وہ ایسی باتوں سے خوف زدہ ہو کر کہا کرتا تھا۔ "تم بہت ذہین ہو۔"

آج ایسی ہی ذہانت پر غصہ آ رہا تھا۔ ماں نے راستے میں سمجھایا تھا۔ لڑائی جھگڑا نہ کرنا۔ رضوانہ کو دلہن بنانے تک بات نہ بڑھانا ورنہ وہ بڑی حرافہ ہے۔ کانوں میں ذرا بھی بھنک پڑ گئی تو شادی نہیں ہونے دے گی۔

وہ ہارے ہوئے سپاہی کی طرح بستر پر گر پڑا۔ اس کے بعد آنکھیں بند کر لیں۔ شائستہ اس کے پاس آئی۔ وہ دوسری طرف کروٹ بدل کر بولا "سونے دو۔ صبح جلدی اٹھنا پڑتا ہے۔"

وہ محبت سے لپٹنے آئی تھی۔ بستر پر بیٹھ گئی۔ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ کار کی اسٹیرنگ کی طرح اس کے ہاتھوں میں رہتا تھا۔ شائستہ اسے ادھر ادھر نہیں ہونے دیتی تھی۔ سیدھے راستے پر چلاتی رہتی تھی۔ جہاں مڑنا ہوتا تھا' وہاں موڑتی تھی۔ آج وہ ہاتھوں سے بہک رہا تھا۔ بے ضرورت مڑ رہا تھا اور نامعلوم ایکسیڈنٹ کا اندیشہ پیدا کر رہا تھا۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ دوسرے دن سے اس کی مصروفیات پر نظر رکھے گی اور دفتر کے ایک ملازم کو بھاری رشوت دے کر جاسوس بنائے گی۔ یوں اس کی نگرانی کرتی رہے گی۔

دوسرے دن اس نے گیارہ بجے فون کیا۔ وہ دفتر میں موجود تھا۔ پھر لنچ کے وقت فون پر کہنا چاہتی تھی کہ شام کو دفتر آئے گی اور تفریح کا پروگرام بنائے گی لیکن وہ فون پر نہیں ملا۔ چپراسی نے کہا "صاحب کہیں گئے ہیں۔"

وہ کار میں بیٹھ کر دفتر پہنچ گئی۔ وہاں تفتیش کے دوران معلوم ہوا کہ پچھلی شام بیگم سعدیہ دفتر میں آئی تھیں۔ پھر ماں بیٹے وہاں سے کہیں گئے تھے۔ اس نے ایک نوجوان کلرک کو بلا کر پوچھا۔

"تمہیں کتنی تنخواہ ملتی ہے؟"

"میڈم! ڈیڑھ ہزار۔"

"اگر تنخواہ دگنی ہو جائے اور تین ہزار ملیں تو؟"

"آپ کا احسان ہو گا میڈم۔"

"کیا نام ہے؟"

"اسرار احمد۔"

"اسرار کے معنی بھید' راز ہیں۔ کیا تم راز دار بنو گے؟"

"میں سمجھا نہیں میڈم۔"

"میں اپنے ذاتی معاملات میں تمہیں راز دار بنانا چاہتی ہوں اور جو بھی راز ہو وہ میرے شوہر کو یعنی تمہارے صاحب کو نہ معلوم ہو۔"

"میڈم! انجانے دشمن ہوتے ہیں' کوئی راز کھلا تو میری ملازمت چلی جائے گی۔ میری ایک بیوی اور بچہ ہے۔"

"بچہ بھی ہے۔ پھر تو تمہاری بیوی خوش نصیب ہے۔ میں ضمانت دیتی ہوں تمہاری ملازمت برقرار رہے گی۔ دفتر سے تمہیں ڈیڑھ ہزار ملیں گے اور میرے اس پرس سے ڈیڑھ ہزار۔"

"میں آپ کے معیار پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔ آپ کام بتائیں۔"

"ایک ہفتے کی چھٹی کی درخواست دو۔ پھر یہاں سے نکل کر ایسٹرن اسٹوڈیو کے سامنے

آؤ- وہاں میں اپنی کار میں ملوں گی-"

اس نے ایک ہزار کا نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا- "اسے رکھو' یہ کسی حساب میں نہیں ہے-"

"شکریہ میڈم! میں ابھی درخواست لکھ کر آتا ہوں-"

وہ دفتر سے باہر آئی- اپنی کار میں بیٹھ کر مل کے احاطے کے سامنے آ کر رک گئی- وہ آدھے گھنٹے بعد آیا- شائستہ نے اسے گلی سیٹ پر اپنے پاس بیٹھنے کو کہا- وہ جھجکتا ہوا بیٹھ گیا- اس نے کار اسٹارٹ کر کے بڑھاتے ہوئے کہا- "میں معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ وکالت صاحب دفتر کے علاوہ اور کہاں وقت گزارتے ہیں-"

"وہ کار میں آتے اور کار میں جاتے ہیں- میں کس طرح ان کا تعاقب کروں گا-"

"ڈیش بورڈ کھولو- وہاں سے چالیس ہزار نکالو-"

اس نے ڈیش بورڈ کو کھولا- اندر نوٹوں کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں- اس نے حساب سے چالیس ہزار نکال کر ڈیش بورڈ کے خانہ کو بند کر دیا-

وہ بولی "ابھی ایک موٹر سائیکل خریدو- شام تک مل کے سامنے رہو- وکالت صاحب ضرور آئیں گے- اس کے بعد وہ جہاں بھی جائیں ان کا پیچھا کرتے رہو-"

"آپ سے رابطہ کیسے ہوگا؟"

"اپنی بیوی کو راز دار بناؤ- وہ میری سہیلی بن کر جب چاہے فون پر رابطہ کر سکتی ہے-"

اسرار احمد نے جب سے چالیس ہزار روپے ہاتھوں میں لیے تھے تب سے دماغ روشن ہو رہا تھا کہ معاملہ گمبھیر ہے- تب ہی میڈم بڑی رقمیں خرچ کر رہی ہیں- ابتدا یہ ہے تو جانے انتہا کیا ہوگی؟"

وہ دل و جان سے میڈم کا مقرر کردہ سراغرساں بن گیا لیکن پہلے دن ناکامی ہوئی کیونکہ وکالت مل کے دفتر میں واپس نہیں آیا تھا- بیگم نے سمجھایا تھا کہ شائستہ دفتر میں پہنچ گئی تو پیچھا نہیں چھوڑے گی- پھر مغرب کے بعد نکاح نہیں ہو سکے گا- اس لئے وہ اس فلیٹ میں چلا گیا تھا جسے بیگم نے رازداری سے خرید رکھا تھا-

وکالت اسی فلیٹ سے رضوانہ کے گھر گیا- پھر اسے دلہن بنا کر وہیں لے آیا- وہ سہاگ کی سیج پر رضوانہ کو دلہن کے روپ میں دیکھ کر ماں کی ممتا پر ایمان لے آیا- ماں کی ہیرا پھیری سے ہی سے اسے نئی دلہن ملی تھی-

وہ بڑے جوش اور جذبات کے ساتھ دلہن کے پاس رہا' اس سے باتیں کرتا رہا- محبتیں کرتا رہا لیکن اسے کچھ ایسا لگا جیسے گھر میں نہیں بازار میں رات گزار رہا ہو- اس نے گھونگھٹ اٹھانے سے پہلے اس کا ایک ہاتھ تھام کر اسے انگوٹھی پہنائی پھر اس کی ہتھیلی کی

پشت پر اپنے ہونٹ رکھے تو رضوانہ نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑالیا- یہ انداز بہت برا لگا- وکالت نے پوچھا "کیا ہوا؟"

خیال تھا کہ وہ شرمائے گی مگر وہ تڑ سے بولی "مونچھیں چبھتی ہیں-"

"تو کیا ہوا؟"

وہ کچھ نہ بولی- بیٹھے بیٹھے دوسری طرف گھوم گئی- نئی دلہن کے نخرے برداشت کرنے پڑتے ہیں- وہ پیار سے سمجھانے منانے لگا- ماننے کو تو وہ فوراً مان گئی تھی اور مشرقی دلہن کا جواب بنتی رہی تھی لیکن بار بار مونچھیں آڑے آتی رہیں- ایسی پریشانی کے عالم میں اسے پروین شاکر کا ایک شعر یاد آیا- جس کا مفہوم یہ تھا کہ تتلی کانٹوں سے گھرے ہوئے پھولوں پر جا کر بیٹھتی ہے لیکن اس کے پر نہیں چھلتے- ایک وہ تھی کہ اس نے مونچھوں کو مسئلہ بنا لیا تھا- بہرحال کسی طرح گرتے پڑتے وہ رات گزارلی- دوسری صبح بیزار ہو کر بولا- "مونچھوں سے مرد کی شان بڑھتی ہے- ہمارے خاندان میں کوئی مونچھیں نہیں منڈواتا- گزارہ کرنا سیکھو-"

وہ صبح دیر تک سوتی رہی- وکالت کو اب ادھر کی فکر تھی کہ شائستہ کیا سوچ رہی ہو گی؟ کیا کر رہی ہوگی؟ وہ ابا جان سے میرے رات بھر غائب رہنے کی شکایت کر رہی ہو گی؟ ہو سکتا ہے میری تلاش شروع ہو چکی ہو-

ایک طرح سے اطمینان تھا کہ وہاں کے معاملات امی سنبھال لیں گی- اس کے باوجود وہ فکر مند تھا- غسل کرتے وقت احساس ہوا کہ وہ فکر شائستہ کی طرف سے نہیں رضوانہ کی طرف سے ہے- وہ نئی عورت چاہتا تھا اور رضوانہ میں کوئی نئی بات نہیں تھی- وہ جیسے شائستہ سے بہلتا تھا اس بہلاوے میں ڈھکی چھپی ممتا ہوتی تھی- وہ اسے ایک بچہ سمجھ کر اس کا خیال رکھتی تھی- اسے آغوش میں یوں لیتی تھی جیسے گود لے رہی ہو-

وہ پانچ برسوں میں اس کا عادی ہو گیا تھا- ایک ہی رات کی جدائی سے معلوم ہو گیا کہ اس سے لڑ جھگڑ سکتا ہے- ماں کے آگے اسے ٹھکرا سکتا ہے مگر اس کے بازو پر سر رکھے بغیر سو نہیں سکتا-

وہ کوئی دنیا سے نرالی نہیں تھی لیکن عورت ازدواجی معاملات میں نرالی بن سکتی تھی- یہ اس کی حکمت عملی تھی کہ وہ بیوی کے پیار میں اس کی بیگم امی کی ممتا بھی گھول کر پلاتی تھی- ٹو ان ون بن جاتی تھی- اسی لئے اپنی شادی کے پہلے دن سے بیگم سعدیہ کا طلسم توڑتی آئی تھی-

عموماً" ساس اپنی بہو کو چالاک تو کہتی ہے لیکن چالاک سمجھتی نہیں ہے- خود کو اس کے مقابلے میں زیادہ ذہین سمجھتی ہے- ایسی خوش فہمی میں یہ نہیں سوچتی کہ بہو بیڈ روم کی چار دیواری میں کس طرح سحر پھونکتی رہتی ہے اور نفسیاتی طریقہ کار سے اپنے میاں پر بڑی

سیاست سے محبت کا رنگ چڑھاتی رہتی ہے۔

وہ چاہتا تو دوسری صبح گھر واپس جا سکتا تھا۔ شائستہ کوئی سوال کرتی تو اسے جھڑک کر کہہ سکتا تھا کہ کاروباری معاملے میں شہر سے باہر چلا گیا تھا۔ وہ آئندہ اس کے گھر سے باہر کی مصروفیات کا حساب نہ مانگا کرے۔ مرد زبردست بن کر رہے تو عورت رفتہ رفتہ زیردست آ جاتی ہے۔ پھر باہر کے کسی معاملے میں چوں نہیں کرتی۔

اس نے کئی بار چنگیز خان بننے کی کوشش کی لیکن بیوی کا معشوق خاں بن کر رہنے والا چنگیز خان کبھی نہیں بن سکتا۔ اس کی فطرت اور اس کے مزاج میں تابعداری تھی۔ وہ یہ سمجھ نہیں پاتا تھا کہ شائستہ بظاہر تابعداری کرتے ہوئے کیسے اس کی حواس پر حاوی رہتی ہے۔

اس کا سامنا کرنے سے کترانے کے لئے اس نے دفتر میں فون کیا اور منیجر سے پوچھا "میری کوئی فون کال یا کوئی خبر ہے؟"

"یس سر! بڑے صاحب آپ کو پوچھ رہے تھے۔ آپ کی بیگم صاحبہ نے بھی فون کیا تھا۔ وہ پھر فون کریں گی۔"

"تم انہیں بتا دو کہ سکھر سے میرا فون آیا تھا اور میں نے کہا ہے کہ میں دوست کی شادی میں گیا ہوا ہوں۔ کل واپس آ جاؤں گا۔"

پندرہ منٹ بعد شائستہ کو منیجر نے بتایا کہ وہ سکھر میں ہے۔ وہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ وہ دوست کی شادی میں تین دنوں تک کاروباری اہم معاملات سے دور رہے گا۔ جب کوئی دوسری کے چکر میں پڑتا ہے تو پہلی سے اسی طرح دور بھاگتا ہے۔

پھر بیگم سعدیہ کا اطمینان دیکھ کر خطرے کی گھنٹی بج گئی تھی۔ بیٹے کی فکر سب سے پہلے ماں کو ہوتی ہے لیکن وہ بڑے اطمینان سے کہتی رہیں۔ "پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ میرا بیٹا کوئی بچہ نہیں ہے۔ دوستوں کے ساتھ کہیں گیا ہو گا۔ آ جائے گا۔"

اسرار احمد کی بیوی نے شائستہ سے فون پر رابطہ کیا اور اپنے شوہر کا پیغام دیا اس کی رپورٹ کے مطابق وکالت شہر میں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر اسرار احمد نے پوچھا تھا اگر حکم ہو تو وہ سکھر جا کر اسے تلاش کرے گا۔

شائستہ نے کہا "وہ شہر میں ہیں۔ کسی چار دیواری میں منہ کالا کر رہے ہیں۔ دو گھنٹے بعد رابطہ کرو اور صاحب کو ڈھونڈ نکالنے کی کوئی تدبیر کرتے رہو۔"

وہ سوچنے لگی۔ ماں کے چہرے کا اطمینان اور چھپی چھپی سی خوشی بتا رہی ہے کہ اس نے بیٹے کو کھلونا دے کر بہلایا ہے۔ ابا جان نے کئی جگہ وکالت کی خیریت معلوم کرنے کے لئے فون کیا تھا۔ پھر یہ معلوم ہونے کے بعد کہ وہ سکھر گیا ہے' غصہ میں بڑبڑاتے رہے۔ موسم گرما کی آمد سے پہلے لان کے نئے نئے ڈیزائن تیار ہو رہے تھے۔ پبلسٹی پر لاکھوں

روپے خرچ کئے جا رہے تھے۔ دوسری ملوں کی لان کے مقابلے میں اپنی پروڈکٹس کو پورے پاکستان کی مارکیٹ میں پہنچانا اور سیل بڑھانا ایک زبردست چیلنج ہوتا تھا۔ ایسے وقت وکالت نے سکھر جا کر غیر ذمے داری کا ثبوت دیا تھا۔

بیگم سعدیہ بہو سے جو خسارہ اٹھا رہی تھیں اس کے پیش نظر کاروباری خسارہ ان کی نظروں میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اسی لئے وکالت کو کاروبار سے ہٹا کر اپنے راستے پر لگا لیا تھا۔

شائستہ بڑی دانائی سے سسر کے سامنے یہ شکایت نہیں کر رہی تھی کہ وکالت کہیں بھٹک رہا تھا یا بھٹکایا جا رہا ہے وہ تشویش ظاہر کر رہی تھی کہ ایسی غیر ذمے داری سے کاروبار کا کیا بنے گا؟ اس طرح وہ اپنی تشویش کو چھپا کر سسر کے کاروباری غم میں شریک ہو رہی تھی۔ یعنی وہ سسر کے ذریعے زیادہ سختی سے وکالت کا محاسبہ کر سکتی تھی۔

شام تک اس کا سراغ نہیں ملا۔ اگرچہ وہ دوسرے دن واپس آنے والا تھا لیکن شائستہ سے فراڈ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اس پہلو سے سوچ رہی تھی کہ کس طرح اپنی ساس کی زبان کھلوا سکتی ہے۔ یقیناً" وہ جانتی ہو گی کہ بیٹا کہاں ہے؟

تب اچانک ہی ایک تدبیر ذہن میں آئی۔ وہ اسرار احمد کی پاس گئی۔ پھر اس سے بولی "ہماری کوٹھی کے سامنے جاؤ۔ جیسے ہی وکالت کی والدہ باہر نکلیں' تم ان کا تعاقب شروع کر دو۔"

اسے یہ ڈیوٹی دے کر وہ پھر واپس کوٹھی میں آئی۔ کوٹھی میں دو ٹیلی فون تھے۔ ایک ٹیلی فون اس کے بیڈ روم میں اور دوسرا ساس کے کمرے میں ہوتا تھا۔ یعنی ایک ولایت علی کے لئے تھا دوسرا وکالت کے لئے۔ اس نے اپنے بیڈ روم میں آ کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ پھر فون کے پاس بیٹھ کر ریسیور اٹھایا۔ اس کے بعد ساس کا فون نمبر ڈائل کرنے لگی۔

اس وقت ولایت علی مل میں تھے۔ رابطہ قائم ہونے پر دوسری طرف سے بیگم سعدیہ کی آواز سنائی دی۔ شائستہ نے دبی ہوئی سرگوشی میں ذرا سی آواز بدل کر کہا "میں بول رہی ہوں۔"

دوسری طرف سے بیگم نے راز داری سے پوچھا "میں کون؟"

"وہ' آپ سمجھا کریں۔ میں اپنا نام نہیں لوں گی' آپ کی بہو سے ڈر لگتا ہے۔"

"اچھا اچھا سمجھ گئی۔ بات کیا ہے؟ خیریت ہے نا؟"

"خیریت نہیں ہے۔ آپ کے بیٹے نے پتا نہیں کیا کھا لیا ہے۔ آواز بند ہو گئی ہے۔"

وہ پریشان ہو کر بولیں۔ "آواز بند ہو گئی؟ کیسے؟ اس نے کیا کھایا تھا؟"

"میں فون پر تفصیل کیا بتاؤں۔ بہت پریشان ہوں۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہے۔

ہیں۔ اپنا سینہ سہلا رہے ہیں۔ آپ گاڑی لے کر آئیں گی تو ہم انہیں ہسپتال لے جائیں گے۔"

"میں ابھی آ رہی ہوں۔"

ادھر سے ریسیور رکھ دیا گیا۔ شائستہ نے بھی فوراً ریسیور کو رکھا۔ دوڑتی ہوئی دروازے کے پاس آئی۔ اسے پوری طرح کھول دیا۔ پھر دوڑتی ہوئی پلنگ پر آکرلیٹ گئی۔ دوسری طرف کروٹ لے کر ایک انگریزی رسالہ کھول کر دیکھنے لگی۔ چند سیکنڈ کے بعد بیگم سعدیہ دبے پاؤں اس کے کمرے کے پاس آئیں۔ کھلے ہوئے دروازے سے بہو پلنگ پر دوسری طرف منہ کئے لیٹی نظر آئی۔ وہ مطمئن ہوگئیں کہ بہو گھر میں ہے اور اس کی ٹوہ میں نہیں ہے۔

وہ اسی طرح دبے قدموں وہاں سے باہر چلی گئی۔ شائستہ نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کوئی پون گھنٹے بعد فون کی گھنٹی سنائی دی۔ وہ ریسیور اٹھا کر بولی۔ "ہیلو۔"

اسرار کی بیوی نے کہا "میڈم! میں بول رہی ہوں۔ کام ہوگیا ہے۔ آپ بہادر آباد کے راؤنڈ اباؤٹ میں آجائیں۔ ہم انتظار کر رہے ہیں۔"

شائستہ ریسیور رکھ کر اٹھ گئی۔

ادھر بیگم سعدیہ بیٹے کے لئے پریشان ہو کر ہانپتے کانپتے فلیٹ کے دروازے پر پہنچیں۔ پھر زور زور سے دستک دی۔ رضوانہ نے دروازے کو کھول کر پوچھا "آپ؟"

وہ تیزی سے اندر آکر بولیں۔ "کہاں ہے میرا بیٹا؟ آخر تم نے اسے کیا پکا کر کھلا دیا تھا؟"

وکالت نے دوسرے کمرے سے نکل کر پوچھا "امی! آپ پریشان کیوں ہیں؟"

وہ بیٹے کو صحیح و سلامت بولتے دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔ کبھی بہو کو کبھی بیٹے کو دیکھنے لگیں۔ پھر بہو سے بولیں "ابھی تم نے مجھے فون کیا تھا؟"

"جی نہیں۔"

"جھوٹ بولتی ہو۔ ابھی تم نے میری جان نکال دی تھی۔ تم نے کہا تھا' وکالت نے کوئی چیز کھا لی ہے۔ جس سے آواز بند ہوگئی ہے۔اس کی حالت خراب ہے۔ اسے اسپتال لے جانا ہے۔"

وکالت نے کہا "امی! رضوانہ شام سے فلیٹ میں میرے ساتھ ہے جبکہ فون کرنے کے لئے سامنے والی دکان میں جانا پڑتا ہے۔ میں گواہ ہوں کہ رضوانہ نے آپ کو فون نہیں کیا تھا۔"

وہ حیران ہو کر بولیں "پھر کس نے فون پر میرا دل دہلایا تھا؟"

"اوہ گاڈ!" وکالت نے کہا "کہیں شائستہ تو چالاکی نہیں دکھا رہی ہے؟ امی! اس سے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

بیگم کے اندر سے ہول اٹھنے لگا۔ رضوانہ نے فون نہیں کیا تھا۔ پھر تو یہی بات سمجھ میں آتی تھی کہ وہ مکار لومڑی کوئی چال چل رہی ہے۔

وہ بولیں "بیٹے! کیا اس نے مجھے بے وقوف بنایا ہے؟"

"یہی سمجھ میں آرہا ہے امی! اس نے آپ کا تعاقب یہاں تک کیا ہوگا۔"

"میں جب گھر سے نکلی تو وہ اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے کوٹھی کے باہر بھی دیکھا ہے۔ وہ میرے پیچھے نہیں آئی تھی۔"

"خدا کرے اس نے پیچھا نہ کیا ہو۔ پھر بھی سوال پیدا ہوتا ہے ایسی حرکت کس نے کی ہے؟"

بیگم نے کہا "ہمارا تو ایک ہی دشمن ہے۔ معلوم ہوتا ہے صداقت تمہارے پیچھے پڑ گیا ہے۔ تم کاروبار چھوڑ کر یہاں چھپے بیٹھے ہو' وہ دشمن تمہیں تلاش کرکے تمہارے اباجان کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے۔"

"ہاں امی! آپ کی بات دل کو لگتی ہے۔ بھائی جان ایسی حرکتیں کر رہے ہیں۔"

بیگم سعدیہ نے دروازے کی طرف دیکھ کر کہا "پھر تو وہ میرے پیچھے یہاں تک آیا ہوگا۔ اور یہ جگہ دیکھ کر گیا ہوگا۔ بعد میں تمہارے اباجان کو یہاں لائے گا۔"

رضوانہ نے کہا "آپ ماں بیٹے کبھی میری سوکن سے ڈرتے ہیں' کبھی اپنے سوتیلے سے۔ دنیا والوں سے بھی مجھے چھپا کر رکھا گیا ہے۔ بات کھلے گی تو میرا کیا بنے گا؟"

وکالت نے کہا "ارے تم چپ رہو۔ ہمیں صورت حال کو سمجھنے دو۔ تم ہو کس گنتی میں؟ بات بگڑے گی تو تمہیں میکے پہنچا دیا جائے گا۔"

"کیوں میکے پہنچاؤ گے؟ کیا میں ماں کے گھر سے بھاگ کر آئی ہوں۔"

بیگم سعدیہ نے کہا "جس ایگریمنٹ کے مطابق لائی ہوں۔ اس کے مطابق تمہیں واپس بھیج سکتی ہوں۔"

"وہ ایگریمنٹ میں جانتی ہوں۔ آپ دو برس تک مجھے بہو ماننے سے انکار نہیں کر سکیں گی۔ اگر خوش قسمتی سے ماں بن جاؤں گی تو ہمیشہ کے لئے بہو تسلیم کی جاؤں گی۔"

"اس وقت ماں بننے اور بہو بن کر رہنے کا مسئلہ نہیں ہے۔ امی! بہتر ہے میں فوراً یہاں سے کسی دوست کے یہاں چلا جاؤں۔ میں لباس بدل کر آتا ہوں۔"

وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ بیگم نے کہا "رضوانہ! تمہارا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ایسے وقت تمہیں کوئی اچھا مشورہ دینا چاہئے۔ ہمارے ہر مسئلے میں تمہیں شریک رہنا چاہئے۔"

رضوانہ سر جھکا کر سوچنے لگی۔ وہ اس قدر دولت مند گھرانے میں واپس جانے کے لئے نہیں آئی تھی۔ جب تک ماں نہ بن جاتی تب تک شوہر کی ماں کو خوش رکھنا دانش مندی تھی' اس طرح آئندہ سوکن کے خلاف محاذ مضبوط ہو جاتا۔

وہ کچھ دیر سوچ کر بولی "آنٹی! میری عقل کہتی ہے اگر صداقت بھائی یہ فلیٹ دیکھ چکے ہیں تو اس سے پہلے کہ وہ اباجان کو یہاں لے کر آئیں' وکالت خود ہی مل میں جاکر اباجان سے ملاقات کرکے اپنے طور پر صفائی پیش کریں۔ یوں باپ کا دل بیٹے کی طرف سے صاف ہو جائے گا۔"

وکالت دوسرے کمرے سے یہ باتیں سن رہا تھا۔ لباس تبدیل کرکے ماں کے پاس آتے ہوئے بولا "رضوانہ ٹھیک کہتی ہے۔ آپ میرے ساتھ مل میں چلیں۔ بھائی جان کا یہ وار خالی جانا چاہئے۔"

ماں بیٹے فلیٹ کے باہر محتاط انداز میں آئے۔ دائیں بائیں آگے پیچھے دیکھتے ہوئے کار میں آکر بیٹھ گئے۔ دور تک کوئی ایسا نظر نہیں آیا جس پر شبہ ہوتا کہ وہ ان کی نگرانی کر رہا ہے۔ اس دوران شائستہ اسرار کی بیوی کے ساتھ ادھر آ رہی تھی۔ لیکن ان کا ایک دوسرے سے سامنا نہیں ہوا۔ ان ماں بیٹے کی روانگی کے پندرہ منٹ کے بعد شائستہ وہاں پہنچی۔ اس نے اچھی طرح پلاننگ کی تھی کہ فلیٹ میں کس حیثیت سے جانا ہے۔ اتنی عقل تھی کہ بیگم کو فلیٹ میں پہنچتے ہی دھوکے کا علم ہو جائے گا کہ بیٹے کی آواز بند نہیں ہوئی ہے' کوئی بہت بڑا فریب دیا جا رہا ہے۔ یہ معلوم ہوتے ہی ماں بیٹے وہاں نہیں رہیں گے لیکن فلیٹ میں ضرور کوئی ہوگا۔ نہ بھی ہوا تو پڑوسیوں سے کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔

اسرار کی بیوی نے ایک فائل پکڑی ہوئی تھی۔ شائستہ کے ہاتھ میں ایک کلپ بورڈ اور قلم تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ دوسری دستک پر رضوانہ نے دروازہ کھولا۔ اپنے سامنے دو عورتوں کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ شائستہ نے کہا "ہمارا تعلق مردم شماری کی ٹیم سے ہے۔ آپ اپنے کنبے کے افراد کی تعداد بتائیں اور نام لکھوائیں۔"

رضوانہ نے کہا "ہم صرف میاں بیوی ہیں۔"

"آپ کا نام۔"

"بیگم رضوانہ وکالت۔"

اس کے ساتھ وکالت کا نام سن کر شائستہ کے دل کو ٹھیس پہنچی۔ وہ لکھنا شروع کرتے ہوئے بولی "اپنے میاں کو بلاؤ۔"

"وہ ابھی باہر گئے ہیں۔"

"اکیلے گئے ہیں؟"

"اپنی امی کے ساتھ گئے ______"

رضوانہ چونک کر بولی "ان سوالات کا مردم شماری سے کیا تعلق ہے؟"

"بہت تعلق ہے۔ ابھی تم نے کہا تھا صرف میاں بیوی ہو۔ اب امی کا ذکر کر رہی ہو۔"

"وہ میری ساس ہیں۔ یہاں ہمارے ساتھ نہیں رہتی ہیں۔"

"اچھا اپنے میاں کا نام لکھواؤ۔"

"وکالت علی خان۔"

شائستہ لکھتے ہوئے بولی۔ "مسٹر وکالت علی خان کے والد کا نام کیا ہے؟"

وہ بولی "ولایت علی خان۔"

شائستہ نے چونک کر پوچھا "کون ولایت علی؟ کیا وہ جو ولایت ملز کے مالک ہیں؟"

وہ بڑے فخر سے بولی "جی ہاں۔ ہم بہت دولت مند ہیں۔"

"لیکن؟" شائستہ نے کہا "ان کے بیٹے وکالت کی شادی تو کوئی چار پانچ برس پہلے ہوئی تھی۔"

رضوانہ گڑبڑائی پھر جلدی سے بولی "جی ہاں۔ ان کی وہ بیوی مر چکی ہے۔"

شائستہ کو تو جیسے آگ لگ گئی۔ وہ برداشت کرتے ہوئے بولی۔ "تم کوئی فراڈ ہو۔ میں کل ہی اس علاقے میں مردم شماری کے لئے گئی تھی۔ کل ہی میں نے وکالت علی کی بیوی سے ملاقات کی ہے۔ اس کوٹھی کے افراد کے نام وغیرہ لکھ چکی ہوں۔ اس خاندان میں تمہارا نام کہیں نہیں آیا اور تم مجھ سے کہتی ہو کہ ولایت علی کی بہو ہو اور اس چھوٹے سے فلیٹ میں رہتی ہو۔"

"اس کوٹھی میں میرا نام اس لئے نہیں لکھوایا گیا کہ کل ہی میری شادی وکالت علی سے ہوئی ہے۔"

"یہ بھی جھوٹ ہے۔ اتنے بڑے خاندان میں تم بہو بن کر آتیں تو کیا کوٹھی والوں کو خبر نہ ہوتی؟"

"تم مردم شماری کی کارکن ہو یا پولیس والوں کی رشتے دار؟ ہمارے خاندانی معاملات کی انکوائری کیوں کر رہی ہو؟"

"میں پولیس والی نہیں ہوں لیکن تھوڑی دیر میں پولیس انکوائری کو آئے گی تو انکشاف ہوگا کہ تم بیوی نہیں ہو' یہاں ایک بڑے باپ کے بیٹے کی داشتہ بن کر رہتی ہو۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ میں وکالت علی کی منکوحہ ہوں۔"

"کیا تمہارے پاس نکاح نامہ ہے؟"

"ہاں۔ نہیں' میرا مطلب ہے کل رات نکاح ہوا ہے۔ نکاح نامہ فوراً نہیں مل جاتا۔ دو چار روز میں ملے گا۔"

"نکاح نامے کے علاوہ بھی کئی ثبوت ہوتے ہیں۔ مثلاً" شادی کی تقریب کی تصویریں اور معزز گواہان وغیرہ۔ ایسا کرو۔ ہمارے ساتھ ولایت علی خان کے پاس چلو۔ وہ تمہیں بہو تسلیم کرلیں گے تو تم قانونی گرفت میں آنے سے بچ جاؤ گی۔"

"نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔ تم کون ہو؟ کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہو؟"

"اگر تم چاہتی ہو کہ میں پیچھے نہ پڑوں تو میری یہ ساتھی ابھی جاکر پولیس والوں کو بلا لائے گی۔ کیا ان کے ساتھ ولایت علی کے سامنے حاضر ہونا پسند کروگی؟"

وہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر شائستہ کو دیکھ رہی تھی۔ پھر بولی "میرا دل کہتا ہے تم کوئی اور نہیں ہو، میری سوکن ہو۔"

اچانک ہی شائستہ نے ایک زور دار طمانچہ رسید کیا۔ پھر کہا۔ "کمینی! تیری کیا اوقات ہے کہ میری سوکن بنے گی۔ تیرے پاس نکاح نامہ نہیں ہے۔ کوئی ثبوت کوئی گواہ نہیں ہے۔ ثبوت حاصل ہونے سے پہلے ہی میں تجھے یہاں سے ذلیل کرتی ہوئی تھانے لے جاؤں گی۔"

وہ گھبرا کر بولی "میں تھانے نہیں جاؤں گی۔ اپنی سچائی ثابت کرنے کے لئے بیگم سعدیہ کے پاس چلنے کو تیار رہوں۔"

"تم دو میں سے کسی ایک جگہ جاؤ گی، تھانے یا مل میں ولایت علی کے پاس، ورنہ پولیس یہاں آئے گی۔"

"مجھے فون کرنے کا موقع دو۔ میں وکالت اور اس کی امی کو بلاؤں گی۔"

"یہ نیک کام میں کرتی ہوں۔"

پھر اس نے اسرار کی بیوی سے کہا "تم اس پر نظر رکھو، یہ فلیٹ چھوڑ کر بھاگنا چاہے تو چیخ و پکار سے لوگوں کو جمع کرلینا، میں قریب ہی سے فون کرکے آتی ہوں۔"

رضوانہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسے وقت کیا کرنا چاہئے۔ وہ پولیس تھانے کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ باقاعدہ منکوحہ ہونے کے باوجود پولیس والوں سے گھبراتی تھی۔ شائستہ کے جانے کے بعد اس نے اسرار کی بیوی سے پوچھا "یہ وکالت کو ہی فون کرنے گئی ہیں نا؟"

وہ بولی "میرا خیال ہے یہ فون نہیں کریں گی۔ سیدھی مل جائیں گی اور وکالت صاحب کو پکڑ کر یہاں لائیں گی۔"

رضوانہ نے مطمئن ہو کر کہا "پھر تو اچھی بات ہوگی۔ میری پارسائی کا ثبوت میرا شوہر ہی دے گا۔"

شائستہ اپنی کار میں سیدھی قریبی تھانے پہنچی۔ انسپکٹر سے اپنا تعارف کرایا۔ انسپکٹر کو معلوم ہوا کہ وہ ایک بہت بڑے مل اونر کی بہو ہے تو اس نے عزت سے بیٹھنے کو کہا۔ وہ

بولی "پلیز آپ میرے ساتھ میری کار میں چلیں۔ میں آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گی۔ آپ کے ایک ایک منٹ کا معاوضہ دوں گی۔"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ انسپکٹر نے پہلے ہی تاڑ لیا تھا کہ موٹی اسامی ہے۔ وہ کار میں آکر بیٹھ گیا۔ شائستہ نے مختصر طور پر اسے بتایا۔ "رضوانہ نام کی عورت دعوے کرتی ہے کہ وکالت سے شادی کی ہے اور فی الحال نکاح پڑھائے جانے کا ثبوت نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں جب تک ثبوت نہ ملے آپ اسے بدکاری کے الزام میں میرے شوہر کے ساتھ حوالات میں بند کردیں۔"

یہ کہہ کر اس نے انسپکٹر کے سامنے ڈیش بورڈ کے خانے کو کھول دیا۔ اس کے ساتھ ہی انسپکٹر آنکھیں کھل گئیں۔ اس خانے میں بڑے نوٹوں کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ بولی "ہر گڈی پانچ ہزار کی ہے۔ وہ گڈیاں اٹھالیں۔ یہ پیشگی ہے۔ ان دونوں کو حوالات میں بند کریں اس کے بعد مزید بیس ہزار دوں گی۔ جب تک کوئی عدالت سے ضمانت نامہ نہ لائے انہیں رہا نہ کریں۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو سیدھا بدکاری کا کیس ہے۔ ایسے بدکاروں کی ضمانت بھی قبول نہیں کی جاتی۔"

"اگر نکاح نامہ ہوا تو وہ کل سے پہلے پیش نہیں کرسکیں گے۔"

"محترمہ! آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کا پرابلم سمجھ گیا ہوں۔ آپ چاہتی ہیں شوہر کو گمراہی کی سزا ملے اور ساتھ ہی سوکن کے بھی ہوش ٹھکانے آجائیں۔ یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ہیں۔ آپ رقم بڑھائیں، میں سوکن سے ہی نجات دلا دوں گا۔"

وہ کار اسٹارٹ کرکے فلیٹ کی طرف سے ڈرائیو کرتے ہوئے بولی "اگر واقعی میرے میاں نے چھپ کر نکاح پڑھوایا تو میں سوکن سے ضرورت نجات چاہوں گی۔ اس کے لئے منہ مانگا معاوضہ دوں گی۔"

اس نے فلیٹ کے سامنے کار روکی۔ پھر انسپکٹر کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتی ہوئی دوسری منزل پر آئی۔ دروازے پر دستک دی۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ انسپکٹر کو دیکھتے ہی رضوانہ کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ وہ جلدی سے آنچل میں منہ چھپانے لگی۔ شائستہ نے کہا۔ "آج حوالات کی ہوا کھاؤ۔ کل سے دنیا والوں سے منہ چھپاتی پھروگی۔"

انسپکٹر نے شائستہ سے کہا "محترمہ! بے شرمی کرنے والیاں دنیا سے نہیں صرف پولیس والوں سے منہ چھپاتی ہیں۔ یہ تین بہنیں ہیں۔ تینوں کال گرلز ہیں۔ شہر کی ایسی تمام لڑکیاں کے چہرے نام اور فون نمبرز ہماری یادداشت میں محفوظ رہتے ہیں۔ ویسے یہ دوسری کون ہے؟"

"یہ میری معاون ہے۔ آپ نے یہ کہہ کر دل خوش کر دیا کہ یہ کال گرل ہے۔"

رضوانہ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا "میں قسم کھاتی ہوں۔ اس بار میں نکاح پڑھوا کر آئی ہوں۔ مجھے موقع دیں کل تک نکاح نامہ پیش کر دوں گی۔"

شائستہ نے کہا "اب ہزار نکاح نامے آجائیں۔ ولایت علی خان تمہاری جیسی بازاری عورت کو بہو تسلیم نہیں کریں گے۔"

پھر وہ انسپکٹر کے ساتھ دوسرے کمرے میں آکر بولی "اس کی باتوں سے یقین ہوتا ہے کہ میرے شوہر نے دھوکا کھا کر اس سے نکاح پڑھوایا ہے۔ یہ جانتی ہوں کہ اباجان اسے بہو تسلیم نہیں کریں گے لیکن یہ قانوناً" بہو ہے۔ آپ کوشش کریں کہ یہ میرے میاں کا پیچھا چھوڑ دے۔ طلاق لے لے۔ آپ نہیں جانتے میری کار کے ڈیش بورڈ میں کتنی رقم ہے۔ میں بھی نہیں بتاؤں گی ______ آپ اندازہ کریں۔ ادھر طلاق لے گی۔ ادھر وہ ساری رقم آپ کی ہوگی۔"

انسپکٹر کا اندازہ تھا کہ پچاس ہزار سے زیادہ ڈیش بورڈ کے خانے میں ہیں اور یہ عورت اپنے خاوند کو اور خاوند کے اونچے خاندان کو جیتنے کے لئے اتنی بڑی رقم ہارنے کو تیار ہے۔

انسپکٹر شائستہ کی گاڑی میں رضوانہ کو لے کر تھانے میں آیا۔ شائستہ نے کہا "انسپکٹر! میری شرط یاد رکھیں۔ اس کے ساتھ وکالت صاحب کو بھی حوالات میں رکھنا ہوگا۔"

انسپکٹر نے رضوانہ سے کہا "وکالت کو فون کرو۔ جیسا میں کہتا ہوں وہی کہو۔ اس سے کہنا تم احتیاطاً فلیٹ چھوڑ کر ماں کے گھر آگئی ہو۔ وہ فوراً آکر ملے۔ شائستہ بیگم کی ایک بہت بڑی کمزوری ہاتھ آگئی ہے۔ اس کمزوری کے باعث وہ ہمیشہ تم دونوں کی کنیز بن کر رہے گی۔"

رضوانہ نے کہا "حضور! ہماری امی اپنے علاقے کے آفیسر کو اسی لیے بھتہ دیتی ہیں کہ آپ لوگ ہمیں پریشان نہ کریں۔ وہ آپ کا حصہ بھی دے سکتی ہیں۔ پلیز آپ پہلے میری امی سے بات کرلیں۔"

"ضرور کروں گا۔ تمہارے فون کے مطابق وکالت تمہاری ماں کے پاس آئے گا۔ میں وہیں جاکر دونوں سے نمٹ لوں گا۔"

اس نے مجبور ہوکر فون کیا۔ وکالت دفتر میں تھا۔ اس نے فون پر رضوانہ کی باتیں سن کر کہا "میں ابھی آرہا ہوں۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ انسپکٹر نے حوالدار سے کہا کہ رضوانہ کو لاک اپ میں رکھے۔ پھر اپنی جیپ میں چند سپاہیوں کو لے کر رضوانہ کے میکے کی طرف چلاگیا۔ وہ سلاخوں کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ شائستہ نے پوچھا "کیوں بڑے گھر کی بہو! اب تمہارا کیا خیال ہے۔ تمہیں ولایت علی کے خاندان میں جگہ مل سکے گی؟"

اس نے جواب دیا "میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ میری امی جوڑ کا توڑ جانتی ہیں۔ میری ساس نے پانی کی طرح رقم بہانے کی ہمت کی تو میں تمہیں دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکوں گی۔"

"یہ تو آنے والا وقت بتائے گا کہ کون کسے نکال کر پھینکتا ہے۔ ویسے یہ سوال ہم دو عورتوں کے درمیان ہے اس کا جواب دو۔ کیا وکالت میں باپ بننے کی صلاحیت ہے؟"

وہ دونوں ہاتھوں سے آہنی سلاخوں کو تھام کر ہنسنے لگی۔ پھر ہنستی چلی گئی۔ شائستہ اس کی ہنسی میں یہ چیلنج محسوس کر رہی تھی کہ وہ ماں بن سکتی ہے۔ اس کی ہنسی کے پیچھے یہ عزم تھا کہ کوئی سا بادل گرجے، کوئی سا بادل برسے، دھرتی ضرور جل تھل ہوگی۔ وہ کال گرل ہے، جہاں جائے گی وہاں سے ہری بھری ہو کر آجائے گی اور وہ ہریالی وکالت علی کے نام کردے گی۔

شائستہ نادان نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وکالت علی جیسے مردوں کو کس طرح الو بنایا جاسکتا ہے اور رضوانہ کی طرف سے یہ بات پکی ہوگئی تھی کہ سوکن بن کر رہی تو وکالت کو بڑی آسانی سے احمق بناتی رہے گی۔

وہ سر جھکائے رضوانہ کی طرف سے منہ پھیر کر جانے لگی۔ رضوانہ نے ہنستے ہوئے پوچھا "کیا ہوا؟ کیا میری ہنسی نے تمہیں سمجھا دیا ہے کہ ماں بننا ہنسی مذاق نہیں ہے؟ بھئی سچ پوچھو تو میں دعا کی قائل نہیں ہوں جب بھی ماں بنوں گی دواؤں سے بنوں گی۔ بانجھ پن کا علاج بہت آسان ہے۔"

وہ سر جھکائے انسپکٹر کے دفتری کمرے میں آکر بیٹھ گئی۔ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ وہ ساس سے لڑ رہی تھی سوکن کو زیر کر رہی تھی وہ حوصلہ ہارنا نہیں جانتی تھی۔ صرف ایک بچے کی کمی سے کمزور بن رہی تھی اور یہ کمی پوری نہیں ہو پا رہی تھی۔ عقل کہہ رہی تھی جب تک کمی پوری نہیں ہوگی، رضوانہ کے بعد بھی تیسری چوتھی سوکن کی آمد کا دھڑکا لگا رہے گا۔ وہ خود ایک بچے کی پرورش اپنے خون میں کرنے اور اسے اپنا دودھ پلانے کے لیے بے چین رہتی تھی اور خوب سمجھتی تھی کہ بے چینی اس کا حل نہیں ہے پھر حل کیا ہے؟

وہ خیالات سے چونک گئی۔ تھانے میں اس کا مجازی خدا آیا تھا۔ انسپکٹر کے ساتھ رضوانہ کی ماں اور بیگم سعدیہ بھی تھیں۔ وہاں شائستہ کو دیکھتے ہی سب کے سب چونک گئے۔ وکالت بوکھلا کر بولا "تم تم یہاں؟"

وہ بولی "پریشان کیوں ہو؟ تم یہاں آسکتے ہو تو کیا میں نہیں آسکتی؟"

"انسپکٹر آپ نے یہ کیوں نہیں بتایا کہ یہ بھی یہاں موجود ہے؟" سعدیہ بولیں۔

"میں آپ کو بتانے کا پابند نہیں تھا۔ کیا دونوں بہوؤں کو تھانے میں دیکھ کر خوشی نہیں ہو رہی ہے؟

اور زیادہ خوش ہونا چاہیں تو آپ کے شوہر کو بھی بلا لوں گا۔"

وہ گھبرا کر بولیں "نہیں، خدا کے لئے بات نہ بڑھائیں، بات یہی ختم کردیں۔"

شائستہ نے کہا "بات آگے بڑھے گی۔"

بیگم نے پریشان ہو کر کہا "انسپکٹر صاحب! یہ رضوانہ کی ماں کبھی میری کلاس فیلو تھی۔

شریف گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ برسوں کے بعد یہ شرمناک دھندا کرنے والی عورت نکلے گی۔ مجھ سے انجانے میں غلطی ہوگئی۔ میں اس کی تلافی کرنے کو تیار ہوں۔"

شائستہ بولی "انسپکٹر صاحب! پہلی بیوی کی میڈیکل رپورٹ یا اس کی اجازت حاصل کیے بغیر میرے شوہر نے مجھے دھوکا دے کر شادی کی۔ اب یہ شادی قانونی ہے یا غیر قانونی اس کا فیصلہ عدالت میں ہوگا۔ جب نکاح پڑھانے والے قاضی کو معلوم ہوگا کہ اس نے ایک بازاری لڑکی کا نکاح پڑھایا ہے تو وہ قاضی بھی اس نکاح کو منسوخ کرنے کی قانونی کاروائی کرے گا۔"

بیگم سعدیہ اور وکالت ڈھیلے پڑگئے۔ اچھی طرح سمجھ میں آگیا کہ موجودہ دلدل سے صرف شائستہ ہی نکال سکتی ہے۔ وکالت نے غصے سے ماں کو دیکھتے ہوئے کہا "آپ نے کن بازاریوں میں مجھے پھنسا دیا ہے۔ خاندان کی عزت کو خاک میں ملا دیا ہے۔"

انسپکٹر نے کہا "وکالت میاں! ابھی کہاں پھنسے ہو؟ پھنسنے والے ہو۔ نکاح غیر قانونی ہوگا تو بدکاری کے الزام میں کوڑے کھاؤ گے سنگسار کیے جاؤ گے۔"

ماں کا کلیجہ کانپ گیا۔ بیٹا سہم کر بیوی کو دیکھنے لگا۔ بیوی نے کہا۔ "ایک بہو کی حیثیت سے خاندان کی عزت بچانا میرا فرض ہے لیکن آج کے بعد بیٹا پھر ماں کی باتوں میں آکر شادیاں کرے گا تو میں کب تک ان لوگوں کی عزت بچاتی رہوں گی؟"

وہ جلدی سے قریب آکر شائستہ کا ہاتھ تھام کر گڑگڑاتے ہوئے بولا "میں قسم کھا کر کہتا ہوں ایسی نادان ماں کی باتوں میں پھر کبھی نہیں آؤں گا۔ میں کبھی دوسری شادی نہیں کروں گا۔ ابھی سب کے سامنے رضوانہ کو لکھ کر طلاق دیتا ہوں۔"

وہ حوالدار سے کاغذ قلم لے کر لکھنے لگا۔ طلاق نامہ مکمل ہونے کے بعد رضوانہ، اس کی ماں اور بیگم سعدیہ نے بھی اس پر دستخط کیے۔ انسپکٹر نے اس کیس کو اوپر ہی اوپر نمٹا کر انہیں جانے دیا۔ صرف شائستہ رہ گئی۔ اس نے تنہائی میں ڈیش بورڈ کے خانے کی تمام رقم انسپکٹر کے حوالے کی پھر اس کا شکریہ ادا کرکے وہ بھی گھر آگئی۔

وکالت خواب گاہ میں سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ جب وہ آکر بستر کے سرے پر بیٹھی تو وہ سامنے آیا اور سر جھکا کر کھڑا ہوگیا۔ شائستہ نے اسے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ وہ یکلخت گھٹنے ٹیک کر بیوی کے گھٹنوں سے لپٹ کر رونے لگا۔ بیوی خاموش بیٹھی رہی۔ وہ روتے روتے کہنے لگا۔ "میں نالائق ہوں امی کو عقلمند سمجھ کر تم سے بے وفائی کرتا رہا۔"

"تمہاری بے وفائی میں تمہاری امی کی بد دماغی ضرور شامل ہے لیکن اس سے زیادہ ایک نئی عورت کو حاصل کرنے کی ہوس رہی ہے۔"

"تم درست کہتی ہو ہر بات عقل سے سمجھتی ہو۔ اب میں ہر عورت کو ماں بہن سمجھتا

رہوں گا۔"

"میں کیسے یقین کروں کہ دل سے توبہ کر رہے ہو؟"

"تم جس طرح چاہو آزمالو۔"

وہ پرس میں سے ایک کاغذ نکال کر اسے دیتے ہوئے بولی "یہ طلاق نامے کی فوٹو اسٹیٹ کاپی ہے اسے ابا جان کے پاس لے جاکر انہیں پوری ہسٹری سنادو۔ ان کے سامنے توبہ کرکے وعدہ کرو۔ آئندہ صرف کاروبار میں دل لگاؤ گے اور عشق و ہوس میں نہیں پڑوگے۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا "کیا یہ ضروری ہے؟ ابا جان ان معاملات سے بے خبر ہیں۔ انہیں بے خبر رہنے دو۔"

"تم باپ سے بات چھپانا چاہتے ہو تو پھر یہ بیوی کس گنتی میں ہے؟ آئندہ پھر دھوکا دوگے۔"

"نہیں، میں کبھی دھوکا نہیں دوں گا۔ تم جو کہو گی وہ کروں گا۔"

وہ کاغذ لے کر چلا گیا۔ شائستہ مسکرانے لگی۔ دراصل وہ چاہتی تھی کہ اس گھر کے ایک بزرگ کے سامنے بیٹے کے ذریعے ماں کی حماقتیں کھل کر سامنے آجائیں۔ یہ ہر گھر میں ہوتا ہے۔ ساس جس قدر نیچے گرتی ہے، بہو کو اتنا ہی عروج حاصل ہوتا ہے۔

شائستہ نے یہ میدان مار لیا تھا۔ ولایت علی کے سامنے جب تمام واقعات سنائے گئے تو انہوں نے بیگم سعدیہ کو بہو کے سامنے بُری طرح ذلیل کیا۔ شائستہ نے تھانے میں ہی معاملات ختم کرکے خاندان کو بدنامی سے بچایا تھا۔ اس لیے اس کا مان بڑھ گیا۔ پھر ولایت علی نے دیکھا کہ وکالت بانس کی طرح سیدھا ہوگیا ہے۔ پوری ذمے داری سے کاروبار میں دلچسپی لینے لگا ہے تو شائستہ کی اور زیادہ قدر ہونے لگی۔

انہوں نے صاف صاف کہہ دیا۔ شائستہ ماں بنے یا نہ بنے۔ وکالت دوسری شادی نہیں کرے گا۔ اس سے اولاد نہ ہو کوئی بات نہیں صداقت تو موجود ہے۔ اس کے لیے کئی اونچے خاندان میں لڑکیاں دیکھی جارہی تھیں۔ شائستہ نے کہا "ابا جان! میں وکالت کے ساتھ یورپ اور امریکہ گھوم کر آنا چاہتی ہوں۔ پھر صداقت بھائی کی شادی کی تیاریاں شروع ہوں گی تو باہر جانے کا موقع نہیں ملے گا۔"

ولایت علی نے اجازت دے دی۔ وکالت بہت خوش تھا۔ اس نے ماں سے کہا "آپ نے مجھے پیدا کیا ہے۔ پیدا تو بکریاں اور بھینسیں بھی کرتی ہیں۔ انسان اور حیوان میں یہ فرق ہے کہ ماں اپنے بچے کو صرف پیدا ہی نہیں کرتی اچھی تعلیم و تربیت دیتی ہے۔ ذہانت سکھاتی ہے اور یہ کام شائستہ نے کیا ہے۔"

"ارے تو اسی کو اماں بنالے۔ میں تو سدا کی بدنصیب ہوں۔ اچھا کرتی ہوں ترا ہوجاتا

ہے۔ ہزار بار کہہ چکی ہوں کہ رضوانہ سے دھوکا کھاگئی تھی۔ کیا ہمیشہ دھوکے کھاکر ہی تیری پرورش کرتی رہی ہوں؟ دودھ میں نے پلایا ہے انگلی پکڑ کر چلنا میں نے سکھایا ہے۔ تعلیم میں نے دلائی ہے۔ اتنی بڑی مل میں تیرے حق کے لیے میں لڑتی آئی ہوں مگر تو صرف ایک غلطی کو سامنے رکھ کر میری برسوں کی ممتا کو مٹی میں ملا رہا ہے۔"

"میں آپ کی محبت سے انکار نہیں کر رہا ہوں لیکن اندھی ممتا اولاد کی تباہی کا باعث بنتی ہے۔"

"ہاں اب تو تو مجھے اندھی ہی کہے گا۔ کچھ عرصے بعد پوچھوں گی جب صداقت کے ہاں اولاد ہوگی اور تو اولاد سے محروم رہے گا۔ اگر سوتیلے کے بچے کو گود میں نہیں لے گا تب بھی اپنے بعد مل کا تمام حصہ اسی کی اولاد کو دے کر دنیا سے جانا ہوگا۔"

یہ بات دل پر گھونسے کی طرح لگتی تھی کہ اپنے حصے کی تمام دولت اور جائداد سوتیلے بھائی کی اولاد کو ملے گی۔ اس نے شائستہ کے پاس آکر پوچھا "کیا تم بھی یہی چاہتی ہو کہ ہماری موت کے بعد دنیا میں ہمارا کچھ نہ رہے؟"

"ایسا کوئی عورت نہیں چاہتی، میں ہر عورت کی طرح چاہتی ہوں کہ جسے میں جنم دوں، اسے ساری دنیا کا حکمران بنادوں۔ اگر ایسا نہ کرسکوں تو اپنے بچوں کو کم از کم ولایت ٹیکسٹائل ملز کا مالک بنادوں۔"

"ہمارے آباؤ اجداد کا شجرہ بیویاں ہی آگے بڑھاتی ہیں۔ مگر تم اس معاملے میں مجبور ہو۔"

"میری زندگی میں مجبوری اور بے بسی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ میں اس خاندان کا وارث ضرور پیدا کروں گی۔"

"کیسے کروگی؟ کیا قدرت سے لڑوگی؟"

"انسان قدرتی حالات سے لڑتے لڑتے آج کے ترقی یافتہ دور تک پہنچا ہے۔"

"آخر تم نے سوچا کیا ہے؟ کرنا کیا چاہتی ہو؟"

"یہ میں سفر کے دوران کل بتاؤں گی۔"

وہ دوسرے دن نیویارک کے لیے روانہ ہوئے۔ جب طیارہ فضا میں معمول کے مطابق پرواز کرنے لگا تو وکالت نے پوچھا "تم نے مجھے تجسس میں مبتلا کردیا ہے، اب تو بتاؤ بچے کے لیے کیا سوچ رہی ہو؟"

شائستہ نے پوچھا "تم ٹیوب بے بی کے متعلق کیا جانتے ہو؟"

"جاننا کیا ہے یہ سراسر ناجائز اولاد ہوتی ہے؟"

"ناجائز اسے کہتے ہیں جو گناہ کی پیداوار ہو اور گناہ اس وقت ہوگا جب کوئی غیر مرد میرے بدن کو ہاتھ لگائے گا۔"

وہ قائل ہو کر بولا ”ہاں کوئی ہاتھ نہ لگائے تو ٹھیک ہے۔ لیکن ...“

”لیکن یہ کہ تم بانجھ نہیں ہو میں بانجھ ہوں تم باپ بن سکتے ہو میں ماں نہیں بن سکتی۔“

”تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟“

”میں چپ چاپ اپنا معائنہ کرا چکی ہوں۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق میں بانجھ ہوں ماں نہیں بن سکتی۔“

وکالت کو غیر شعوری طور پر اپنی برتری کا احساس ہوا اور خوشی ہوئی کہ شائستہ کھلے دل سے اپنے ایک نقص کو تسلیم کر رہی ہے۔ اس نے پوچھا ”پھر کیسے ماں بنوگی؟“

”جس کھیتی میں فصل نہیں ہوتی اس میں دوسری جگہ سے کھاد لاکر ڈالتے ہیں۔ کوئی ایسی عورت جو بانجھ نہ ہو ایک آدھ بچہ پیدا کرچکی ہو‘ اس کے بیضا مجھ میں منتقل کیے جائیں تو میں تمہارے ذریعے ماں بن سکوں گی۔“

”میرے ہی ذریعے بن سکوگی نا؟“

”بالکل ہم وہاں ڈاکٹر سے کنسلٹ کریں گے۔ ڈاکٹر تمہیں وضاحت سے بتائے گا کہ عورت زرخیز ہو اور مرد بانجھ ہو تو طبی ذرائع سے کسی غیر کا مادہ تولید زرخیز عورت میں منتقل کیا جاتا ہے اور اگر میری طرح عورت بانجھ ہو اور تمہاری طرح مرد زرخیز ہو تو کسی دوسری زرخیز عورت کے بیضا مجھ میں منتقل کیے جائیں گے۔ اس معاملے میں کسی اور مرد کی مداخلت نہیں ہوتی۔ میں تمہاری ہی اولاد پیدا کروں گی۔“

وہ خوش ہو کر بولا ”پھر تو مسئلہ ہی حل ہوگیا۔ تعجب ہے میں نے پہلے ٹیوب بے بی کے متعلق کیوں نہیں سوچا۔“

”اس لیے کہ اس سلسلے میں تمہاری معلومات محدود ہیں۔ تمہاری طرح بہت سے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ صرف غیر مرد کا مادہ تولید کسی عورت کی جنین میں فرٹیلائز کیے جاتے ہیں۔ بے شک ایسا اس وقت ہوتا ہے جب شوہر بانجھ ہو اس کی کئی طبی راہیں ہیں۔ جو راہ ہم اختیار کریں گے اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔“

شائستہ نے نیویارک پہنچ کر ایک معروف لیڈی ڈاکٹر سے ملاقات کا وقت مقرر کیا پھر وکالت سے کہا ”یہ عورتوں کے معاملات ہیں۔ اس لیے لیڈی ڈاکٹر پہلی بار تنہائی میں مجھ سے ملاقات کرے گی۔ دوسری ملاقات میں وہ تم سے گفتگو کرے گی اور تمام طریقہ کار سے آگاہ کرے گی۔“

”ٹھیک ہے میں ویٹنگ روم میں بیٹھا رہوں گا۔“

”میری ایک بات مانوگے؟“

”تم اولاد کی خوشخبری دے رہی ہو بھلا تمہاری بات کیوں نہیں مانوں گا بولو۔“

”اپنی امی اور ابا جان کو اس سلسلے میں کچھ نہ بتانا انہیں یہی سمجھنے دینا کہ اولاد قدرتی طور سے ہوئی ہے۔“

”ان سے حقیقت کیوں چھپانا چاہتی ہو؟“

”ہمارے ہاں یہ آنکھ بند کرکے مان لیا گیا ہے کہ ٹیوب بے بی گناہ کی پیداوار ہے۔“

”ہم اپنے بزرگوں کو سمجھائیں گے۔“

”وہ نہیں سمجھیں گے۔ ایک ہی بات کو بنیاد بنائیں گے کہ ہماری اولاد قدرت کا عطیہ نہیں ہے۔ طب اور سائنس کی مرہون منت ہے۔ وہ ہماری اولاد کو شاید قبول کرلیں لیکن صداقت بھائی کی اولاد کے مقابلے میں کمتر سمجھتے رہیں گے اور میں اپنی اولاد کی سبکی اور کمتری برداشت نہیں کرسکوں گی۔“

یہ بات دل کو لگی۔ وہ تائید میں سر ہلا کر بولا ”تم دور کی سوچتی ہو اور پکی بات سوچتی ہو۔ میں امی اور ابا جان کو اس سلسلے میں نہیں بتاؤں گا۔“

وہ دوسرے دن ملاقات کے لیے لیڈی ڈاکٹر کے پاس آئی۔ اسے اپنی پوری ہسٹری سنائی۔ خصوصاً یہ بتایا کہ مسلمان ٹیوب بے بی کے عمل کو گناہ سمجھتے ہیں۔ پاکستانی معاشے میں ایسے والدین اور بچوں کو حقارت کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔ لہٰذا یہ عمل راز داری سے ہوگا تو وہ ضرور ہر قیمت پر ماں بنے گی۔

لیڈی ڈاکٹر نے پوچھا ”تم کیسی رازداری چاہتی ہو؟“

وہ بولی ”میرے شوہر کو صرف یہ بتایا جائے کہ وہ نارمل ہے اور میں بانجھ ہوں۔ صرف میرا علاج کیا جائے گا اس کے بعد میں اپنے شوہر وکالت علی کے بچوں کی ماں بن سکوں گی۔“

”تم اپنے شوہر کو رازدار کیوں نہیں بنا لیتیں؟“

”وہ بیک ورڈ ہے۔ ناخواندہ اور دقیانوسی خیالات کا حامل ہے۔ میں یہ خوشی اسے دینا چاہتی ہوں کہ مجھ سے ہونے والے بچے اس کے ہوں گے۔“

وہ ایک ذرا توقف سے بولی ”میں چاہتی تو یہاں ہزاروں میل دور نہ آتی۔ پاکستان میں ہی گناہ گار بن کر شوہر کو دھوکا دیتی لیکن میرا ضمیر گوارا نہیں کرتا۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی غیر مرد میرے بدن کو ہاتھ لگائے۔ میری پاکیزگی‘ میری شرافت اور میری نیک نیتی کو خدا جانتا ہے۔ یہ بدن جو میرے شوہر کا ہے اسے میں کسی کو نہیں دوں گی لیکن شوہر کے خاندانی شجر کو پھلنے پھولنے کے لیے کہیں سے بھی کھاد لاکر اس کی جڑوں میں ڈالوں گی۔“

ڈاکٹر نے کہا ”میں تم سے تعاون کروں گی تمہیں یہاں کم از کم تین ماہ تک قیام کرنا ہوگا۔ ہوسکتا ہے ایک ماہ میں نتیجہ ظاہر ہوجائے۔ لیکن وقتاً فوقتاً چیک اپ ضروری ہے۔“

"تین ماہ کا عرصہ بہت ہوتا ہے میرا شوہر کاروبار چھوڑ کر یہاں نہیں رہ سکے گا۔ آپ کچھ ایسا کریں کہ میں ضروری مراحل سے گزر کر چلی جاؤں پھر ایک دو ماہ بعد میڈیکل چیک اپ کے لیے آجاؤں۔"

"ایسا ممکن ہے، کل اپنے شوہر کو لاؤ۔ میں تمہارے کیس کو تمہارے نقطہ نظر سے اس کے سامنے بیان کروں گی پھر کل سے ہی تمہارے ٹیسٹ شروع ہو جائیں گے۔"

دوسرے دن وکالت بیوی کے ساتھ لیڈی ڈاکٹر کے پاس آیا۔ وہ ذرا نروس تھا انگریزی کسی حد تک سمجھ لیتا تھا اور اٹک اٹک کر بول لیتا تھا لیکن لیڈی ڈاکٹر کی باتیں اس کے پلے نہیں پڑیں کیونکہ وہ گفتگو کے دوران طبی اصطلاحات استعمال کر رہی تھی اور وہ "یس یس" کہتا ہوا یوں سر ہلا رہا تھا جیسے پورا میڈیکل کورس سمجھ چکا ہو۔ بہرحال شائستہ اسے شادی سے پہلے ہی جدھر موڑتی تھی ادھر وہ مڑتا آیا تھا۔ اس بار بھی اس نے وکالت کو اپنے سانچے میں ڈھال لیا۔

انہوں نے وہاں ایک ماہ تک قیام کیا۔ شائستہ ہر ہفتہ یا دس دن بعد اسپتال میں دو چار روز کے لیے داخل ہوتی تھی پھر وکالت کے ساتھ دن رات گزارتی تھی۔ ایک ماہ کے بعد لیڈی ڈاکٹر نے کہا "تم ماں بننے والی ہو۔ ایسے مرحلے میں تمہیں ہماری نگرانی میں رہنا چاہیے۔ پندرہ بیس دن اور یہاں قیام کرو۔"

وکالت نے کہا "ایسی خوشخبری سننے کے بعد تو ہم یہاں نو ماہ تک بھی رہ جائیں گے۔ میں ابھی ابا جان سے بات کرتا ہوں۔"

اس نے فون پر رابطہ کیا۔ ولایت علی کو دادا بننے کی خوشخبری سنائی۔ باپ نے بے انتہا خوشی کا اظہار کیا۔ بیٹے نے کہا "شائستہ بہت کمزور ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر نے یہاں اور ایک ماہ رہنے کا مشورہ دیا ہے۔ آپ پچیس لاکھ کا چیک بھیج دیں۔ میں یہاں آپ کے اکاؤنٹ سے رقم حاصل کرلوں گا۔ شائستہ کی طبیعت سنبھلتے ہی واپس آجاؤں گا۔"

یہ خوشخبری بیگم سعدیہ کے کانوں میں پڑی تو وہ چند لمحوں تک سکتے میں رہ گئیں۔ ولایت علی نے پوچھا "کیا ہوا؟ کیا تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟"

"آں؟ ہاں مگر یقین نہیں آرہا ہے۔ وہ ماں کیسے بن رہی ہے؟"

"اللہ کی دین ہے اور کیا؟"

"اللہ اچانک کیسے دے رہا ہے؟"

"کیا اللہ میاں تم سے پوچھ کر دیں گے۔ پانچ برس کے انتظار کے بعد بہو کی گود بھر رہی ہے اور یہ تمہارے لیے اچانک ہے یعنی بچہ جلدی آرہا ہے یا تم سے پوچھے بغیر آرہا ہے!"

"آپ تو الٹی سیدھی ہانکنے لگتے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں مجھے خوشی نہیں ہو رہی ہے؟

میرا بیٹا باپ بننے والا ہے۔"

وہ بولتے بولتے سوچنے لگیں۔ امریکہ سے یہاں گندم آسکتا ہے تو کیا بچے نہیں آسکتے؟ لیکن گندم سود اور قرض پر آتی ہے۔ وہ بچہ کس سے قرض لیا گیا ہے؟

بیگم سعدیہ کا دھیان ٹیوب بے بی کی طرف نہیں گیا لیکن دل کہہ رہا تھا کہ بہو کوئی فراڈ کر رہی ہے۔ وکالت کو رازدار بنا کر کسی کی اولاد گود لینے والی ہے۔ علاج کے بہانے نو ماہ وہاں رہ جائے گی اور کسی کا بچہ گود میں لے آئے گی۔ وہ بولیں "دیکھیے جی! بہو کو ایک ماہ کے بعد یہاں آنا چاہیے۔ وہ زچگی تک ہماری آنکھوں کے سامنے رہے گی۔"

"وہ ایک ماہ بعد ہمارے بیٹے کے ساتھ آجائے گی۔"

واقعی ایک ماہ بعد وہ وکالت کے ساتھ آگئی۔ بیگم سعدیہ نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولی "پیاری امی جان! کچھ دیکھنا ہے تو اور ایک دو ماہ انتظار کریں۔ آنکھیں پھاڑنے سے میرا پیٹ نہیں پھولے گا۔"

بیگم سعدیہ کو حماقت کا احساس ہوا کہ وہ دو ماہ میں ظاہری آثار دیکھنا چاہتی تھیں۔ اس حماقت کے ظاہر ہونے پر تلملا کر بولیں "مجھے کیا پڑی ہے کہ تمہارا پیٹ دیکھوں۔ مجھے تو پوتا چاہیے۔ اس خاندان میں ہمیشہ پہلے نر اولاد ہوتی ہے۔"

شائستہ نے کہا "نر اولاد کے لیے اللہ میاں سے کہنا ہوگا اور یہ کہنے کے لیے آپ کو اللہ میاں کے پاس جانا ہوگا۔"

وہ غصے سے آگ بگولہ ہو کر بولیں۔ "میں کیوں جاؤں، تم جاؤ اللہ کرے کھڑی کھڑی فنا ہو جاؤ۔"

وکالت نے کہا "یہ کیا ہو رہا ہے امی؟ اولاد کی امید پوری ہو رہی ہے تو آپ شائستہ کو مرنے کی بد دعا دے رہی ہیں۔"

"اور وہ جو مجھے مرنے کی بد دعا دے رہی ہے؟"

"یہ کہہ رہی ہے کہ آپ اللہ میاں کے پاس نر اولاد کی دعا مانگیں۔ اس میں مرنے کی بات کہاں سے آگئی۔ کیا آپ کچھ مانگنے ابا جان کے پاس نہیں جاتی ہیں؟ کیا ہم کچھ طلب کرنے اللہ میاں کے پاس مسجد میں نہیں جاتے ہیں؟"

شائستہ نے کہا "امی جائے نماز بچھا کر دعا مانگنے بیٹھیں گی تو معلوم ہوگا کہ اللہ میاں کے حضور میں ہیں مگر یہ میری بات کا مطلب غلط لے رہی ہیں جس کی جیسی نیت ہوتی ہے ویسی ہی بات سمجھ میں آتی ہے۔"

بیگم نے تنبیہہ کے انداز میں انگلی اٹھا کر کہا "دیکھ شائستہ! میرے منہ نہ لگنا۔"

وہ جاتے ہوئے بولی "آپ برش کر کے آئیں گی تب بھی منہ نہیں لگوں گی۔"

بیگم سعدیہ ایسے موقعوں پر شعلوں میں سلگنے لگتی تھیں۔ بہو گفتار کی غازی تھی اور

رفتار میں پیچھے چھوڑ جاتی تھی۔ اس نے ساس کی لائی ہوئی دوسری بہو کو کوٹھی میں قدم نہیں رکھنے دیا تھا۔ باہر ہی باہر اسے طلاق دلوادی تھی۔ پھر ناممکن کو ممکن اور انہونی کو ہونی بنا رہی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا ماں بننے کے آثار پیش کرتی جارہی تھی۔ مرد کامیاب ہوکر سینہ تان کر چلتا ہے وہ پیٹ نکال کر فخریہ انداز میں چلتی تھی۔ ساس کا بلڈ پریشر ہائی ہوگیا تھا۔

وہ فون کے ذریعے نیویارک کی لیڈی ڈاکٹر سے رابطہ رکھتی تھی اور اس کے مشوروں پر عمل کرتی رہتی تھی۔ آٹھویں ماہ میں وکالت ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق پھر اسے نیویارک لے گیا۔ ان دنوں بیگم سعدیہ نے نماز شروع کردی۔ پانچوں وقت سجدے کرنے لگیں۔ فارغ اوقات میں تسبیح پڑھتی جاتی تھیں اور تسبیح کے ہر دانے کے ساتھ دعائیں مانگتی تھیں۔ "یااللہ! یا میرے پروردگار! خیر خیریت سے پوتا ہوجائے' میرا بیٹا میرے پوتے کو لے کر خیر خیریت سے آجائے۔ وہ دشمن نہ آئے' اسے کچھ ہو جائے۔ زچگی میں بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ اس کا بھی کام تمام ہوجائے۔ میرے مالک! تو دعائیں قبول کرتا ہے آج ایک بد دعا بھی قبول کرلے۔ میں ایک سو ایک دیگیں پکواؤں گی۔"

وہ بد دعا دیتے وقت ایسے جذب کے عالم میں ہوتی تھیں کہ تسبیح کا دھاگا ٹوٹ جایا کرتا تھا اور دانے بکھر جاتے تھے۔ ایسے وقت دل کہتا تھا کہ شاید بد دعا لگ گئی ہے اور وہ تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر گئی ہے۔ اپنی زندگی سے ٹوٹ گئی ہے۔ اللہ کرے ٹوٹ گئی ہو۔

دسویں ماہ کے آغاز میں بیٹے نے وہاں سے منحوس خبر سنائی کہ شائستہ بالکل خیریت سے ہے۔ شاید بیٹے کے مرنے کی خبر بھی اتنی صدمات سے بھرپور نہ ہوتی جتنی بہو کے جی رہنے کی خبر تھی۔ پھر یہ خوشخبری ساتھ تھی کہ ایک نہیں دو بچے ہوئے ہیں۔ ایک پوتا ایک پوتی۔

دو بچوں کو جنم دینے میں مرنے کا چانس زیادہ تھا۔ بیگم کو یوں لگا جیسے بد دعاؤں نے دعاؤں کا کام کیا ہے اور مرنے کا چانس ختم کیا ہے۔ انہوں نے جائے نماز اٹھا کر ایک گوشے میں ڈال دی۔ آئندہ نماز سے توبہ کرلی۔ نماز کے لیے ہاتھ باندھنے سے پہلے نماز کی نیت کی جاتی ہے۔ نیت درست نہ ہو تو نماز کبھی قبول نہیں ہوتی۔ بیگم نے توبہ کرکے طریق بندگی پر احسان کیا تھا۔

بیٹا اور بہو دونوں بچوں کو لے کر آگئے۔ ولایت علی کی خوشیوں کا ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ جشن منانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ بیگم سعدیہ کو بیٹے کی اولاد دیکھنے کا بڑا ارمان تھا۔ انہیں گود میں کھلانے کی شدید تمنا تھی لیکن وہ پوتے پوتی کو گود میں لینے سے جھجکنے لگیں۔ وہ بالکل انگریز کے بچے لگ رہے تھے۔ اگرچہ وکالت بھی گورا چٹا تھا۔ پھر بھی بچے باپ سے میل نہیں کھا رہے تھے۔ زمیں آسمان کا فرق تھا بلکہ فرق ہی فرق تھا۔ دیکھا جائے تو کوئی

ضروری نہیں ہے کہ بچے باپ سے مشابہت رکھتے ہوں۔ بچے کالے پیلے' گورے چٹے اور نکٹے چپٹے بھی ہوتے ہیں۔ کہیں بالکل مشابہت ہوتی ہے اور کہیں نام کو مشابہت نہیں ہوتی لیکن بیگم کھٹک گئیں۔ ان میں سے کسی کو فوراً ہی گود میں نہیں لیا۔ وکالت نے پوتے کو ان کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا "دیکھیں امی! میرے بیٹے کی پیشانی بالکل میری طرح کشادہ ہے۔ بڑی نصیبوں والا ہوگا۔"

شائستہ اپنی بیٹی کو دونوں ہاتھوں پر رکھ کر بیگم سعدیہ کے سامنے کرتے ہوئے بولی "ذرا اسے دیکھیں امی! اس کی آنکھیں تو بالکل آپ کے جیسی ہیں۔ بڑی ہوگی تو دادی پوتی ایک لگیں گی۔"

وہ اندر ہی اندر کڑھ رہی تھیں۔ یہ واضح طور پر نہیں کہہ سکتی تھیں کہ بچے اپنے باپ اور دادی پر نہیں گئے ہیں۔ ان کے سامنے ولایت علی کبھی پوتی کو چوم رہے تھے اور کبھی پوتے کو گود میں لے رہے تھے اور جشن منانے کے سلسلے میں احکامات صادر کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ اس خوشی کے موقع پر صداقت کی بھی منگنی کردی جائے گی پھر چار چھ ماہ میں دوسری بہو لے آئیں گے۔ اس کے بعد بڑی بہو بھی اولاد کی خوشیاں دے گی۔

ولایت علی نے خوشی کی تقریب میں پوتے کا نام سعادت علی اور پوتی کا نام زینت رکھا۔ ناچ گانے اور کامیڈی کے پروگرام رات بھر جاری رہے۔ ولایت علی رات بھر مبارکباد وصول کرتے کرتے تھک گئے' صبح بیمار پڑ گئے۔ بیماری کی وجہ یہ بھی تھی کہ صداقت نے پھر شادی کا معاملہ ٹال دیا تھا۔ ایک تو اسے کوئی لڑکی پسند نہیں آئی تھی۔ دوسرے کاروبار کے سوا کوئی دوسری بات نہیں کرتا تھا۔ اس نے باپ سے کہا "اولاد کی خوشیاں پوری ہو رہی ہیں۔ اب میں دو چار برس بعد شادی کروں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

ولایت علی کو پچھلے تین برسوں مین دوبار دل کا دورہ پڑچکا تھا۔ خلاف مزاج کوئی بات ہو تو بلڈ پریشر بڑھ جاتا تھا۔ وکالت کی طرف سے ملنے والے پوتے پوتی نے انہیں صداقت کے انکار کا زیادہ اثر نہیں لینے دیا تھا۔ وہ دو بچوں سے بہل گئے تھے۔

پھر رفتہ رفتہ یہ بات انہیں کھٹکنے لگی کہ بیگم سعدیہ بچوں سے کتراتی تھیں۔ انہوں نے پوچھا "کیوں بچوں سے دور رہتی ہو؟"

بیگم نے جواب دیا "بس یونہی' بچوں پر محبت آئے گی تو میں خود ہی بڑھ کر انہیں گود میں لوں گی۔"

"محبت کیوں نہیں آرہی ہے؟ تم تو بیٹے کی اولاد کے لیے ترستی تھیں۔ دعائیں مانگتی تھیں۔ منتیں مانتی تھیں اب کیسے دل پھر گیا ہے؟"

"میں کیا بتاؤں؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بچے مجھے اپنی طرف مائل کیوں نہیں

کرتے ہیں؟"

"میں بتاتا ہوں تم نے شائستہ کو کبھی دل سے بہو تسلیم نہیں کیا ہے۔ اس کی طرح اس کی اولاد کو بھی دشمن سمجھتی ہو اور یہ بھول جاتی ہو کہ ان بچوں کا باپ تمہارا بیٹا ہے۔"

"لیکن بچے باپ سے بالکل مختلف ہیں ان پر باپ کی پرچھائیں تک نظر نہیں آتی ہے۔"

"کیا؟" ولایت علی نے شدید حیرانی سے پوچھا "کیا تم بہو کو بدکار اور میرے پوتے پوتی کو ناجائز کہتی ہو؟"

"یہ میرا دل کہتا ہے میرا دماغ کہتا ہے کہ انہیں اپنا نہ سمجھو۔"

"یہ تمہارے اندر شیطان کہتا ہے۔ تمہارے اندر کی دشمنی ایسا کہتی ہے آئندہ تمہاری زبان سے ایسے الفاظ نکلے تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

"آپ یہاں کے حاکم ہیں۔ حکم دے رہے ہیں تو زبان بند رہے گی لیکن حقیقت ایک دن ضرور سامنے آئے گی۔"

ولایت علی نے بے بسی سے کہا "برسوں سے ساس بہو کے جھگڑے دیکھتا آرہا ہوں کتنے ہی معاملات میں شائستہ درست ثابت ہوئی اور تمہاری غلطیاں پکڑی گئیں۔ اس بات نے تمہیں اور زیادہ بہو کا دشمن بنا دیا ہے۔ میری ایک بات مان لو۔ ایک بار محبت سے شائستہ کو گلے لگالو۔ اسے ممتا سے دیکھو تو اس کی کوکھ سے پیدا ہونے والے بچے تمہیں بالکل اپنے لگیں گے۔ جو کھوٹ نظر آرہا ہے وہ ختم ہوجائے گا۔ یہ بچے ہمارے خاندانی شجر کی پھیلتی اور بڑھتی ہوئی شاخیں ہیں۔ ہم فخر سے سینہ تان کر سوسائٹی میں کہتے ہیں کہ یہ ہماری آئندہ نسل ہیں۔ تمہیں بھی فخر کرنا چاہیے۔ ہمارے بڑھاپے میں آئندہ نسل کا غرور نہیں رہے گا تو پھر ہمارے پاس کیا رہ جائے گا؟ کچھ نہیں اور کچھ نہ حاصل کرنے سے بہتر ہے اسے محبت سے حاصل کرو جو مل رہا ہے۔"

وہ اٹھ کر جاتے ہوئے بولیں "آپ مجھے آنکھوں دیکھی مکھی نگلنے کو کہہ رہے ہیں۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔"

وہ چلی گئیں۔ ولایت علی سوچ میں پڑ گئے۔ بچے دیسی نہیں لگتے تھے۔ فارن آئٹم دکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے دل کو سمجھایا۔ ایسا شاید اس لیے ہے کہ بہو کا پیر بھاری ہونے کے دنوں میں وہ وکالت کے ساتھ فارن کی آب و ہوا میں تھی۔ پھر زچگی بھی وہیں ہوئی تھی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت کم بچے ماں باپ سے مشابہت رکھتے ہیں۔ ورنہ حمل کے قیام سے زچگی تک عورت غیر شعوری طور پر جس آئیڈیل کے متعلق سوچتی رہتی ہے۔ بچے اسی کے مطابق وجود میں آتے ہیں۔

وہ لاحول پڑھتے ہوئے بڑبڑائے "شیطان ہمیشہ عورت کے ذریعے بہکاتا ہے۔ اسی لیے بیگم کے دل میں شک و شبہات کا شیطان بھڑکتا رہتا ہے اور یہ بیگم صاحبہ مجھے بہو سے بدظن کرنے کی سعی میں مصروف رہتی ہیں پھرایک بار لاحول ولا قوۃ۔"

شائستہ کے ستارے عروج پر تھے۔ اس پر کوئی الزام نہیں آسکتا تھا۔ تقدیر مہربان ہوتی جارہی تھی۔ کوئی دو برس بعد تقدیر پھر مہربان ہوئی۔ اس خاندان میں ایسا المیہ پیش آیا جس کی توقع نہیں تھی۔ صداقت علی کار کے ایک حادثے میں ہلاک ہوگیا۔

یہ اتنا بڑا صدمہ تھا کہ ولایت علی بیٹے کی ٹوٹی پھوٹی لاش دیکھتے ہی کھڑے کھڑے گر پڑے پھر ان میں خود سے اٹھنے کی سکت نہ رہی۔ رشتے داروں نے انہیں اٹھا کر بستر پر ڈالا۔ تب سے وہ بستر کے ہی ہو کر رہ گئے۔ اس المیے کا فائدہ شائستہ اور وکالت کو پہنچا۔ وکالت تمام کاروبار جائداد اور تمام بینک بیلنس وغیرہ کا مالک و مختار ہوگیا اور شائستہ کے دونوں بچے مستند ہوگئے۔ اب ان بچوں پر شبہ کرکے خاندان کے بڑھنے والے شجر کو کاٹا نہیں جاسکتا تھا۔

صدمے کی شدت سے ولایت علی کی آواز بند ہوگئی تھی۔ ہاتھ پاؤں میں جان نہیں رہی تھی۔ ملازم انہیں اٹھا کر بٹھاتے تھے۔ بیگم سعدیہ چمچے سے رقیق غذا منہ میں ڈالتی تھیں کیونکہ ٹھوس خوراک ہضم نہیں ہوتی تھی۔ ان سے کوئی بات کہی جاتی تو وہ دیدے پھیلا کر سنتے تھے اور آنکھوں کے اشاروں سے ہی جواب دیتے تھے۔ ہاتھوں میں لکھ کر جواب دینے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔

شائستہ سائے کی طرح وکالت کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ مل کے معاملات میں بھی اس کا عمل دخل بڑھ گیا تھا۔ وہ دوست احباب کو شوہر سے دور رکھتی تھی تاکہ کوئی اسے عیاشی اور آوارگی کی راہ پر نہ لے جائے۔ اسے بیگم ای کے ساتھ کہیں جانے کا موقع نہیں دیتی تھی۔ کاروبار کو قائم رکھنے اور منافع بڑھانے کے لیے وکالت جتنی محنت کرتا تھا۔ شائستہ اتنی ہی محنت اور ذہانت سے وکالت کو اپنی مٹھی میں رکھنے میں کامیاب تھی۔وہ چند برسوں میں اسے اس مقام پر لے آئی تھی جہاں کاروبار تو شوہر ہی کا تھا لیکن تمام آمدنی اور جائداد اپنے نام کرچکی تھی۔ وکالت کو چیک لکھ کر دیتے وقت اسے بچہ بناکر پوچھتی تھی "اتنی رقم کیا کروگے؟ بہت فضول خرچ ہوتے جارہے ہو اپنی عادتیں سدھارو ورنہ جمعرات بھری مراد نہیں ہوگی۔"

دونوں بچے آٹھ برس کے ہوگئے تھے۔ شائستہ کو ان کی تعلیم و تربیت کے لیے وکالت سے کبھی کبھی دور رہنا پڑتا۔ وہ اس بات کی قائل نہیں تھی کہ بچوں کو گورنس کے حوالے کردیا جائے اور تعلیم کے لیے ٹیوشن پڑھانے والوں کی خدمات حاصل کی جائیں۔ وہ بچوں کی پرورش ذاتی توجہ سے کر رہی تھی۔ ایسے وقت بیگم سعدیہ کو موقع ملا۔ انہوں نے ایک

دن تنہائی میں بیٹے سے پوچھا۔ "بیٹے! میری ایک الجھن دور کردو۔ شائستہ بانجھ تھی پھر ماں کیسے بن گئی؟"

"علاج کے ذریعے۔"

"کیسا علاج ہوا تھا؟ کہاں ہوا تھا؟ کسی لیڈی ڈاکٹر نے کیا تھا یا مرد ڈاکٹر نے؟"

"میں آپ کے سامنے وضاحت سے کہہ نہیں سکتا۔ بہتر ہے آپ شائستہ سے پوچھ لیں۔ یا ٹیوب بے بی کا کورس پڑھ لیں۔"

"کیا ٹیوب بے بی؟"

"دیکھیں آپ شبہ نہ کریں۔ شائستہ نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے اور میں بے غیرت نہیں ہوں۔ ان دو بچوں نے ثابت کردیا ہے کہ میں نارمل ہوں۔ شائستہ میں نقص تھا' وہ علاج کے ذریعے دور ہوگیا۔"

"میں ایسی بھی جاہل گنوار نہیں ہوں کہ ٹیوب بے بی کے طریقہ کار کو نہ سمجھوں اور اسے علاج مان لوں۔ تم نے کیسے مان لیا کہ نارمل ہو؟"

"میرے بچے ثبوت ہیں۔"

"بچوں سے پہلے کیا ثبوت تھا کیا تم نے طبی معائنہ کرایا تھا؟"

"جی نہیں۔ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔"

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے بیٹے کو دیکھنے لگیں۔ پھر بولیں "بیٹا! میں نے تجھے نو مہینے پیٹ میں رکھا تجھے پیدا کیا تجھے دودھ پلایا۔ تجھے کچھ ہو جاتا تھا تو رات بھر تیرے سرہانے جاگتی رہتی تھی۔ میری ان تمام محبتوں اور خدمتوں کا صرف ایک صلہ دے دے۔ میری ایک چھوٹی سی بات مان لے۔"

"امی! آپ حکم دیں۔ اتنی عاجزی سے باتیں نہ کریں۔"

"کیا بات مانے گا؟"

"ضرور آپ فرمائیں۔"

"میں کل صبح ڈاکٹر سے وقت لیتی ہوں تو طبی معائنہ کرالے۔"

"امی! اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ ایسا سنہری موقع ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتی تھیں دونوں ہاتھ جوڑ کر بولیں "زندگی میں پہلی بار پیدا کرنے والی ماں ہاتھ جوڑ کر التجا کرتی ہے جب تو نارمل ہے تو اعتراض کس بات کا؟ معائنہ کرالے اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی کردے۔"

وہ ماں کے ہاتھوں کو تھام کر بولا "آپ ہاتھ جوڑ کر شرمندہ نہ کریں۔ آپ ڈاکٹر سے ٹائم لیں میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔"

"خوش رہو۔ سدا سلامت رہو بیٹے! تم نے دودھ کا حق ادا کردیا۔ ایک بات اور مان

لو جب تک میڈیکل رپورٹ نہ آئے تب تک ڈاکٹر کے پاس جانے والی بات شائستہ کو نہ بتانا۔"

"امی! اسے معلوم ہوگا تو کیا ہوجائے گا۔"

"بہت کچھ ہو جائے گا۔ وہ بہت چالاک ہے معائنہ نہیں ہونے دے گی۔ اتنی مکار ہے کہ بھاری رشوت کے ذریعے رپورٹ بدل دے گی۔ وہ کچھ بھی کرسکتی ہے۔ میں اس کے منہ لگنا نہیں چاہتی یہ کام چپ چاپ کرنا چاہتی ہوں۔"

"اچھی بات ہے آپ کہتی ہیں تو شائستہ سے نہیں کہوں گا لیکن آپ سوچ لیں جب بھی آپ کی باتوں پر چلتا ہوں تو نقصان اٹھاتا ہوں۔"

"ماں کی جان! آخری بار مجھ پر بھروسہ کرلے اگر تجھے ذرا بھی نقصان پہنچا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔"

بیٹے نے رازداری کا وعدہ کرلیا لیکن یہ بیگم سعدیہ کی کم بختی تھی کہ وہ جمعرات کی شام تھی۔ اس رات بیٹے پر بہو کی محبتیں اور مہربانیاں نازل ہوا کرتی تھیں اور وہ شادی کے بارہ برس بعد بھی سحر زدہ ہوتا رہتا تھا۔ ان بارہ برسوں میں شائستہ لہو بن کر اس کی رگوں میں دوڑتی رہی تھی۔ شب خیرات کے لمحات میں اپنے خیالات اس کے اندر ٹھونس دیتی تھی اور اس کے اندر سے جو اگلوانا چاہتی تھی سانپ کے منکے کی طرح اگلوالیتی تھی۔

تیس برس کے بچے نے بیوی کی ممتا پالیسی کے آگے فرفر سارا سبق سنادیا۔ اس نے پوچھا "کیا ڈاکٹر کے پاس جاؤگے؟"

"کل جمعہ ہے' ڈاکٹر نے ہفتے کو بلایا ہے۔ تم اعتراض نہ کرو۔ جبکہ اچھی طرح جانتی ہو مجھ میں نقص نہیں ہے۔"

"نقص ہے۔"

"کیا؟" اس نے چونک کر پوچھا۔ پھر ہنستے ہوئے کہا "کیوں مذاق کرتی ہو۔"

"میں سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں تم بانجھ ہو۔"

"کیا سچ کہہ رہی ہو؟ مگر تم نے تو کہا تھا میں بالکل نارمل ہوں۔"

"بے شک ایک شوہر کی حیثیت سے بالکل نارمل ہو لیکن تمہارے خون میں باپ بننے کے جراثیم نہیں ہیں۔"

"پھر میں باپ کیسے بن گیا؟"

"ٹیوب بے بی سسٹم سے۔"

وکالت کو چپ سی لگ گئی۔ اسے غصہ آنا چاہیے تھا لیکن بارہ برسوں کی شناسا بانہوں میں تھا۔ چہرہ دل کی دھڑکن سے لگا ہوا تھا۔ اوپر سے سیاہ زلفوں نے ڈھانپ رکھا تھا اور وہ جیسے الجھا ہوا سا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ شائستہ اس کا سر سہلاتے ہوئے کہہ رہی

تھی "عقل سے سوچو- میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے- یہ بدن صرف تمہارے لیے ہے اسے کسی نے ہاتھ نہیں لگایا ہے-"

"پھر بھی کوئی تو ان بچوں کا باپ ہے؟"

"کون ہے؟ تم نہیں جانتے- میں بھی نہیں جانتی- جس مادے نے مجھے ماں بنایا' اس کی کوئی صورت نہیں تھی اس کا کوئی نام نہیں تھا- اس کی کوئی شناخت نہیں تھی-"

"پھر بھی کوئی پرائی چیز تم نے قبول کی-"

"جسمانی گناہ کے بغیر قبول کی- کسی نامحرم کے پاس نہیں گئی- کوئی نامحرم میرے پاس نہیں آیا- گناہ وہ ہوتا جب رضوانہ تمہیں فریب دے کر کسی بازاری مرد سے بچہ لاتی اور تمہارے نام کرتی-"

"ہاں مانتا ہوں تم نے بازاری انداز اختیار نہیں کیا لیکن کیا..."

"لیکن ویکن میں نہ الجھو- یہ بتاؤ ایک شریف اور باضمیر عورت کے لیے اس سے محفوظ اور آبرومندانہ راستہ کیا ہوگا کہ وہ اپنے شوہر کے اعتماد اور غیرت کو بھی قائم رکھے' نامحرم سے بھی دور رہے اور اگلی نسل پیدا کرنے کے خاندانی تقاضے بھی پورے کرے- تم لوگ خاندانی شجرہ قائم رکھنے کے لیے ...اولاد بھی چاہتے ہو اور عورت سے وفا بھی چاہتے ہو جبکہ باپ بننے کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہو-"

وہ ایک ذرا توقف سے بولی "میں عورت ہوں- حیا سے جینا چاہتی ہوں- کسی غیر مرد کی نظروں میں اپنے شوہر کو گرانا نہیں چاہتی- اتنی بڑی دنیا میں کوئی ایسا شخص ہے جو دعویٰ کرے کہ اس نے تنہائی میں تمہاری بیوی کا ہاتھ پکڑا ہے؟"

وہ قائل ہو رہا تھا- کوئی اس کی شریک حیات کو فتح کرنے کا دعویٰ نہیں کرسکتا تھا کہیں سے ایک ذرا سی کیچڑ نہیں آسکتی تھی-

اس نے کہا "میں تمہیں الزام نہیں دوں گا- امی نے سوکن لاکر تمہیں مجبور کیا- ابا جان بھی یہی چاہتے تھے ہماری نسل آگے بڑھے خواہ کسی بھو سے بڑھے- غلاظت بھری کھاد کے بغیر کوئی شجر نہیں پھلتا اور پھلتا پھولتا دیکھنے کی آرزو رکھنے والے یہ نہیں سوچتے کھاد کہاں سے آئی ہے- لیکن ..."

وہ پیار سے سر سہلاتے ہوئے اس کی پیشانی کو چوم کر پچکارتے ہوئے بولی "تمہارے اندر جتنے "لیکن" ہیں سب اگل دو کوئی بات پھانس بن کر نہ رہے-"

"وہ بات یہ ہے کہ بچے تو ہمارے نہ ہوئے؟"

وہ بولی "میرے ہیں وہ نو ماہ تک میرے خون میں حیات پاتے رہے انہوں نے مجھ سے جنم لیا اور میرا دودھ پیتے رہے میری ممتا کا ایک ایک لمحہ ان کے لیے ہوتا ہے اور ان کی زندگی کی ایک ایک سانس میری ممتا کی بقا کے لیے ہوتی ہے وہ سر سے پاؤں تک اور ازل

سے ابد تک میرے ہیں اور جو میرے ہیں وہ کیا تمہارے نہیں ہیں؟"

"بے شک تم میری ہو تم نے میرے لیے انہیں جنم دیا ہے- اس لیے وہ میرے ہیں لیکن ..."

وہ خاموش رہی اس اعتماد کے ساتھ کہ ہر "لیکن" کا جواب موجود ہے-

اس نے کہا "لیکن ہمارے خاندانی شجرے میں کیا لکھا جائے گا-"

"اس معاشرے میں اور اس دنیا میں کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے قیامت کے دن ماں کے نام سے شجرہ بیان کیا جائے گا ہر بچے کو اس کی ماں کے نام سے پکارا جائے گا کیا تم کلام پاک کی آیت سے انکار کروگے؟"

"نہیں توبہ- خدا ہمیں معاف کرنے والا ہے سعادت علی اور زینت میرے بچے ہیں اور ابا جان میری ہی ولدیت سے ان کے نام شجرے میں لکھ چکے ہیں لیکن ...لیکن امی کی زبان بند نہیں ہوگی- وہ تم سے انتقام لینے کے لیے اس راز کو راز نہیں رہنے دیں گی-"

"تم امی سے کتنا نقصان اٹھاؤگے؟ کب تک انہیں عذاب کی طرح سر پر مسلط رکھوگے؟"

"وہ تو جب تک زندہ ہیں مسلط رہیں گی-"

"میں اب انہیں برداشت نہیں کروں گی- وہ کسی وقت بھی ہمارے بچوں کو نقصان پہنچا سکتی ہیں- ان سے ابھی جاکر کہہ دو- وہ صبح بہادر آباد والے فلیٹ میں منتقل ہوجائیں-"

"نہیں شائستہ! یہ کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

"کیا انہوں نے تمہیں بازاری عورت کے چکر میں نہیں پھنسایا تھا؟"

"ہاں یہ ان کی غلطی تھی..."

"تمہیں حوالات مین جانے سے کس نے بچایا؟ میں نے یا تمہاری ماں نے؟"

"تم نے-"

"تمہیں ایک فراڈ عورت کے ناجائز بچوں کا باپ بننے سے کس نے روکا؟"

"تم نے-"

"صداقت بھائی کو گھر سے نکال کر تمہارے قدم یہاں کس نے جمائے؟"

"تم نے-"

"آج تک جو کچھ یہاں ہوتا رہا اس پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ وہ حماقتیں کرکے تمہیں ذلت کے راستے پر لے جاتی رہیں اور میں تمہیں ترقی' عزت اور وقار کی راہوں پر لاتی رہی جو ماں اپنے بیٹے سے نادانی میں دشمنی کرتی ہو وہ میرے بچوں کو کب چھوڑے گی؟"

"تم بہت پکی اور سچی باتیں کرتی ہو لیکن امی کو یہاں سے نکالا جائے گا تو دنیا کیا کہے گی؟"

"صداقت بھائی کو نکالا گیا تھا تو دنیا نے کیا کہا تھا؟"

"اس وقت ہم نے دنیا کی پروا نہیں کی تھی۔"

"آج بھی نہیں کریں گے۔"

"ٹھیک ہے لیکن ابا جان کیا کہیں گے؟"

"ان کی تو آواز بند ہوگئی ہے۔ وہ کچھ نہیں کہیں گے۔"

"لیکن امی ان کے سامنے فریاد کریں گی۔"

"وہ دیواروں سے فریاد کریں گی۔ ابا جان ایسی دیوار بن چکے ہیں جن سے آوازیں ٹکرا کر واپس ہوجاتی ہیں۔"

وہ سوچ میں پڑگیا۔ شائستہ نے کہا "ہمارے دو بچوں سے خاندان کا نام روشن رہے گا۔ نام روشن رکھنا چاہتے ہو تو ماں کو اس گھر سے بجھوا دو۔ وہ فلیٹ میں رہیں گی تو رشتہ نہیں ٹوٹے گا۔ تم جب چاہوگے میرے ساتھ وہاں جاکر ان سے ملاقات کروگے اگر انہیں یہاں سے رخصت نہیں کروگے تو کل صبح میں بچوں کو لے کر چلی جاؤں گی یا اسی کمرے میں اپنی جان دے دوں گی۔"

"ایسا نہ کہو میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔"

"تو پھر جاؤ اور ماں سے بوریا بستر باندھنے کے لیے کہو۔"

"ٹھیک ہے مگر ابھی ... ابھی تو جمعرات پوری نہیں ہوئی ہے۔"

"پوری ہوجائے گی۔ میں کہیں بھاگی تو نہیں جارہی ہوں۔"

اس نے بانہوں سے الگ کردیا۔ وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے یوں محسوس کرنے لگا جیسے جنت سے نکالا جارہا ہو۔ اگر حکم کی تعمیل نہ کی اور جلد واپس نہ آیا تو ممتا کے جنم میں دم گھٹ جائے گا۔

اس نے ماں کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھل گیا۔ بیگم سعدیہ نے کچھ پوچھنا چاہا۔ اس سے پہلے بہو کے بیڈ روم کی طرف نظر گئی بہو اپنے دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ بیگم نے بیٹے سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

بیٹے نے کہا "بات کچھ نہیں ہے شیر اور بکری ایک گھاٹ میں پانی نہیں پی سکتے۔ جب تک آپ یہاں رہیں گی شائستہ کے خلاف سازشیں کرتی رہیں گی۔"

"لڑکے! تونے پھر پٹڑی بدل دی۔ کیا مجھے گھر سے نکالنے آیا ہے؟ کیا میں ہی سازشیں کرتی ہوں کیا اولاد کے بہانے اس نے تیری ناک نہیں کاٹی ہے؟"

"آپ فضول باتیں نہ کریں اگر آپ میرے بچوں کو میرا نہیں سمجھتی ہیں اور دادی

کہلانے سے انکار کرتی ہیں تو میں آپ کو ماں کہنے سے انکار کرتا ہوں۔"

"تیرے انکار کرنے کے باوجود میں ماں رہوں گی اور وہ جو مجھے یہاں سے نکالنا چاہتی ہے اسے کل ہی میں یہاں سے دھکے دے کر نکالوں گی یہ میرے شوہر ولایت علی کی کوٹھی ہے۔"

"آپ جانتی ہیں' اب یہ ابا جان کی نہیں رہی' مل کوٹھی اور تمام جائداد میری ہے۔ اس میں کچھ حصہ آپ کا ہے۔ یہ کوٹھی میں شائستہ کے نام لکھ چکا ہوں۔"

بیگم سعدیہ نے چونک کر بیٹے کو بے یقینی سی دیکھا۔ شائستہ نے اپنے دروازے پر سے کہا "میں اسی وقت اس کوٹھی کے کاغذات دکھاکر دھکے دوں گی۔"

بیگم سعدیہ نئی کوٹھی خرید سکتی تھیں لیکن بہو وہاں سے نکالنا چاہتی تھی۔ یہ توہین برداشت نہیں ہوسکتی تھی۔ اب بھی بازی جیت لینے کی امید تھی۔ بیگم کے خیال کے مطابق شائستہ وکالت کو طبی معائنہ سے روکنے کے لیے ایسی حرکتیں کر رہی تھی۔ وہ بولیں "وکالت! میں نے ماں ہوکر تیرے سامنے ہاتھ جوڑے تھے تونے ماں کی اتنی سی بھی عزت نہیں رکھی؟"

"امی! آپ اپنی عقل میری کھوپڑی میں نہ ٹھونسیں۔ میں دو بچوں کا باپ ہوں طبی معائنہ نہیں کراؤں گا۔"

"کیا اپنے خون کا حساب نہیں کرے گا؟"

"میں اولاد کا حساب جانتا ہوں اور قیامت کے دن اولاد ماں کے نام سے پکاری جائے گی۔"

بیگم سعدیہ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ شائستہ اتنا زبردست نکتہ وکالت کے دماغ میں ٹھونس دے گی۔

"ارے کمبخت! یہ تجھے الو بنا رہی ہے میں اس کے ہاتھوں تجھے برباد نہیں ہونے دوں گی اگر اس کلموہی کے پاس جائے گا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔"

بیوی نے اپنے کمرے کی دہلیز پر سے کہا "دودھ پینے کی عمر ہو تو بچہ ماں کی گود میں جاتا ہے تم تو دروازہ کھول کر بیٹے کو بلا رہی ہو۔ میں دروازہ بند کرکے تماشا دکھاتی ہوں اُدھر جاتا ہے دیکھو یا اِدھر پروانہ آتا ہے؟"

یہ کہتے ہی بہو نے ایک زوردار آواز سے اپنے کمرے کے دروازے کو بند کرلیا۔ یہ نفسیاتی حملہ تھا۔ وہ جمعرات بھری مراد نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ اسے مزید تڑپانا چاہتی تھی۔ اس کے بعد وہ اسٹور روم سے لائی ہوئی لانبی رسی لے آئی۔ پنکھے کے نیچے کرسی رکھ کر اس پر چڑھ گئی۔ رسی کا ایک سرا پنکھے سے باندھنے لگی۔

اس خاندان کے لوگ بڑے نفاست پسند تھے ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے لیکن یہ

ناقابل انکار سچائی ہے کہ آدمی چار دن کا بھوکا ہو اور کھانے میں، مکھی گر جائے تو نفاست پسندی کا زور ٹوٹ جاتا ہے' آنکھوں دیکھی مکھی نگلی نہیں جاتی۔ اس لیے مکھی پھینک دیتے ہیں کھانا نہیں پھینکتے۔

وہ ماں کو باہر پھینک سکتا تھا۔ بیوی کو نہیں پھینک سکتا تھا۔ بیوی کے کردار پر مکھی گری تھی لیکن موجودہ حالات میں ماں مکھی کی طرح ناقابل برداشت ہوگئی تھی۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا بند دروازے کے پاس آیا پھر دستک دیتے ہوئے بولا "پلیز دروازہ کھولو۔"

اندر سے آواز آئی۔ "پہلے کھڑکی سے بات کرو۔"

وہ کھڑکی کے پاس آیا۔ اندر سے کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا ہوا تھا۔ کمرے کا کچھ حصہ نظر آرہا تھا چھت سے پنکھا لٹک رہا تھا۔ پنکھے سے رسی لٹکی ہوئی تھی اور رسی کے نچلے سرے پر پھندہ بنا ہوا تھا وہ تڑپ کر بولا۔ "یہ کیا حماقت ہے وہاں سے کرسی ہٹاؤ دروازہ کھولو۔"

وہ بولی "یہ قصہ ختم ہوجانا چاہیے میں مرجاؤں تو میرے بچوں کو کسی فلاحی ادارے میں بھیج دینا۔"

اسی وقت بیگم سعدیہ نے بیٹے کے پاس آکر کھڑکی سے اندر دیکھا پھر بولیں "بیٹا! یہ مرنے والی نہیں ہے ناٹک کر رہی ہے۔"

شائستہ نے پھندے کو اپنی گردن میں ڈالا۔ وہ گرج کر ماں سے بولا "کیوں بکواس کرتی ہو وہ مرجائے گی۔ بچے نہیں رہیں گے تو کیا خاندان کا نام رہے گا؟"

وہ پھندے کو اپنی گردن میں کستے ہوئے بولی "یہ فیصلے کی آخری گھڑی ہے بولو میں کرسی کو لات ماروں یا تم اپنی ماں کو ٹھوکر ماروگے؟ میں اپنے بچوں کی دشمن کو یہاں ایک منٹ برداشت نہیں کروں گی۔"

وہ ایک ساعت کے لیے سانس لینا بھول گیا۔ وہ فیصلے کا آخری لمحہ تھا۔ وہ جلدی سے سنبھل گیا اور فیصلے پر پہنچ گیا۔

"نہیں شائستہ! امی جارہی ہیں۔ ابھی جارہی ہیں۔"

وہ ماں کو پکڑ کر ایک طرف گھماتے ہوئے بولا "خدا کے لیے جاؤ مجھ پر اور میری آئندہ نسل پر رحم کرو۔ خدا کے لیے جاؤ۔"

وہ رو پڑیں بارہ برس میں پہلی بار بہو کے سامنے ہی آنسو نکل آئے۔ شائستہ نے آنسوؤں کے ہتھیار کو کند کرنے کے لیے کہا۔ "اس وقت گھڑی میں گیارہ بج کر پینتالیس منٹ ہوئے ہیں' اگر پندرہ منٹ میں آئندہ نسل کی دشمن یہاں سے نہ گئی تو ٹھیک بارہ بجے میں کرسی کو لات مار کر پھندے سے لٹک جاؤں گی۔"

واقعی فیصلے کی آخری گھڑی تھی اور گھڑی کے کانٹے پندرہ منٹ میں بارہ بجانے والے تھے۔ وہ ماں کو راہداری میں ایک طرف کھینچتے ہوئے بولا "دروازہ بند ہے میں اندر جا نہیں

سکتا۔ اسے خودکشی سے باز نہیں رکھ سکتا۔ دروازہ توڑنے تک وہ جان دیدے گی۔ امی! رحم کرو۔ فوراً جاؤ۔ آج رات فلیٹ میں گزارو۔ میں کل آکر ملاقات کروں گا۔ ابھی یہاں سے چلی جاؤ۔"

وہ بولتا ہوا ماں کو کھینچ کر...زینے کی بلندی تک آیا۔ وہ ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر دوڑتی ہوئی ولایت علی کے کمرے میں آئیں۔ چیخ کر بولیں "آپ مجھے دلہن بناکر یہاں لائے تھے' آپ کی اولاد مجھے کچرا سمجھ کر باہر پھینک رہی ہے۔ اس کمبخت سے کہہ دیں کہ یہ ہمارا گھر ہے۔"

ولایت علی پلنگ کے سرہانے ٹیک لگائے نیم دراز تھے۔ دیدے پھیلائے بیگم کو دیکھ رہے تھے۔شاید سن رہے تھے مگر بول نہیں سکتے تھےاگر وہ آنکھوں کی زبان سمجھتیں تو وہ آنکھوں سے کہہ رہے تھے "اب یہ گھر ہمارا نہیں رہا۔ کوئی وقت آتا ہے کہ پھر یہ دنیا بھی ہماری نہیں رہے گی۔ ہمیں آنے والوں کے لیے دنیا خالی کرنی پڑتی ہے۔"

وہ پھر چیخنے لگیں۔ "آپ بول نہیں سکتے ہیں۔ کیا نہ بولنے والوں کے حقوق چھین لیے جاتے ہیں؟ آپ جس خاندان کی آن بان اور شان کے گن گایا کرتے تھے اس کے شجرے میں ملاوٹ ہوگئی ہے۔ پہلے گناہ پکڑا جاتا تھا۔ آج ٹیوب بچے اپنی ماں کا گناہ مٹا دیتے ہیں۔ ملاوٹ کی خبر ہونے نہیں دیتے لیکن میں یہ پکی خبر لائی ہوں۔ آپ اٹھیں اور اپنی آخری تمام قوتوں کو سمیٹ کر بیٹے کے بڑھتے ہوئے شجر پر تھوک دیں۔ آپ بول نہیں سکتے۔ تھوک تو سکتے ہیں۔"

ان کے پھیلے ہوئے دیدے کہہ رہے تھے "کچھ بھی کرلو۔ ہم تم خزاں رسیدہ پتے ہیں۔ ہمیں اپنے شجر سے ٹوٹ کر گرنا ہے گھٹنے ٹیک دو۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ طب اور سائنس انسانی شجرکاری کا دستور بدلتے جارہے ہیں۔"

باہر سے بیٹے کی آواز آئی۔ "امی! صرف پانچ منٹ رہ گئے ہیں۔ شائستہ کے ساتھ میں بھی دنیا سے جارہا ہوں۔"

وہ دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر آئی۔ بیٹا زینے کی بلندی پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر ماں کا کلیجہ کانپ گیا۔ وہ اس کے قریب آنا چاہتی تھیں۔ اس نے ریوالور کو اپنی کنپٹی سے لگاکر کہا "خبردار میری طرف آوگی تو میں مرجاؤں گا۔ بیٹے کی زندگی چاہتی ہو تو کوٹھی سے نکل جاؤ۔"

وہ انکار میں دونوں ہاتھ ہلاتی ہوئی زینے سے نیچے جاتی ہوئی بولیں نہ بیٹا نہ گولی نہ چلانا جان نہ دینا میں جارہی ہوں۔ میں جارہی ہوں بیٹے....

وہ زینے سے اتر گئیں نیچے بڑے ہال میں تیزی سے چلتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف جاتی ہوئی بولیں "میں راضی خوشی جارہی ہوں۔ تمہارے ابا جان کی خاموشی نے سمجھا

دیا ہے کہ ہم پرانے دقیانوسی لوگ ہیں تہذیب کی طہارت کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ نہیں رہ سکتے۔ نہیں رہ سکتے۔"

وہ کوٹھی سے نکل گئیں۔ نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔ ان کی آواز رات کے سناٹے میں دور ہوتی جارہی تھی۔ اندر ولایت علی پلنگ کے سرہانے ٹیک لگائے نیم دراز تھے۔ ان کے پھیلے ہوئے دیدے ساکت ہوگئے تھی۔ گردن یوں ڈھلک گئی تھی جیسے بوڑھا درخت جڑ سے اکھڑ کر زمیں بوس ہوگیا ہو۔

جونک

میں انسانوں کی دنیا میں جونک کو نر کہتی ہوں۔

اے میرے جونک!

تو کب تک میرے وجود سے لپٹا رہے گا۔

تو نے ایک کنواری کا خون چوس کر اسے عورت بنا دیا۔

پھر تو نے عورت کا لہو چوس کر اسے ماں بنا دیا۔

یہی تجھ سے غلطی ہو گئی۔

بچے کو دودھ پلانے والی ماں

کسی کو اپنا خون چوسنے نہیں دیتی۔

جس خون سے میرے بچے کے لئے دودھ بنتا ہے۔

تو اسے چوسنے آیا ہے؟ آ۔ آ

میری محبت کے کچے گھڑے!

میں تجھے چناب کی لہروں میں لے چلوں۔

جونک اور عاشق میں برائے نام فرق ہوتا ہے۔ سیلابی کیچڑ اور دلدل میں پیدا ہونے والی جونک بدن سے چمٹ جائے تو خون چوستی رہتی ہے۔ جب تک خون پی پی کر مر نہ جائے آدی کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

عاشق کبھی پیچھا چھوڑ دیتا ہے کبھی چمٹ جاتا ہے پھر چھوڑ دیتا ہے پھر جونک بن جاتا ہے کبھی حسن کو پیار سے مانگتا ہے' کبھی اپنا حق سمجھ کر چھین لیتا ہے۔ لہو گرم رکھنے کا بہانہ ڈھونڈتا ہے۔

کوئی درد نہ ہو تو ہمدرد بن کر آتا ہے اور چپکے چپکے زندگی میں درد کا ذخیرہ کرتا رہتا ہے جونک اوپر سے لہو چوستی ہے عاشق رگوں میں لہو بن کر دوڑتا ہے۔ بہت دھیرے دھیرے حسن کے اندر پرورش پاتا ہے۔ پیار کے نام پر پہلے اپنا عادی بناتا ہے پھر باندی بناتا ہے۔

فیروزہ ریسیور کان سے لگائے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا "میری سلمیٰ آپا تمہاری بھابی ہیں۔ بیشک میں آپا کے رشتے سے تمہارے گھر آتا ہوں لیکن بخدا تمہیں دیکھنے کے بہانے آتا رہتا ہوں۔"

وہ بولی "چودھری صاحب! بار بار پھیرے لگانے سے تمہارے پھیر میں نہیں آؤں گی۔"

"مجھے چودھری صاحب کیوں کہتی ہو؟ نام لے کر مخاطب کرو۔"

"تمہارا نام اکبر علی ہے۔ علی ایک معتبر نام ہے اور تم جھوٹے دغاباز ہو۔"

"غصہ تھوک دو۔ چلو علی نہ کہو' اکبر تو کہہ سکتی ہو؟"

"جب میں اللہ اکبر کہتی ہوں تو چودھری کو اکبر نہیں کہہ سکتی۔ کیا تمہاری آپا کو فون پر بلاؤں؟"

"پلیز نہیں۔ بڑی مشکلوں سے تم فون پر ملی ہو۔ صاف صاف بتاؤ مجھ سے کتراتی کیوں ہو؟"

"کیا بتانا ضروری ہے کہ تم ایک بیوی کے شوہر اور دو بچوں کے باپ ہو؟"

"شوہر اور باپ بننا کوئی جرم نہیں ہے۔"

"کیا اپنی شریک حیات کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانا نیکی ہے؟"

"فیروزہ! یقین کرو۔ میں نے شادی کی رات ہی صغریٰ سے کاغذ لکھوالیا تھا کہ جب بھی میری آئیڈیل لڑکی مجھے ملے گی۔ میں دوسری شادی کروں گا اور وہ اعتراض نہیں کرے گی۔ تم جب چاہو وہ کاغذ مجھ سے لے کر پڑھ سکتی ہو۔"

"وہ دلہن پہلی رات یہ اجازت نامہ لکھنے پر راضی کیسے ہوگئی تھی؟"

"یہ تو ہمارا پورا خاندان جانتا ہے کہ میں صغریٰ کو کبھی پسند نہیں کرتا تھا۔ یہ زمین' جائداد کا معاملہ تھا۔ میں شادی نہ کرتا تو وہ اپنے حصے کی زمینیں لے کر دوسرے خاندان میں چلی جاتی۔"

"میں پوچھ رہی ہوں تم نے اجازت نامہ کیسے لکھوالیا؟"

"تم نے صغریٰ کو نہیں دیکھا ہے وہ احساس کمتری میں مبتلا رہتی ہے اور بے چاری کے پاس نہ حسن ہے نہ زیادہ تعلیم ایک اچھی بیوی ضرور ہے۔ اس نے اس ضمانت پر کاغذ لکھ دیا ہے کہ میں اسے کبھی طلاق نہیں دوں گا۔ وہ پنڈ دادن خان والی حویلی میں پڑی رہے گی۔"

"عورت اپنے خاوند کے گھر کو جنت بناتی ہے تم نے بیوی کی جنت پانی میں بنائی ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے جو ظلم مجھ پر ہوا ہے اسے سمجھو۔ میں اٹھارہ برس کا تھا ابا جان نے جبراً میری شادی کرادی۔ انہیں اندیشہ تھا کہ صغریٰ کی جائداد ہاتھ سے نکل جائے گی۔ میں شاعرانہ جذبوں کا مالک ہوں۔ مجھے کسی سے محبت کرنے کی مہلت نہیں ملی اور دیکھتے ہی دیکھتے دو بچوں کا باپ بن گیا۔"

وہ خاموش رہی چودھری اکبر علی اس پہلو سے درست کہہ رہا تھا کہ شادی واقعی جاگیر دارانہ حساب کتاب سے ہوئی تھی۔ جس طرح غریب کسانوں کو تمام عمر کھیتوں کھلیانوں سے باندھ دیا جاتا ہے اسی طرح اکبر علی کے آگے زمین جائداد کا بند باندھ دیا گیا لیکن جوانی میں کہیں نہ کہیں سے حسن و شباب کا ریلا آتا ہے تو سارے بند ٹوٹ جاتے ہیں۔ فیروزہ اسے قبول کرتی یا نہ کرتی یہ اعزاز اسے حاصل ہو رہا تھا کہ وہ اپنے سیلابی حسن و شباب سے چودھری کو توڑ پھوڑ رہی ہے۔

وہ کہہ رہا تھا "میرے ساتھ بیوی بچوں کا ذکر ہوتا ہے تو سننے والے سمجھتے ہیں میں عمر رسیدہ ہوں۔ ہمارا معاشرہ ہمارے لوگ عجیب ہیں۔ باپ بنتے ہی بندے پر بزرگی طاری کردیتے ہیں جبکہ میں ابھی چوبیس سال کا ہوں۔ یہ عمر شوہر اور باپ بننے کی نہیں آزادی سے ہنسنے کھیلنے اپنے محبوب کے ساتھ پھول چننے اور محبتوں کے آسمان پر اڑنے کے لیے ہوتی ہے۔"

وہ تجاہل عارفانہ سے بولی "تم پھول چننے اور آسمان پر اڑنے کے لیے میرے ہی پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟"

"دماغ پیچھے ہوتا ہے یہ جانتی ہو ناکہ انسانی کھوپڑی کے پچھلے حصے میں دماغ ہوتا ہے؟ اس حوالے سے دل تمہارا آگے آگے ہے اور دماغ پیچھے پیچھے۔ آج کسی وقت تنہائی میں سر جھکا کر سوچو تو سمجھ لوگی کہ میں تمہاری ضرورت ہوں اور ضرورت کو جتنا پیچھے چھوڑو اتنا ہی وہ آگے آتی ہے۔"

فیروزہ نے چوٹ کی "دو بچوں کے باپ کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔"

"پلیز بچوں کا حساب نہ کرو میری عمر اور میری زندہ دلی دیکھو۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی "مجھے اپنے آگے صرف تمہارے بیوی بچے دکھائی دیتے ہیں۔"

"میری جان! آنکھ صرف آگے دیکھتی ہے۔ عقل آگے بھی دیکھتی ہے اور پیچھے بھی۔ مجھے عقل سے سمجھو۔"

"دیکھو آئندہ مجھے میری جان نہ کہنا۔ یہ مجھے نہایت ہی گھٹیا اور بھونڈا انداز تخاطب لگتا ہے۔"

"میں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔ سنا ہے محبت کے کچھ آداب ہوتے ہیں آئندہ تم سکھاتی رہوگی تو میں سیکھتا رہوں گا۔"

"جی نہیں میں آئندہ فون پر نہیں آؤں گی۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے یہ تم بھائی بہن کی سازش ہے بھابی کے فون کی گھنٹی بجتی ہے تو وہ مجھے اٹینڈ کرنے کو کہتی ہیں۔ انہیں پتا ہوتا ہے کہ تم میرے لیے گھنٹی بجا رہے ہو۔ وہ کسی نہ کسی بہانے مجھے فون پر بھیج دیتی ہیں۔ بس یہ آخری بار اٹینڈ کر رہی ہوں۔"

"ایسا ظلم نہ کرنا۔ ایسا کرو ایک بار مجھ سے کہیں ملاقات کرو۔ میں جو باتیں فون پر نہیں کرسکتا انہیں روبرو کہنے کا موقع دو۔ اگر میں اپنی محبت سے تمہیں قائل نہ کرسکا تو اپنی بدنصیبی کا یقین کرلوں گا۔"

وہ ریسیور کان سے لگائے بیٹھی تھی سر جھکا کر سوچ میں پڑگئی۔ وہ کسی جگہ ملاقات کرنے کی ہامی بھر کر اس کا حوصلہ بڑھانا اور اپنی قدروقیمت کم کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے پوچھا "خاموش کیوں ہو؟ اگر جھجکتے اور شرماتے ہوئے ہاں کہنے میں دیر ہورہی ہے تو بے شک دیر کرو۔ میں ریسیور کان سے لگائے یہاں کھڑے کھڑے زندگی گزار دوں گا مگر پلیز انکار نہ کرنا۔"

اس نے انکار نہیں کیا اقرار بھی نہیں کیا۔ خاموشی سے ریسیور رکھ دیا۔ خاموشی صرف نیم رضامندی کی علامت نہیں ہوتی۔ خاموشی سے بڑے بڑے مقدمے مدتوں تک ملتوی رکھے جاتے ہیں لیکن چوہدری اکبر علی سنگین مقدمات سے بھی بڑا تھا۔ چھ فٹ کا گھبرو جوان بڑی سنگینی سے اس کے حواس پر چھاجاتا تھا۔ اس کا چوڑا سینہ جہلم کے چوڑے پاٹ کی طرح یہاں سے وہاں تک کشادہ تھا۔ اس سینے سے لگنے کا خیال منہ زور لہروں کی طرح بہا کر

لے جاتا تھا۔ وہ ہوش مندی سے سوچتی تھی کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے اس کے باوجود اس کے لیے باؤلی ہوتی رہتی تھی۔

ابھی حال ہی میں اس کی ایک سہیلی نے ایک شادی شدہ شخص سے محبت کی تھی پھر اس کی ایسی دیوانی ہوئی تھی کہ والدین کی مخالفت کے باوجود اس سے شادی کرلی اس سے کچھ عرصہ پہلے محلے کی ایک لڑکی بھی ایک بے چاری بیاہتا پر سوکن بن کر گئی تھی۔ فیروزہ نے اپنے جہلم شہر میں ایسی کئی لڑکیاں دیکھی تھیں جو سیکنڈ ہینڈ مردوں پر جان دیتی تھیں۔ بوڑھی عورتیں حیرانی سے کہتی تھیں۔ "یہ آج کل کی لڑکیوں کو کیا ہوگیا ہے۔ یہ بیویوں اور بچوں والوں کو آخر کیا دیکھ کر پسند کرلیتی ہیں؟ کیا خاندان میں اور اتنے بڑے ملک میں کنوارے نہیں ہیں؟"

ایک ملک ہی میں کیا' پوری دنیا میں کنوارے ہیں لیکن یوں لگتا ہے کہ کوئی مخصوص قسم کی آسیبی ہوا چلی ہے۔ یہ باؤلیاں کنواروں کو گھاس ہی نہیں ڈالتیں۔ فیروزہ بھی پہلے ناگواری سے یہی سوچتی تھی۔ آخر کوئی شادی شدہ مرد کیسے پسند آجاتا ہے؟ یہ دل اور دماغ کی کمزوری ہے۔ یہ محبت نہیں ہوتی پرائے مرد کو حاصل کرنے کی بے لگام خواہش ہوتی ہے۔ اخلاقی کمزوری یہ سوچنے نہیں دیتی کہ وہ دوسری عورت اور اس کے بچوں کا حق مارنے جارہی ہے۔

فیروزہ نے چودھری اکبر علی کو پہلی بار اپنے بھائی جواد حسین کی شادی میں دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر غضب کی مردانگی تھی۔ اسے دیکھ کر کچھ ہوتا تھا۔ کیا ہوتا تھا؟ یہ معلوم کرنے کے لیے وہ براتیوں کی بھیڑ میں اسے چھپ چھپ کر دیکھتی رہی اور معلوم کرتی رہی۔ اس عمر میں کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو معلوم ہوکر بھی معلوم ہونے کو رہ جاتی ہیں اور بے چینی میں مبتلا کرتی رہتی ہیں۔

نظروں کا تبادلہ ہوتا رہا اور وہ نظریں چراتی رہی۔ ایک بار وہ اپنی سلمیٰ آپا سے ملنے آیا تو تنہائی میں موقعہ پاکر فیروزہ سے بولا۔ "تمہاری نگاہوں سے کبھی معنی جھلکتے ہیں اور کبھی یہ بے معنی سی لگتی ہیں۔ ایسی بے ایمانی سے نہ دیکھا کرو۔"

وہ مسکرا کر بھاگتی ہوئی کچن میں سلمیٰ بھابی کے پاس آگئی۔ بھابی نے پوچھا "کیا تمہارے پیچھے پولیس ہے؟ بھاگنے اور ہانپنے کا انداز یہی بتا رہا ہے۔"

وہ سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "آپ کے بھائی بڑے وہ ہیں۔"

اس نے مسکرا کر پوچھا "وہ کیا ہوتا ہے؟"

"وہ... آپ' آپ انہیں منع کردیں۔"

"کس بات سے منع کردیں؟"

"یہی کہ وہ ایسی ویسی باتیں نہ کریں۔"

"ایسی ویسی باتیں کیا ہوتی ہیں؟"

"جائیے بھابی! میں نہیں بولتی۔ آپ بھی مجھے چھیڑ رہی ہیں۔"

"آپ بھی کا مطلب یہ ہوا کہ میرا بھائی بھی چھیڑ رہا تھا؟"

وہ شرما کر جانا چاہتی تھی۔ بھابی نے ہاتھ پکڑ لیا پھر کہا "ساز چھیڑنے کے لیے ہی ہوتا ہے میرے دیر کو یہ حق دے دو۔"

وہ ہاتھ چھڑا کر دوڑتی ہوئی کچن سے چلی گئی۔ سلمیٰ سوچنے لگی۔ "بھائی کا دل اس پر آگیا ہے۔ کس نیت سے آیا ہے؟ شادی کی نیت سے یا تفریح کی؟ جہاں جاگیرداروں کا دل آتا ہے وہاں تفریح اور عیاشی کا شبہ پہلے ہوتا ہے۔ میرے دیر کی شادی ہو چکی ہے۔ اب یہ جو چاہتا ہے وہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ میرا سسرال ہے۔ میری نند کے ساتھ کچھ اونچ نیچ ہوگئی تو میں سسرال کی رہوں گی نہ میکے کی۔"

وہ سوچتے سوچتے چونک گئی ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے خود ہی فیروزہ سے کہا تھا کہ ساز چھیڑنے کے لیے ہی ہوتا ہے۔ میرے دیر کو یہ حق دے دو۔ وہ چند لمحوں کے لیے بھول گئی تھی کہ سسرال میں ہے اور اپنی نند سے ایسا کہہ رہی ہے۔ یہ اپنے اپنے مزاج اور عادت کی بات ہوتی ہے۔ وہ میکے میں اپنے باپ اور بھائی کی رنگ رلیوں سے اچھی طرح واقف تھی۔ ایک بار اس کی سہیلی جہلم شہر سے پنڈ دادن خان والی حویلی میں آئی تھی۔ بھائی نے اس میں دلچسپی لی تو سلمیٰ نے سہیلی کو بھی کچھ اسی طرح ترغیب دی تھی کہ ساز چھیڑنے کے لیے ہوتا ہے چھیڑنے والے کو چھیڑنے دو۔

وہ تیزی سے چلتی ہوئی کچن سے باہر آئی۔ یہ سبق وہ اپنی نند کو نہیں پڑھانا چاہتی تھی۔ اس میں سراسر اپنا ہی نقصان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنی خواب گاہ کے دروازے پر آکر رک گئی۔ اندر اس کا میاں جواد حسین اس کے بھائی اکبر علی سے باتیں کر رہا تھا۔ دونوں کسی بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔

جواد حسین اور فیروزہ کے والد چودھری عنایت حسین بھی ایک جاگیردار تھے لیکن سلمیٰ اور اکبر علی کے والد چودھری قاسم علی سے کمتر تھے لیکن دولت مندی میں جوڑ کا توڑ تھے۔ فیصل آباد سے آنے والے زرعی آلات کے بہت بڑے ڈیلر تھے اور بیٹا جواد حسین منگلا ڈیم میں اسسٹنٹ انجنیئر تھا۔ قابلیت کے لحاظ سے وہ ایسا ہی تھا جیسے اکثر سرکاری افسران ہوتے ہیں مگر اپنوں اور بیگانوں میں ایک انجنیئر کی ٹور اور شان ہوگئی تھی۔

وہ اپنے سالے کے ساتھ قہقہے لگاتے لگاتے بیوی کو دیکھ کر چپ ہوگیا۔ فوراً اٹھ کر یوں کھڑا ہوگیا جیسے اعلیٰ افسر دروازے پر آگیا ہو پھر وہ بولا "سلمیٰ رانی! وہاں کیوں رک گئیں، اندر آؤ۔"

وہ اپنے میکے سے سلمیٰ بانو کے نام سے بیاہ کر آئی تھی مگر میاں نے پہلی رات اسے سپنوں کی رانی، زندگی کی رانی، رات کی رانی، دن کی رانی اور دل کی رانی کہتے کہتے صبح کر دی والدین کے سامنے بھی اسے سلمیٰ رانی کہا تو یہی نام مستقل ہوگیا۔ والد نے کہا ہماری بہو سچ

مچ رانی ہے لیکن والدہ جل بھن گئیں۔ بستر سونے کے لیے ہوتا ہے بیٹے نے اسے اوڑھ لیا تھا۔

وہ کمرے میں آکر میاں سے بولی "میں اکبر سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

جواد نے کہا "ہاں ہاں۔ ضرور ضرور میں امی کے پاس جارہا ہوں۔"

وہ تابعدار چند دنوں میں ہی رانی کا موڈ اور مزاج سمجھنے لگا تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ بھائی سے باتیں کرنے کے لیے تنہائی کیا ضروری ہے اور شوہر سے بھلا کیا چھپایا جارہا ہے؟ وہ بیوی کو خوش کرنے کے لیے وہاں سے چلا گیا۔

چودھری اکبر علی نے کہا "کمال ہے۔ جواد بھائی اسی کمرے میں پیدا ہوئے ہوں گے، اسی کمرے میں بچپن گزارا ہوگا۔ اسی میں جوان ہوئے ہوں گے۔ اسی میں تمہیں دلہن بنا کر لائے اور تمہاری ایک بات پر اسی کمرے سے نکل گئے۔ اسی کو کہتے ہیں۔ عورت دا بندہ کتھے وی نہ بندا۔"

"میرے میاں کی بات نہ کرو۔ اپنی بات کرو۔ یہ فیروزہ کے ساتھ کیا چکر چلا رہے ہو۔ کیا مجھے یہاں سے طلاق دلاؤ گے؟"

"آپا! میری آپا کیوں لال پیلی ہو رہی ہو۔ یہ میری حویلی نہیں ہے کہ اپنا اصلی رنگ دکھاؤں گا۔ تمہارا سسرالی معاملہ ہے اس لیے مجھے شرافت اور تہذیب کے دائرے میں اس سے عشق ہوگیا ہے۔ میں تم پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔"

"تمہارے عشق کا ڈراپ سین کیا ہوگا؟ کیا اس سے شادی کرو گے؟"

"ہاں، اسے جب سے دیکھا ہے نیند حرام ہوگئی ہے، شادی ضرور کروں گا۔"

"یہ ہماری ٹکر کا خاندان ہے۔ فیروزہ کے لیے بڑے بڑے گھروں سے رشتے آتے ہیں۔ میرا سسرا اسے صغریٰ پر سوکن بنانے والی بات برداشت نہیں کرے گا۔ پھر تمہارے لیے یہاں کے دروازے بھی بند کردیے جائیں گے۔"

"آپا! ہم اپنی جاگیر میں بیٹھ کر کسی کانے سیاست دان کو اسمبلی میں پہنچا دیتے ہیں تو کیا مجھ جیسا سیکنڈ ہینڈ داماد اس خاندان میں نہیں آسکے گا؟"

سلمیٰ نے پریشان ہو کر پوچھا "تم کوئی گڑبڑ کرنا چاہتے ہو؟"

"ابھی نہیں جب بات نہیں بنے گی تو گڑبڑ ہوگی۔"

"بات کیسے بناؤ گے؟"

"پہلے اپنے طور پر فیروزہ کو راضی کروں گا۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ مجھے پسند کر رہی ہے۔"

"وہ تمہیں کنوارا سمجھ رہی ہے۔"

"کنوارا نہ سمجھے آوارہ سمجھے ایک بار دل میں جگہ بن جائے تو عورت ہر حال میں قبول کر لیتی ہے۔"

"دیکھو اکبر! بات بگڑ گئی تو میں کہیں کی نہیں رہوں گی۔"

"تم میری بات مانتی رہو اور جواد بھائی سے اپنی باتیں منواتی رہو تو اس گھر کے دو ووٹ میرے حق میں ہو جائیں گے تیسرا ووٹ فیروزہ سے حاصل کرلوں گا۔ تمہاری ساس اپنے بیٹے جواد کو جان سے زیادہ چاہتی ہے۔ اس لیے وہ بھی رفتہ رفتہ بیٹے اور بیٹی کی رضامندی سے جھک جائے گی۔ ایک بڑے میاں رہ جائیں گے ان سے آخر میں نمٹ لیا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے لیکن ابھی میں جواد سے تمہارے اور فیروزہ کے رشتے کی بات نہیں کروں گی۔ پہلے مجھے یہ دکھاؤ کہ فیروزہ تم سے راضی ہے۔"

"تمہیں جلد ہی فیروزہ کی رضامندی معلوم ہوجائے گی۔ میں نے اتنے دنوں میں معلوم کیا ہے کہ وہ کالج جانے کے لیے نو بجے گھر سے نکلتی ہے۔ ایک بجے واپس آتی ہے۔ اس لیے دوپہر کے دو بجے تمہارے فون کی گھنٹی بجے تو تم کسی کام کا بہانہ کرکے فیروزہ کو فون اٹینڈ کرنے کے لیے کہنا۔ آنکھوں کے راستے جگہ بناچکا ہوں اب فون پر کانوں کے راستے دل میں جگہ بناؤں گا۔"

فیروزہ باپ کے ساتھ کار میں جاتی تھی۔ چودھری عنایت حسین اسے کالج ... ڈراپ کرکے اپنے آفس اور شو روم چلے جاتے تھے۔ ایک بجے اسے کالج سے گھر لاکر چھوڑتے تھے پھر دوپہر کا کھانا کھاکر واپس جاتے تھے۔ یہ روز کا معمول تھا۔ اس لیے اکبر علی کو اس سے باہر ملاقات کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ ابتدا میں فون کے ذریعے ہی محبت کا چارا ڈالتا رہا لیکن جلد ہی فیروزہ کو معلوم ہوگیا کہ اس کی ایک بیوی اور دو بچے ہیں۔ بھلا اتنی قریبی رشتے داری میں بات کب تک چھپی رہ سکتی تھی؟ اس نے سلمٰی بھابی سے پوچھا "آپ نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی تھی؟"

وہ بولی "نہ تم نے کچھ پوچھا نہ میں نے چھپایا تم پوچھتیں تو میں بتاتی۔"

"آپ ہمارے گھر کی بہو ہیں۔ آپ کو اپنے میکے کی اتنی اہم بات خود ہی بتانا چاہیے تھی۔ تعجب ہے امی ابا آپ کا رشتہ مانگنے گئے وہاں بھی کسی کو معلوم نہ ہوسکا کہ صغریٰ نام کی کوئی آپ کی بھابی ہے۔ آپ کی شادی میں اور ہمارے ہاں ولیمے میں بھی وہ بے چاری اور اس کے بچے نظر نہیں آئے۔ آخر یہ رازداری کس لیے؟"

"کوئی رازداری نہیں ہے۔ صغریٰ جاگیر کے تنازع میں میرے بھائی کے سر پڑ گئی تھی۔ پھر وہ صورت شکل سے اور طور طریقوں سے اس قابل نہیں ہے کہ اسے کسی محفل یا تقریب میں لے جایا جائے اور صاف بات یہ ہے کہ میرا بھائی اپنی پسند سے دوسری شادی کرنا چاہتا تھا اس لیے ہم نے پہلی کی پبلسٹی نہیں کی۔"

"جب آپ نے دیکھا کہ میں آپ کے بھائی کو چاہنے لگی ہوں تو آپ نے اب مجھے اس راز میں شریک کیا ہے۔"

"اکبر نے کہا تھا کہ شادی سے پہلے تمہیں ہمراز بنایا جائے۔ جب تم رازدار بن جاؤگی اور اکبر کو قبول کروگی تو امی اور ابا کو بھی سب کچھ بتا دیا جائے گا۔"

"آپ اپنے پیارے بھائی سے کہہ دیں کہ وہ مجھے قبول نہیں ہے۔ آئندہ میں فون پر بھی اس فریبی سے بات نہیں کروں گی۔"

"یہ بات تم خود ہی اس سے فون پر کہہ دینا۔"

"میں اس سے بات نہیں کروں گی۔"

"بات تو تم نے خود بڑھائی ہے۔ عورت حوصلہ نہ دے تو مرد پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ تم نے اسے پیچھے ہٹنے نہیں دیا۔ اپنے قریب آنے کا سگنل دیتی رہیں۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اپنی اصلیت چھپا رہا ہے۔"

"یہ میرے بھائی کی انتہائی شرافت ہے کہ تم سے شادی کرنے سے پہلے تمہاری آنکھوں پر سے پردہ اٹھا رہا ہے۔ وہ فریب نہیں دے رہا ہے پھر بھی اسے فریبی کہہ رہی ہو۔"

سلمٰی نے اسے قائل کردیا کہ چودھری اکبر علی اسے دل و جان سے چاہتا ہے اس لیے فریب نہیں دے رہا ہے' اگر وہ دھوکے سے شادی کرکے لے جاتا اور بعد میں کبھی بھید کھلتا تو وہ اپنا سب کچھ لٹانے کے بعد اس کا کیا بگاڑ لیتی؟

پھر فون پر چودھری اکبر نے بھی اسے قائل کیا اپنا دکھڑا سنایا کہ اس نے بہت مجبور ہوکر صغریٰ سے شادی کی تھی اس کی زندگی میں کوئی محبت کرنے والی نہیں آئی۔ ایک وہ آئی ہے تو اس سے بدظن ہو رہی ہے۔

اگرچہ وہ فون پر اکبر سے طنزیہ اور سخت لہجے میں بول رہی تھی۔ تاہم چپ چاپ پگھل رہی تھی اس گھبرو کو دیکھ کر اور فون پر اس کی آواز سن کر اندر کچھ ہونے لگتا تھا۔ موسم بدلنے لگتا تھا۔ کچھ جانے انجانے جذبوں کی گرم ہوا چلنے لگتی تھی وہ کسی جگہ ملنے کی فرمائش کر رہا تھا۔ اس بات پر اُس نے جلدی سے ریسیور رکھ دیا تھا۔ ڈر تھا کہ دوسری بار فرمائش سنتی تو جذب کے عالم میں ہاں کہہ دیتی۔

دیوانگی میں منہ سے ہاں نکل جاتی ہے۔ ہوشمندی میں کچھ سوچنے سمجھنے کی گنجائش رہتی ہے۔ اسی لیے اس نے کوئی جواب دیے بغیر ریسیور رکھ دیا تھا۔ وہ بیوی بچوں والوں پر مرنے والیوں کو حقارت سے دیکھتی آئی تھی۔ آئینے میں دیکھ کر سوچ رہی تھی خود کو حقارت سے دیکھنا بہت مشکل ہے۔ وہ شخص جو دل و دماغ پر چھا گیا ہے اسے اپنے اندر سے کیسے نوچ کر پھینک دے۔ اس کا متبادل کہاں سے لائے؟

یوں سوچنے سے یہ بات ذہن میں آئی کہ وہ دنیا میں ایک ہی نمونہ نہیں ہے' ایسے قد اور پہاڑ جیسے جوان شہر میں اور بھی ہوں گے۔ لے آئیں گے بازار سے جاکر دل و جاں اور

وہ سنجیدگی سے غور کرنے لگی۔ آخر اس میں کیا بات ہے، جس سے دل کھنچا جاتا ہے؟ یہ بات قابل غور ہے کہ کوئی کسی کو کیوں پسند آجاتا ہے۔ پسندیدگی کے پیچھے کیا عوامل ہوتے ہیں؟ آج کے جوان ان حقائق کا تجزیہ نہیں کرتے کسی کو ٹھونک بجا کر پسند نہیں کرتے۔ بس کوئی اچھا لگتا ہے دل اسے مانگتا ہے تو عشق شروع کردیتے ہیں۔

اس معاملے میں دل بڑا نادان ہوتا ہے۔ کسی کی آنکھیں اچھی لگتی ہیں تو آنکھوں پر شاعری فرماتا ہے۔ کسی کے لب و رخسار پر آہیں بھرتا ہے۔ کسی آواز اور لہجے میں ایسی مردانگی ہوتی ہے کہ دل اس کی مٹھی میں چلا جاتا ہے۔فیروزہ کے دل نے کہا "یہی بات ہے، وہ ایک بات کہہ کر چپ ہوتا ہے تو اس کی آواز دیر تک میرے دل میں بجتی رہتی ہے۔

وہ اپنے دور تک پھیلے ہوئے خاندان میں اچھے اونچے پورے کئی جوان دیکھ چکی تھی لیکن دل میں دھمکنے والی آواز والا کوئی نہیں تھا۔ اس نے بند آنکھوں کے پیچھے اپنے چچازاد، ماموں زاد اور پھوپھی زاد کو بلا کر دیکھا۔ انہیں جانچا پرکھا۔ ان کی آوازیں سنیں لیکن چودھری اکبر علی کے سامنے ان سب کی آواز بیٹھ جاتی تھی۔ اس کا دل بھی بیٹھ جاتا تھا اور اسی سیکنڈ ہینڈ کے گلے پڑنے کے لیے ضد کرتا تھا۔ ایسے ہی وقت کہتے ہیں۔

دل کی آوارگی نہیں جاتی
عقل کی روک تھام جاری ہے

جہلم شہر سے ملازمین کو منگلا ڈیم لانے اور واپس لے جانے کے لیے سرکاری ٹرانسپورٹ کا انتظام تھا۔ اس روز سلمٰی نے جواد سے کہا "میں بھی ڈیم تک سیر کرنے جاؤں گی۔ میں نے اکبر سے گاڑی لی ہے آپ اسے ڈرائیو کریں گے۔"

وہ خوش ہوکر بولا "تم میرے بغیر نہیں رہتیں۔ میری ڈیوٹی کے وقت بھی مجھے نگاہوں کے سامنے رکھنا چاہتی ہو۔"

اس نے دل میں سوچا "میں پاگل نہیں ہوں کہ دن رات ایک ہی ریکارڈ بجاتی رہوں اور سنتی رہوں" پھر وہ مسکرا کر بولی "آپ نے تو مجھے پاگل بنادیا ہے، میرا بس چلے تو روز ہی آپ کے ساتھ جاؤں لیکن ڈیوٹی کے وقت ڈسٹرب کرنا بیوی کی نادانی ہوتی ہے۔"

"تم بہت سمجھ دار ہو۔ میں تو ڈیوٹی کے وقت بھی تمہیں یاد کرتا رہتا ہوں اسی لیے دن میں دو بار وہاں سے فون ضرور کرتا ہوں۔"

"سرکاری افسران کی ڈیوٹی یہی ہوا کرتی ہے۔ میرا خیال ہے ہمارے ملک میں اتنے ڈیم نہیں ہیں جتنے ڈیم فول افسران ہیں۔"

"آں؟" وہ ذرا جھینپ کر بولا "کیا تم مجھے کہہ رہی ہو؟"

"توبہ ہے۔ کبھی عقل سے بھی سمجھا کریں، میں محبت کرنے والی بیوی ہوں بھلا آپ کو ایسا کہہ سکتی ہوں۔ سرکاری ملازمین کے متعلق یہ میری نہیں عوامی رائے ہے۔ بہتان سب کے لیے ہوتا ہے اپنے لیے نہیں ہوتا۔"

وہ کوٹھی سے باہر آکر کار میں بیٹھ گئے۔ جواد نے کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھاتے ہوئے کہا "یہ بڑی مہنگی کار ہے۔ میرے سالے کی کیا بات ہے، اس نے اپنی گاڑی ہمیں دے دی۔"

"چلانے کے لیے دی ہے۔ آپ کی اوقات ایسی نہیں ہے کہ کبھی میرے لیے ایسی گاڑی خرید سکیں۔ گھر میں جو گاڑی ہے سنا ہے ابا جان اسے دس برس سے چلا رہے ہیں۔ توبہ ہے، کن کنجوسوں کے خاندان میں آگئی ہوں۔"

"بات کنجوسی کی نہیں ہے ابا جان نمائشی چیزیں خریدنے سے زیادہ جائداد خریدتے

رہتے ہیں۔ یہاں زرعی آلات کا کارخانہ کھولنے کی فکر میں ہیں۔"

"میں چاہوں تو یہ بارہ لاکھ روپے کی گاڑی میری ہو سکتی ہے۔"

وہ حیرانی اور خوشی سے بولا "کیا کہہ رہی ہو؟ کیا اکبر یہ گاڑی تمہیں دے سکتا ہے؟"

"بے شک۔ وہ میرا بھائی ہے۔ اگر میں اسے محبت سے کچھ دوں گی تو وہ بھی مجھے بہت کچھ دے سکتا ہے۔"

"کیا تم اسے کوئی تحفہ وغیرہ دینا چاہتی ہو؟"

"اس کی ایک خوشی پوری کرنے کا مسئلہ ہے۔"

"مسئلہ کیا ہے؟"

"وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔"

جواد نے تعجب سے سر گھما کر اسے دیکھا۔ پھر ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم نے اور تمہارے میکے والوں نے اگرچہ چھپایا ہے پھر بھی مجھے اوپر ہی اوپر سے معلوم ہو چکا ہے اکبر کے بیوی بچے ہیں۔"

وہ تنک کر بولی "ہیں تو کیا ہوا؟ میرے بھائی نے کوئی گناہ کیا ہے؟ منکوحہ عورت اور جائز بچے رکھنا کیا جرم ہے؟"

"پلیز ناراضگی سے نہ بولو۔ تم ناراض ہوتی ہو تو ایسا لگتا ہے میری قیمتی چیز چھن گئی ہے۔"

"آپ میرا اتنا خیال بھی رکھتے ہیں اور طعنے بھی دیتے ہیں۔"

"طعنہ نہیں دے رہا تھا۔ شکایت کر رہا تھا۔ میں تم پر قربان ہونے والا خاوند ہوں۔ مجھ سے اپنے میکے کا راز نہیں چھپانا چاہیے تھا۔"

"راز واز کچھ نہیں ہے۔ ہمیں شرم آتی ہے اس لیے بات چھپاتے ہیں۔"

"یہی بتادو کہ شرم کیوں آتی ہے؟"

"آپ کو اپنا مجازی خدا مان کر بتا رہی ہوں، وعدہ کریں یہ بات آپ اپنی امی ابا کو اور فیروزہ وغیرہ کو بھی نہیں بتائیں گے۔"

"میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر قسم کھاتا ہوں اگر اپنی جان سے زیادہ عزیز سلمیٰ رانی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاؤں گا تو ابھی ایکسیڈنٹ میں مارا جاؤں گا۔"

وہ بھڑک کر بولی "آپ کا دماغ چل گیا ہے اس گاڑی میں تو میں بھی بیٹھی ہوں۔ آپ کے ساتھ میں بھی ایکسیڈنٹ میں مروں گی گاڑی روکیں۔"

اس نے حکم کی تعمیل کی فوراً گاڑی روکی پھر پوچھا "کیا ہوا؟"

"خدا کا شکر ہے ایکسیڈنٹ نہیں ہوا پہلے آپ قسم واپس لیں پھر گاڑی اسٹارٹ کریں۔"

وہ کہنے لگا "میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر..."

وہ جھلا کر بولی "کیا آپ عدالت میں ہیں کہ خدا کو بار بار حاضر و ناظر جان رہے ہیں۔ سیدھے سادے انداز میں توبہ کریں اللہ سے معافی مانگیں۔"

وہ اپنے دونوں کانوں کو پکڑتے ہوئے بولی "کان پکڑیں میں جو کہوں وہ کہتے جائیں۔"

جواد نے اپنے دونوں کان پکڑ لیے۔ سلمیٰ نے کہا "یا خدا! مجھ سے بھول ہوگئی آئندہ حادثے اور موت والی باتیں نہیں کروں گا۔ مجھے ہر حادثہ اور ہر بلا سے محفوظ رکھ آمین۔"

وہ دہرانے لگا "یا خدا! مجھے ہر حادثہ اور..."

وہ ڈانٹ کر بولی "مجھے کا مطلب آپ نہیں میں ہوں میرے لیے دعا مانگیں۔"

وہ بولا "میری سلمیٰ رانی کو ہر حادثہ اور ہر بلا سے محفوظ رکھ۔ آمین۔"

وہ اپنے دھڑکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر اطمینان کی سانس لیتے ہوئے بولی "اللہ خیر کرے۔ اب چلیں اور احتیاط سے چلائیں۔"

وہ گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھاتے ہوئے بولا "تم موت سے اتنا ڈرتی کیوں ہو؟"

"پتا نہیں کیوں موت کے خیال سے ہی قبر کی تاریکی اور گوشت کھانے والے کیڑے یاد آتے ہیں، کلیجہ کانپنے لگتا ہے۔"

وہ دوپٹہ آنکھوں پر رکھ کر رونے لگی "ارے یہ کیا؟ رو کیوں رہی ہو؟"

وہ روتے ہوئے بولی "دنیا کا کوئی فرد اپنی موت پر نہیں روتا کیونکہ اپنی موت کے بعد اپنے اوپر رونے کا وقت گزر چکا ہوتا ہے لیکن میں اکثر اپنے سامنے اپنی لاش دیکھتی ہوں اور روتی رہتی ہوں۔"

"ہم کچھ اور باتیں کر رہے تھے۔ پتا نہیں یہ موت کا ذکر کیسے آگیا۔ پلیز! اپنا موڈ اور موضوع بدلو۔"

وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے اور اُس کے میکے والوں نے اکبر کی پہلی بیوی اور بچوں کو کیوں چھپایا ہے؟ اگر وہ منکوحہ ہے تو پھر شرم کی کیا بات ہے؟

بڑی دیر تک کار میں خاموشی رہی راستہ گزرتا رہا پھر سلمیٰ نے کہا "صغریٰ طوائف زادی ہے۔"

اس نے تعجب سے پوچھا "کون صغریٰ؟"

"اکبر کی منکوحہ۔ ہمارے مرحوم چچا کی بیٹی۔ چچا اس کی ماں کو منڈی سے لائے تھے۔ اپنی حویلی میں ڈال رکھا تھا۔"

"ڈال رکھنے کا مطلب ہے اسے داشتہ بنا کر رکھا تھا۔"

"میں نہیں جانتی۔ چچا کہتے تھے وہ اسے لاہور سے باقاعدہ نکاح پڑھوا کر لائے ہیں۔ بہرحال جو بھی ہو، صغریٰ حویلی میں پیدا ہوئی۔ اس کی ماں دس برس بعد مرگئی۔ ہم میں سے کوئی صغریٰ کو منہ نہیں لگاتا تھا۔"

جواد نے تائید میں سر ہلا کر کہا "درست ہے غلاظت کو کون منہ لگاتا ہے۔"

"چچا نے جب یہ دیکھا تو اپنی تمام جائداد صغریٰ کے نام لکھ دی۔ وصیت میں یہ لکھا کہ صغریٰ بیاہ کر خاندان سے باہر جائے گی تو قانون کے مطابق اسے جائداد سے ایک مقررہ حصہ ملے گا۔ باقی جائداد حکومت کی تحویل میں جائے گی اور اگر اپنے ہی خاندان کا لڑکا اکبر علی صغریٰ سے شادی کرے گا تو تمام جائداد خاندان ہی میں رہے گی۔"

"تمہارے چچا بہت چالاک تھے۔"

"ہم بھی احمق نہیں ہیں۔ میرے بھائی نے شادی کرکے زمینوں کو خاندان سے باہر نہیں جانے دیا اور ہم نے صغریٰ کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا۔ بھلا کیا منہ لے کر دنیا کو بتائیں کہ اس کی ماں کہاں سے آئی تھی۔"

"ہاں اس حکمت عملی سے چچا کی زمینیں اپنی ہوگئیں۔ زمین داری میں ایسے ہی داؤ پیچ سے جاگیر بڑھائی جاتی ہے۔"

وہ منگلا ڈیم کے دفتر تک پہنچ گئے۔ ایک چپراسی نے آکر سلام کیا پھر سلمٰی کے لیے کار کا دروازہ کھولا۔ وہ باہر آئی جواد کے ساتھ برآمدے سے گزرنے لگی۔ وہاں کام کرنے والے مزدور اور دیگر ملازمین سلام کر رہے تھے' سلمٰی نے اتنے سلام کرنے والے پہلے نہیں دیکھے تھے۔ میکے والی جاگیر میں باپ اور بھائی کو سلام کرنے والے کسان اور ملازمین ہوا کرتے تھے لیکن یہ سب کچھ شوہر کے ساتھ اچھا لگ رہا تھا۔ وہ ایک ملکہ کی شان سے سر اٹھائے بے نیازی سے سلام کا جواب دیے بغیر دفتر کے اندر آئی۔ جواد نے چھوٹے بڑے افسروں سے اس کا تعارف کرایا۔ سب نے خوش ہوکر اسے خوش آمدید کہا۔ ایک افسر نے جواد کو کچھ اشارہ کیا وہ بولا "یس سر! مجھے یاد ہے میں معاملہ ٹھیک کرلوں گا۔"

پھر وہ بیوی سے بولا "سلمٰی رانی! یہاں بیٹھو۔ ان سے باتیں کرو میں ایک کام نمٹا کر ابھی آتا ہوں۔" ایک افسر نے کہا "تم فکر نہ کرو یہ ہماری بھابی ہیں بھابی حکم کریں ٹھنڈا چلے گا یا گرم؟"

وہ چلا گیا۔ سلمٰی چائے کی فرمائش کرکے اپنے میاں کو دیکھ رہی تھی' وہ ساتھ والی کیبن میں گیا تھا۔ شیشے کے آرپار کیبن کے اندر دو چودھری قسم کے بندے اونچے شملے کی پگڑیاں پہنے بیٹھے تھے' جواد کو دیکھتے ہی اٹھ گئے تھے اور جھک کر سلام کر رہے تھے۔ جواد ایک حاکم کی شان سے ایک اونچی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا تھا۔

سلمٰی کو عجیب سا لگ رہا تھا مگر اچھا لگ رہا تھا۔ وہ پہلی بار میاں جی حضور کو رعب اور دبدبے سے بھرپور دیکھ رہی تھی۔ وہ چودھریوں کے سامنے حاکمانہ انداز میں بول رہا تھا۔ کیبن کے باہر آواز نہیں آرہی تھی تاہم اس کے انداز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ بڑے بڑے جاگیرداروں کو حقارت سے ڈانٹ رہا ہے' جھڑک رہا ہے اور ان کی کسی بات سے انکار کر رہا ہے۔

وہ بڑی بڑی پگڑیوں والے خوشامدانہ انداز اختیار کیے ہوئے تھے۔ جواد تھوڑی دیر تک

ان کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اثبات میں سر ہلا کر ریوالونگ چیئر سے اٹھ گیا۔ وہاں سے چلتا ہوا شیشے کے پاس آیا۔ شیشے کے اطراف پردے تھے' اس نے پردے کھینچ کر برابر کردیے۔ یوں کیبن کا اندرونی منظر چھپ گیا وہاں کے تمام کردار گم ہوگئے۔ اسرار پیدا ہوگیا کہ پتا نہیں اندر کیا ہورہا ہے؟

وہ دوسرے افسران سے باتیں کرنے لگی مگر دھیان اپنے میاں کی طرف لگا رہا۔ وہ بہت ہی پراسرار جہاں پناہ لگ رہا تھا جو پردے کے پیچھے زمینداروں کو کسی طرح کی پناہ دے رہا تھا۔ وہ آدھے گھنٹے بعد کیبن کا دروازہ کھول کر باہر آیا۔ اس کے چہرے پر افسرانہ شان اور دبدبہ تھا۔ بیوی کو دیکھتے ہی دبدبہ دب دب گیا۔ فوراً ہی مسکرا کر بولا "سوری سلمٰی رانی! میں ذرا مصروف ہوگیا تھا۔ آؤ میں تمہیں ڈیم دکھالاؤں۔"

وہ مسکراتی ہوئی اٹھ گئی۔ اس کے ساتھ دفتر سے باہر آکر بولی "آپ میرا اتنا خیال نہ کریں۔ اپنی ڈیوٹی کریں۔"

"وہ بھی ہو رہی ہے مگر تمہارے ساتھ مزہ آرہا ہے۔ سرکار سے یہ بل پاس کرانا چاہیے کہ افسران کے ساتھ ان کی بیگمات بھی دفتر آیا کریں تاکہ صاحبان کا موڈ ٹھیک رہا کرے اور پورے فارم میں رہ کر فرائض ادا کیا کریں۔"

وہ ہنستی ہوئی بولی "پھر رفتہ رفتہ بیڈ روم اٹھ کر دفتر میں آجائے گا۔"

وہ دونوں قہقہے لگاتے ہوئے ڈیم کی حد بندی کے پاس آئے۔ ایک ریلنگ سے لگ کر شور مچاتے ہوئے پانی کی تیزی اور تندی کو دیکھنے لگے۔ وہ ریلنگ کو چھوڑ کر جواد کو مضبوطی سے پکڑ کر بولی "مجھے ڈر لگتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پانی اپنی قوت سے مجھے کھینچ رہا ہے اور میں کھنچتی ہوئی جاؤں گی پھر وہاں غرق ہوجاؤں گی۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا "جہاں موت نظر آتی ہے' وہاں تمہاری حالت غیر ہو جاتی ہے۔ ویسے یہ پانی حیات بخش بھی ہے اور حیات کش بھی۔ اسی لیے ڈیم بنائے جاتے ہیں تاکہ یہ پانی ہی رہے' سیلاب بلا نہ بنے اور تمام کھیتوں کو اور تمام صوبوں کو پانی منصفانہ تقسیم سے پہنچتا رہے۔"

وہ جواد کو بدستور مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی۔ اسے کھینچتی ہوئی وہاں سے دور لے آئی۔ وہ کہہ رہا تھا "تم جس پانی کی تیزی سے ڈر رہی ہو اس سے بجلی پیدا ہو رہی ہے اور ہمارے گھروں تک جارہی ہے۔"

"توبہ ہے۔ بجلی بھی شاک پہنچاتی ہے اور ہلاک کرتی ہے۔"

"دنیا کی ہر چیز نقصان پہنچاتی ہے' ایک معمولی سی چیونٹی بھی کاٹنے سے باز نہیں آتی لیکن انسان کی عقل ہر نقصان کے پیٹ سے فائدہ نکالتی ہے۔"

اس نے پوچھا "اور یہ انسانی عقل چیونٹی سے کیا فائدہ حاصل کرتی ہے؟"

"ہم نے چیونٹیوں سے قطار بنانا اور خوراک ذخیرہ کرنا سیکھا ہے۔ ہم ایسے ڈیموں میں

پانی ذخیرہ کرتے ہیں۔ پھر پانی کی قلت کے وقت اسے مختلف نہروں کے ذریعے پورے ملک کے کھیتوں تک پہنچاتے ہیں۔"

دفتر کے سامنے خوب صورت سا باغیچہ تھا۔ نگاہوں میں تازگی بھرنے والی ہریالی اور رنگ برنگے پھول تھے۔ وہ کرسیوں پر آکر بیٹھ گئے۔ سلمیٰ نے پوچھا۔ "کیا پردے میں رہ کر کام کیا جاتا ہے؟"

"میں نہیں سمجھا کیسا پردہ؟"

"آپ نے کیبن میں زمینداروں سے گفتگو کرنے کے دوران شیشوں پر پردہ چڑھادیا تھا۔ آخر وہاں کیا ہو رہا تھا۔؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولا "تمام سرکاری شعبوں میں کچھ ڈیوٹیاں پردوں کے پیچھے ہوتی ہیں۔ تمہارے اکاؤنٹ میں جو رقمیں جمع ہو رہی ہیں' وہ اسی پردے کے پیچھے سے آتی ہیں۔"

وہ مسکرا کر بولی "میں سمجھ گئی تھی مگر سوچ رہی تھی دوسرے افسران اس معاملے سے دور کیوں ہیں' کیا وہ حاجی نمازی ہیں؟"

اس نے زور کا قہقہہ لگایا پھر کہا "ایسی بات نہیں ہے زمینداروں سے میں ہی معاملات طے کرتا ہوں حصہ سب کو پہنچ جاتا ہے۔"

"کیا انہوں نے بھی رقم دی ہے؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیا یہاں رقم لے کر پھنسنا ہے؟ تم دیکھ رہی ہو ادھر فوجی جوان اور افسران کتنے چوکس رہتے ہیں۔ ان کے کانوں میں لین دین کی بھنک پڑے گی تو ہم اندر ہوجائیں گے۔ ہم یہی تاثر دیتے ہیں کہ مختلف علاقوں کے زمیندار اور ٹھیکیدار پانی اور ریت کے حصول کے لیے درخواستیں لے کر آتے ہیں۔"

"وہ دونوں کیوں آئے تھے؟"

"ان میں سے ایک ٹھیکیدار تھا۔ اس نے ٹرکوں میں ریت بھر کر لے جانے کا ٹھیکہ حکومت سے لیا ہے۔ اسے معلوم کرنا پڑتا ہے کہ ہم یہاں سے کتنی مقدار میں پانی چھوڑ رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ پانی زیادہ چلے اور ریت بھرنے والے ٹرک اسی میں بہہ جائیں۔ وہ ہمیں کمیشن دیتا ہے' ہم ادھر پانی نہیں چھوڑتے۔"

"اور وہ دوسرا زمیندار کیا چاہتا تھا؟"

"قصہ یہ ہے کہ پچھلے سال یعنی مارچ ء میں چاروں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ اور وزرائے آبپاشی اور ان کے ماہرین نے متفقہ طور پر یہ معاہدہ کیا تھا کہ چاروں صوبوں میں پانی کی تقسیم منصفانہ ہوگی۔ بیشتر کینال میں پانی چھوڑنے کی مقدار مقرر کردی گئی۔ یہ زمیندار ہمیں کہنے آیا تھا کہ جلال پور کینال میں کیوسک پانی چھوڑنے کا حکم تھا لیکن ہم حکم کی تعمیل نہیں کر رہے ہیں؟"

سلمیٰ نے پوچھا "کیوں نہیں کر رہے ہیں؟"

"پانی کا ذخیرہ نہیں ہے۔"

"یہ جو آنکھوں کے سامنے اتنا پانی ہے؟"

"کوئی حکمران اور معائنہ کرنے والی ٹیم آنکھوں سے یہاں دیکھنے نہیں آتی۔ پانی کا یہ ذخیرہ ہمارے بینک بیلنس کے لیے ہے' وہ زمیندار خوش ہوکر گیا ہے اور ہمیں بھی خوش کرگیا ہے۔"

وہ ہنسنے لگی' پھر بولی "اصل بات تو رہ گئی۔"

"کون سی بات؟"

"وہی میرے بھائی کی شادی کا مسئلہ۔"

"میں اس مسئلے میں کیا کہہ سکتا ہوں تم بہتر سمجھتی ہو۔"

"آپ بہتر مشورہ دے سکتے ہیں۔ میں اپنے میکے والوں سے کہتی رہتی ہوں کہ آپ بے حد ذہین ہیں' پیچیدہ معاملات کو بڑی ذہانت سے سلجھا دیتے ہیں۔"

وہ خوش ہوکر بولا "ٹھیک ہے اکبر کا مسئلہ کیا ہے؟"

"یہی کہ اس کی زندگی میں ایک آئیڈیل بیوی نہیں ہے کیا وہ صغریٰ کو فخر سے بیوی کے طور پر دوست احباب کے سامنے لا سکتا ہے؟"

"نہیں۔ یہ اکبر کی بدقسمتی ہے۔"

"یہ بدقسمتی دوسری بیوی دور کرسکتی ہے۔ جس طرح آپ فخر سے مجھے ہر محفل اور تقریب میں لے جاتے ہیں۔ اکبر بھی ایک شریک حیات کے ساتھ یہ فخر حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

"ضرور۔ یہ میرے سالے کا حق ہے۔"

"آپ میرے بھائی کو گالی دے رہے ہیں۔"

"کیسی بات کر رہی ہو۔ یہ گالی نہیں' رشتہ ہے۔"

وہ مسکرا کر بولی "یہ اگر گالی بھی ہے تو برا ماننے والی نہیں ہے۔ پھر ایک بار میرے بھائی کو سالا بولیں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا "سالا میرا سالا اکبر سالا۔"

"میرا بھائی بھی آپ کو سالا کہنا چاہتا ہے۔"

"آں؟" جواد کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔ اس نے سنجیدگی سے اور سوالیہ نظروں سے سلمیٰ رانی کو دیکھا' پھر پوچھا "تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"فیروزہ کو اپنی بھابی بنانا چاہتی ہوں۔"

"ہوش میں تو ہو؟"

"کیا میں ہوش مند نہیں' پاگل نظر آرہی ہوں؟ کیا آپ کو اور فیروزہ کو پتھر مار رہی

ہوں؟"

"تم ہوشمند ہو لیکن میری بہن کی بھلائی نہیں سوچ رہی ہو۔ اسے ایک عورت کی سوکن بنانا چاہتی ہو۔"

"ہمارے خاندان میں اور اکبر کی نظروں میں پہلی نہ ہونے کے برابر ہے۔"

"مگر اس کا وجود ہے تم لوگ اس کی اہمیت سے انکار کرسکتے ہو' اس کے وجود کو صفر نہیں بنا سکتے۔ اس کا نمبرون ہے وہ ہر حال میں ون رہے گی۔ تم میری بہن کو نمبر ٹو بنانے کا احمقانہ خیال دل سے نکال دو۔"

وہ ناراض ہو کر' کرسی پر پہلو بدل کر اور منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ اس کے تیور بدلنے سے عاشق میاں نے پریشان ہوکر دائیں بائیں دیکھا۔ وہاں کام کرنے والے کافی فاصلوں پر تھے۔ شاید کسی نے صاحب کی بیگم صاحبہ کو ناراض ہوتے اور منہ پھیرتے نہیں دیکھا۔ دیکھے جانے سے پہلے اسے منا لینا لازمی تھا۔ وہ خوشامدانہ انداز میں بولا "پلیز سیدھی ہو کر بیٹھو لوگ کیا سوچیں گے۔"

"میں نہیں جانتی کیا سوچیں گے یہ آپ سوچیں۔"

"دیکھو میں تمہاری ہر بات آمنا صدقنا مان لیتا ہوں لیکن یہ میرا نہیں میرے پورے خاندان کا معاملہ ہے۔"

"اور اس خاندان میں آپ ہی ایک بیٹے ہیں۔ دوسرا کوئی نہیں ہے امی ابا آپ پر جان دیتے ہیں۔ آپ کی ہر بات مانتے ہیں ہر خواہش پوری کرتے۔ کیا یہ ایک بات نہیں مانیں گے؟"

"میں نے کبھی کوئی نامعقول بات نہیں منوائی۔ ایک بات اٹل ہے ہمارے خاندان میں وٹہ سٹہ نہیں چلتا۔ جس گھر سے لڑکی لاتے ہیں اس گھر میں اپنی لڑکی نہیں دیتےءاس سے بڑے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔"

"ایسے کیا مسائل پیدا ہوجائیں گے کچھ میں بھی تو سنوں؟"

"یہ مجھ سے نہیں ابا جان سے جاکر پوچھو' میں فیروزہ کا بھائی ہوں' وہ باپ ہیں۔ فیصلہ ان کی مرضی سے ہوگا۔"

وہ پھر منہ گھما کر بیٹھ گئی۔ وہ پریشان ہوکر بولا کیا مشکل ہے۔ دیکھو چپراسی آرہا ہے' مسکرا کر باتیں کرو۔"

چپراسی نے قریب آکر کہا "جناب! کھانا لگ رہا ہے' صاحب لوگ آپ کو اور بیگم صاحبہ کو بلا رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے' ہم آرہے ہیں۔"

وہ پتھر مارنے کے انداز میں بولی میں نہیں کھاؤں گی' مجھے بھوک نہیں ہے۔

چپراسی نے جواد کا منہ دیکھا۔ وہ جلدی سے بات بناتے ہوئے بولا "بیگم صاحبہ کے سر

میں درد ہے ہم بعد میں کھالیں گے' صاحب لوگوں سے کہو وہ لنچ کریں۔"

چپراسی چلا گیا جواد نے دبی زبان سے کہا "کیا تمام افسروں کے سامنے میری انسلٹ کروگی؟"

"اور آپ جو میرے پورے میکے میں مجھے ذلیل کرنے والے ہیں؟"

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ فیروزہ کے معاملے میں امی ابا جان مختار کل ہیں۔"

"میں اور آپ اکبر کی حمایت میں بولیں گے اور فیروزہ بھی راضی رہے گی ابا جان کے فیصلے کمزور پڑجائیں گے۔"

"اچھی بات ہے' سوچوں گا۔ پہلے دفتر میں چل کر روٹی کھاؤ ورنہ یہ ساتھی افسران ہمارے متعلق طرح طرح کی رائے قائم کریں گے۔"

وہ بڑے اعتماد سے کھانے کے لیے اٹھ گئی۔ میاں جی کو پہلے مرحلے میں تھوڑا جھکا لیا تھا۔ باقی شب خون مار کر میدان مار سکتی تھی۔

چودھری اکبر علی نے فون پر فیروزہ سے پیار بھری التجا کی تھی کہ وہ گھر سے باہر آکر کہیں ملاقات کرے۔ جو باتیں فون پر نہیں ہو سکتیں وہ روبرو ہو جائیں گی لیکن فیروزہ نے ہاں یا نہ میں جواب نہیں دیا تھا فون کا رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

تب سے اکبر علی کے بے قراری بڑھ گئی تھی۔ فیروزہ کی بے نیازی پر غصہ بھی آرہا تھا۔

وہ اپنی جاگیر میں جسے چاہتا تھا اس کا ہاتھ پکڑ لیتا تھا۔ جہلم' پنڈی' اسلام آباد اور لاہور میں جانے کتنی ہی چاہنے والیاں تھیں۔ قدرت نے اسے ایسے زبردست مردانہ حسن سے نوازا تھا کہ لڑکیاں لیموں کاٹتے وقت اسے دیکھتے دیکھتے اپنی انگلیاں کاٹ لیتی تھیں۔ گویا حسنِ یوسف" نصیب ہوا تھا۔ ایک فیروزہ تھی جو سحر زدہ نہیں ہو رہی تھی اور اگر ہو رہی تھی تو اوروں کی طرح بے لگام نہیں ہو رہی تھی۔ عورت کی آبرو اور انا کے حوالے سے محتاط رہنے کی عادی تھی۔

چودھری اکبر علی کو صبر کرنا نہیں آتا تھا۔ بچپن سے ہر ضد فوراً" پوری کر دی جاتی تھی۔ جوانی کے پہلے دن سے اس بیمار کو ہر علاقے کا انار مل جاتا تھا۔ وہی ایک جہلمی انار حلق میں اٹک گیا تھا۔ اسے اگلنا نہیں چاہتا تھا اور وہ نگلنے میں نہیں آرہی تھی۔ چونکہ نگل لینے کی ضد تھی اس لیے شادی کے لیے بھی آمادہ ہو گیا تھا۔ ورنہ گلے میں ڈھول لٹکائے رکھنا اس کے مزاج کے خلاف تھا۔

پھر یہ کہ فیروزہ کسی ایسے ویسے گھرانے سے نہیں تھی خاندانی لڑکی تھی۔ اپنی بیوی صغریٰ کو چھپا کر' پہلی شادی کو راز میں رکھ کر فیروزہ کو دلہن نہیں بنا سکتا تھا۔ اتنا بڑا دھوکا اس لیے بھی نہیں دے سکتا تھا کہ سلمیٰ آپا اس خاندان میں بیاہی گئی تھیں۔

پھر جب فیروزہ کو پہلی شادی کی روداد معلوم ہوئی تو وہ غصے سے انگارہ ہو گئی۔ اونچی اڑان والی پتنگ کی طرح کٹ کر ہاتھ سے نکل گئی۔ اب وہ فضا میں ڈول رہی تھی۔ وہ اسے لوٹنے کے لیے لپک رہا تھا۔ اچک رہا تھا اور وہ ہاتھ نہیں آرہی تھی۔

اس نے شام کو فون پر سلمیٰ سے پوچھا "فیروزہ کچھ کہہ رہی ہے میرے بارے میں؟"

"کچھ نہیں۔ اب وہ میرے کمرے میں بھی نہیں آتی ہے۔ جب تک اسے تمہاری

شادی کا علم نہیں ہوا تھا وہ دن رات میرے پاس گھسی رہتی تھی اور تمہارے بارے میں خوب باتیں کیا کرتی تھی۔"

"آپا! کسی طرح وہی دن واپس لے آؤ۔"

"کیسے لے آؤں؟"

"میں تمہارے لیے بڑی بڑی قربانیاں دیتا ہوں اور تم میرا اتنا سا کام نہیں کر سکتیں۔"

"کیوں جھوٹے دعوے کرتے ہو تم نے کون سی قربانی دی ہے؟"

"تمہاری عمر پچیس برس کہنے کے لیے خود کو چوبیس برس کا نوجوان ظاہر کرتا ہوں۔"

وہ ڈانٹ کر بولی "بکواس مت کرو' کیا ایسی باتیں فون پر کی جاتی ہیں۔"

عمر یاد آنے سے مستی میں ناچتی ہوئی مورنی کو اپنے بھدّے پاؤں نظر آجاتے تھے۔ رشتے کے انتظار میں چونتیس برس کی ہو گئی تھی۔تب جواد جیسا گدھا سواری کے لیے ملا تھا۔ نکاح پڑھاتے وقت اس کی عمر پچیس برس لکھوائی گئی تھی جبکہ وہ میاں سے چھ برس بڑی تھی۔

ساس کو بہو پسند نہیں تھی۔ وہ بیٹے کی پسند کو برداشت کر رہی تھی سسر نے بھی شادی سے پہلے سلمیٰ کو دیکھا اور سمجھا تھا لیکن زبان سے نہیں کہا کہ وہ کچھ عمر والی لگتی ہے۔ بہو اپنے ساتھ پچیس لاکھ روپے اور اپنے حصے کی کچھ زمینیں لے کر آئی تھی۔ پھر جواد اس کا دیوانہ تھا۔ اس لیے ہر طرح سے اس کی پوزیشن موجود تھی۔ اس کے باوجود کوئی عمر کا حساب کرے تو اسے غصہ آجاتا تھا۔

وہ بولی "اکبر! کام کی باتیں کرو۔ جب وہ تمہارا نام نہیں سننا چاہتی ہے تو میں اسے تمہاری طرف کیسے مائل کروں؟"

"تم چاہو تو ہمارے ملاقات کرا سکتی ہو۔"

"کیا مجھے سسرال سے نکلواؤ گے؟"

"تم پر کوئی بات نہیں آئے گی۔ ہماری ملاقات کے لیے دور ہی دور رہ کر راستہ ہموار کر سکتی ہو۔"

"تم تو پیچھے پڑ گئے ہو۔ فیروزہ جیسی ہزاروں لاکھوں مل جاتی ہیں۔"

"لاکھوں ملتی رہیں گی۔ پھر بھی دل اسے مانگتا رہے گا۔"

"توبہ ہے بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے؟"

"فیروزہ کے امتحانات کب ختم ہو رہے ہیں؟"

"ختم ہو چکے ہیں۔ کل اس نے آخری پرچہ دیا تھا۔ اب رزلٹ آنے تک گھر میں رہے گی۔ نہ باہر جائے گی نہ کسی بہانے۔تم سے ملاقات ہو سکے گی۔"

"میں یہی چاہتا ہوں کہ وہ گھر سے باہر نہ جائے۔ اس کا باپ یعنی تمہارا سسر صبح نو بجے گھر سے چلا جاتا ہے۔ صرف تمہاری ساس ایک دیوار ہے۔ اسے کسی طرح دو چار گھنٹے

کے لیے کسی رشتے دار کے ہاں بھیج سکو تو میرا کام بن جائے گا۔"

"امی کہیں جائیں گی تو فیروزہ کو ساتھ لے جائیں گی۔"

"ایسی تدبیر ہو سکتی ہے کہ وہ گھر میں تنہا رہ جائے۔"

"تدبیر کے باوجود تنہا نہیں ہوگی کیونکہ میں یہاں رہوں گی اور میں نہیں چاہوں گی کہ میری موجودگی میں تم دونوں کی ملاقات ہو اور بات بگڑے تو سارا الزام مجھ پر آئے۔"

وہ تھوڑی دیر سوچتا رہا پھر بولا "آپا! تم جانتی ہو نا؟ ابھی جو ہنڈا ایکارڈ میرے پاس ہے وہ بارہ لاکھ روپے کی ہے۔ اگلے دو مہینوں میں جو کار خرید رہا ہوں اس کی قیمت بیس لاکھ روپے ہے۔ میں بارہ لاکھ کی موجودہ کار فروخت نہیں کروں گا۔ یہ تمہیں دے دوں گا۔"

سلمیٰ نے خوش ہو کر ایک گہری سانس کھینچی پھر پوچھا "کیا سچ کہہ رہے ہو؟"

"کیا جھوٹ سمجھ رہی ہو؟ کیا میں نے تمہاری شادی میں تین لاکھ کا ہیروں کا سیٹ نہیں دیا تھا۔ جس دن فیروزہ سے میرے نکاح کی تاریخ طے ہوگی اسی دن وہ کار تمہاری ہو جائے گی۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اکبر نے پوچھا "کیا میری آفر سمجھ رہی ہو؟"

"ہاں تم نے تو مجھے بارہ لاکھ کی سولی پر چڑھا دیا ہے۔ میری سانسیں رک رہی ہیں۔ میں کوئی تدبیر سوچتی ہوں۔"

"جلدی سوچو' جتنی جلدی وہ میری ہوگی اتنی ہی جلدی کار تمہاری ہو جائے گی۔"

"کل صبح آؤ میں کچھ نہ کچھ کروں گی۔ اصل مسئلہ تو فیروزہ کو راضی کرنا ہے۔ وہ ہوئی راضی تو پھر جیت لی بازی۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اب اس کے اندر کھلبلی سی ہو رہی تھی وہ جیسے نیلام گھر میں پہنچ گئی تھی۔ بھائی کی ایک بولی پر نند کو اس کے حوالے کر کے بارہ لاکھ کی کار جیت سکتی تھی۔ کار دسترس میں تھی اور نند گھر میں۔ صرف دو گام چلتی اور منزل مراد سامنے آجاتی۔

وہ سوچتے سوچتے فیروزہ کے پاس آئی۔ پہلے تو اسی لڑکی کو سبز باغ دکھانا تھا اور شیشے میں اتارنا تھا۔ وہ ایک صوفہ پر بیٹھی وی سی آر کے ذریعے فلم دیکھ رہی تھی۔ سلمیٰ نے اس کے پاس آکر بیٹھتے ہوئے پوچھا "کون سی فلم ہے؟"

وہ فلم کے دلچسپ سین پر نظریں جمائے ہوئے بولی "دل ہے کہ مانتا نہیں۔"

"تمہارا دل کب مانے گا فیروزہ؟"

اس نے چونک کر بھابی کو دیکھا۔ پھر انجان بنتے ہوئے کہا "بھابی! میں فلم کا نام بتا رہی ہوں۔"

سلمیٰ نے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر ٹی وی بند کرتے ہوئے کہا "یہ فلم تم میرے ساتھ پہلے بھی دیکھ چکی ہو۔ تم اسے دوبارہ اس لیے دیکھ رہی ہو کہ اس فلم کی ہیروئن تمہارے مزاج کے مطابق ہے۔ ہیرو اسے راضی کرتا ہے اور وہ راضی نہیں ہوتی لیکن دل ہی دل

میں ہیرو سے متاثر ہوتی رہتی ہے۔"

"میں آپ کے بھائی سے متاثر نہیں ہوں۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔ اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہو۔ میرے جانے کے بعد اس فلم کو اور غور سے دیکھنا۔ فلم کی ہیروئن پوجا آخر تک زبان سے انکار کرتی رہتی ہے لیکن اس کا دل انکار کو نہیں مانتا۔ آخر جب دل نہیں مانتا ہے اور محبت مجبور کرتی ہے تو وہ عامر خان کے بازوؤں میں چلی آتی ہے۔ میں پوچھتی ہوں تمہارا دل کب مانے گا؟ جب میرا بھائی اپنی جان دے دے گا؟"

"کوئی کسی کے لیے جان نہیں دیتا۔ جان دینے والے مجنوں رانجھا اور مہینوال وغیرہ سب کنوارے تھے۔ آج تک کسی شادی شدہ مجنوں نے کسی کنواری پر جان نہیں دی۔ صرف ہوس پوری کی ہے سیدھی سی بات ہے جو مجنوں ہوگا وہ کنوارا ہوگا۔ جو شادی شدہ ہوگا وہ مجنوں نہیں ہوگا۔"

"توبہ ہے سلائی مشین کی طرح بولتی چلی جاتی ہو۔ کیا جس کی شادی ہو جاتی ہے اس کا دل مرجاتا ہے؟ کیا اس کا دل پیار کے لیے نہیں دھڑکتا؟ تم اس حقیقت کو سمجھتی ہو کہ اکبر کو پہلے ہی آئیڈیل بیوی مل جاتی یا پہلے تم اس کی زندگی میں آجاتیں تو آج وہ یوں عاشق مزاج نہ ہوتا۔ تمہارے ساتھ بہترین ازدواجی زندگی گزار رہا ہوتا۔"

فیروزہ نے آنکھیں بند کرلیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے اکبر عاشق کے ساتھ اپنی ازدواجی زندگی گزرتے دیکھنے لگی۔ چند لمحوں میں نہ جانے اس کے ساتھ کتنے موسم گزار لیے۔ بھابی کی آواز پر چونک گئی وہ کہہ رہی تھی "میں جانتی ہوں تم میرے ویر کو سوچ رہی ہے۔"

وہ "اونہہ" کے انداز میں سر جھٹک کر بولی "جی نہیں میرے پاس سوچنے کے لیے فالتو وقت نہیں ہے۔"

سلمیٰ نے بڑے درد بھرے انداز میں اس کا ہاتھ تھام کر کہا "تو اسے نہ ملی تو وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ جیسے تیرا بھائی اس خاندان میں ایک ہی بیٹا ہے۔ ویسے ہی اکبر ہمارے خاندان کا واحد چشم و چراغ ہے۔ میں اس بات کی ضمانت دیتی ہوں' صغریٰ تیری ازدواجی زندگی میں آہٹ بن کر بھی نہیں آئے گی۔ تیرے جتنے مطالبات ہیں وہ شادی سے پہلے پورے کردیے جائیں گے اور تیرے دل میں جو ہے' اسے اگل دے۔ مجھے صرف بھابی نہیں سہیلی سمجھ کر کچھ نہ چھپا۔"

وہ ایک دم سے گھوم کر سلمیٰ سے لپٹ گئی۔ وہ یہی چاہتی تھی۔ دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے اسے ماں اور بھابی کی نہیں ایک سہیلی کی ضرورت تھی۔ پانی کا ریلا ہو یا جذبات کا اگر اس کی نکاسی کا راستہ نہ ہو تو یہ بند توڑ کے نکل جاتا ہے۔ بند کا ٹوٹنا نقصان پہنچاتا ہے۔ فیروزہ کا دل اس گھبرو کو مانگتا تھا۔ صحیح راستے سے نہ ملے تو غلط راستے سے مانگتا تھا۔ وہ بے چینی سے سوچتی تھی کہ اپنے اندر کی بات کسے بتائے؟ کس طرح غبار نکالے؟ باتوں سے

پیٹ پھولے تو ایک دن بھی انتظار کا یارا نہیں ہوتا۔ سلمیٰ اس کی یار بن گئی تو اس سے یوں لپٹ گئی جیسے اس کے بھائی سے لپٹ رہی ہو پھر بے اختیار بولنے لگی۔

او ظالما! میں ٹوٹ گئی۔

میں سوچتی تھی، تو باسی ہوگیا ہے میں اپنی تازگی کو تجھ سے دور رکھوں۔

تجھے دور سے دیکھوں اور دور سے محبت کروں۔ پاس آکر تجھے چھونے کی کوشش غلطی کروں گی تو تُو ضرورت بن جائے گا۔

ہائے مگر انکشاف ہو رہا ہے کہ تیری ضرورت لہو بن کر رگوں میں دوڑ رہی ہے اور زہر بن کر میرے بدن میں پھیل رہی ہے۔ عجیب بندہ ہے باہر رہ کر اندر کرامات دکھا رہا ہے۔

سلمیٰ سن رہی تھی۔ فاتحانہ تبسم کے ساتھ اس کی پشت کو سہلا رہی تھی۔ پھر اس نے کہا "یہ اچھا کیا کہ مجھے رازدار بنالیا۔ آج سے تو میرے بھائی کی ہے۔"

وہ چونک گئی جیسے نیند میں اکبر کے وجود سے لگ رہی تھی۔ اب خیال آیا بھابی سہیلی سے لگی ہے اور جانے کیا کچھ کہہ گئی ہے۔ اچھا ہوا کہ جنوں میں بولتی رہی ورنہ کبھی نہ بول پاتی۔

سلمیٰ کی اب کسی شک و شبے کے بغیر بارہ لاکھ کی لاٹری نکل آئی تھی۔ اس نے کہا "میرا بھائی تجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ کیا میں اسے کل آنے کے لیے کہوں؟"

کل میں امی کے ساتھ پنڈی جاؤں گی وہاں خالہ جان بہت بیمار ہیں۔"

"وہ خالہ جان کی عیادت کو چلی جائیں گی تو کسی بہانے رک جا۔"

"میں کیا بہانہ کروں؟"

"ہزار حیلے بہانے ہوسکتے ہیں۔ عورت کی تکلیف عورت ہی سمجھتی ہے بس ایسی ہی کوئی بیماری یا تکلیف بتا دینا۔"

پھر اس نے اپنا منہ کان کے پاس لاکر رازداری سے کچھ کہا فیروزہ نے تائید میں سر ہلا کر کہا "ٹھیک ہے یہی بہانہ کروں گی۔"

سلمیٰ نے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "تم نے جی خوش کردیا ہے۔ میں ابھی اکبر سے بات کرتی ہوں۔"

وہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی پھر ٹیلیفون کے پاس بیٹھ کر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔ رابطہ قائم ہوگیا۔ ایک ملازم کی آواز سنائی دی۔ اس نے کہا "اکبر سے کہو میں سلمیٰ بول رہی ہوں۔"

وہ انتظار کرنے لگی پھر اکبر کی آواز آئی "ہیلو آپا! خیریت؟"

"خیریت بھی ہے اور خوش خبری بھی۔"

"کیا واقعی؟"

"پہلے بتاؤ میرے انعام کا کیا ہوگا؟"

"میں جو وعدہ کرتا ہوں پورا کرتا ہوں دو ماہ کے اندر میری نئی کار آرہی ہے۔ یہ ہنڈا ایکارڈ تمہیں دے دوں گا۔"

"میں نے فیروزہ سے اس کے دل کی بات اگلوا لی ہے وہ تو تم پر بری طرح مرتی ہے۔ اوپر سے نخرے دکھا رہی تھی۔ میں نے ایسا منتر پھونکا کہ وہ تم سے ملنے کے لیے راضی ہوگئی ہے۔"

"تم نے تو کمال کردیا ہے آپا! ملاقات کب ہوگی؟"

"کل صبح امی پنڈی جارہی ہیں۔ ابا ٹھیک نو بجے شوروم چلے جاتے ہیں، اگر تم ایک دن کے لیے اپنی کار مجھے دے دو تو میں جواد کے ساتھ منگلا چلی جاؤں گی۔"

"کیا کام دکھا رہی ہو آپا! میں ابھی رات دس بجے تک کار تمہارے پاس چھوڑ جاؤں گا۔"

پھر یہی ہوا وہ رات ہی کو کار چھوڑ گیا۔ سلمیٰ جواد کے ساتھ پروگرام بناکر منگلا چلی گئی۔ چودھری عنایت حسین اپنے وقت پر شو روم چلے گئے .. ان کی بیگم صبح سات بجے ہی پنڈی جاچکی تھیں۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ بہو ان کے بیٹے کے ساتھ منگلا جانے والی ہے تو شاید وہ بیمار بہن کے پاس پنڈی نہ جاتیں لیکن بہو نے یہی تاثر دیا تھا کہ وہ گھر میں فیروزہ کے ساتھ رہے گی۔

صبح دس بجے تک سب چلے گئے ماسی گھر کی صفائی اور ٹاکی لگا کر رخصت ہوگئی۔ اکبر سے ملاقات کا خیال ایسا تھا کہ سوچ سوچ کر دل دھڑک رہا تھا۔ وہ آپ ہی آپ شرماتی رہتی تھی اور بھابی وغیرہ سے چھپ چھپ کر مسکراتی رہی تھی لیکن جب گھر میں کوئی نہ رہا بالکل تنہا رہ گئی تو اسے بے امانی کا احساس ہوا۔ وہ گھبرانے لگی ایسی سازشی تنہائی میں اکبر آئے گا تو کیا ہوگا؟

سلمیٰ نے کہا تھا "گھبراتی کیوں ہو میں کار میں بازار تک جا رہی ہوں۔ تمہارے بھائی جان مجھے یہاں واپس چھوڑ کر منگلا جائیں گے، میں آدھے گھنٹے میں آجاؤں گی۔"

بس اسی تسلی نے دل کو سنبھالا ہوا تھا ورنہ محبوب سے ملنے کے خیال سے جو دل مسرت سے دھڑک رہا تھا اسے دھڑکا لگ گیا تھا۔ ادھر جواد نے روانگی کے وقت کہا تھا گھر میں کوئی نہیں ہے۔ تم بھی میرے ساتھ چل رہی ہو، فیروزہ اکیلی رہ جائے گی۔

"تو کیا ہوا۔ وہ ننھی بچی نہیں ہے۔ پھر اپنے گھر کی چار دیواری میں ہے، کیا اسے شیر اٹھاکر لے جائے گا۔"

"نہیں میں تو صرف ابا جان کے خیال سے کہہ رہا تھا۔ وہ ناراض ہوں گے کہ بہو یک جوان بیٹی کو تنہا چھوڑ کر کیوں گئی ہے۔"

"میں نے کسی کو نہیں بتایا ہے کہ ہم دس میل دور منگلا جا رہے ہیں۔ آپ فکر نہ

کریں میں ابا جان سے نمٹ لوں گی۔"

وہ قائل ہو کر بیوی کے ساتھ چلا گیا۔ بعض بہویں اور بھابیاں ایسی ہوتی ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے بہو کاٹے رشتوں کا لہو اور بھابی نند کی خرابی اس کہاوت کو سلمیٰ سچ کر رہی تھی۔

کال بیل کی آواز پر فیروزہ تیزی سے چلتی ہوئی آئی۔ بھابی نے آدھے گھنٹے میں آنے کو کہا تھا اور ٹھیک آدھا گھنٹہ گزرا تھا۔ اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا۔ دل دھک سے رہ گیا۔ دروازے کے فریم میں محبوب کھڑا مسکرا رہا تھا۔

اس نے جلدی سے دوپٹے کو سر پر سنبھالتے ہوئے منہ پھیر لیا۔ وہ اندر آکر بولا "کیا اب بھی منہ پھیروگی؟"

"وہ وہ بھابی اور بھیا آتے ہوں گے۔"

اس نے دروازے کی چٹخنی چڑھاتے ہوئے کہا "وہ نہیں آئیں گے دونوں منگلا گئے ہیں۔"

وہ ذرا دور ہو کر بولی "بھابی نے مجھ سے کہا ہے کہ وہ ابھی آجائیں گی۔"

"آپا یہ نہ کہتیں تو تم یہاں اکیلی نہ رہتیں۔"

یہ سنتے ہی دل گھبرانے لگا۔ اتنے بڑے مکان میں اس کے ساتھ تنہا تھی جسے یاد کر کے تصورات کی تنہائیاں دور کرتی تھی۔ صحیح حالات معلوم ہوتے ہی اس کے اندر گرم ہوا چلنے لگی۔ اب اس کی طرف نظر اٹھانے کے خیال سے ہی بدن لرز رہا تھا۔ اس کپکپاہٹ میں خوف نہیں تھا تشویش تھی اور تجسس تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔

وہ دوسری طرف گھوم کر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ گھوم کر سامنے آگیا اس نے کترا کر جانا چاہا وہ راستہ روک کر بولا "کیوں شرماتی ہو میں غیر نہیں ہوں۔ اپنے دل سے پوچھو اس وقت سارا جہاں بیگانہ ہے اور میں خون کے رشتوں سے بھی زیادہ تمہارا اپنا ہوں۔"

اس کا دل مان رہا تھا اور ساری دنیا کی دولت کے عوض اسے مانگ رہا تھا۔ اس نے چھوٹی سی ایک ڈبیا کھول کر ہیرے کی ایک انگوٹھی نکالی پھر کہا "یہ پہلی ملاقات کا تحفہ ہے اسے قبول کرو۔"

وہ پیار بھرے تحفے سے انکار نہیں کر سکتی تھی لیکن ٹالنا چاہتی تھی۔ ٹالنے کے لیے کچھ کہنا ضروری تھا اور کہنے کے لیے زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر انکار کے انداز میں ہلایا۔ چودھری اکبر نے ہاتھ پکڑ لیا۔ کیا پکڑ تھی سارا وجود مٹھی میں چلا گیا۔ وہ ہاتھ پکڑ کر انگوٹھی پہنا رہا تھا اور اسے پسینہ آرہا تھا۔ اس خیال سے بھیگ رہی تھی کہ وہ اپنی ملکیت بنا رہا ہے اور اس کی ہاں یا نہ کے بغیر بنا رہا ہے۔

پھر اس نے ایک نیکلس نکالا۔ سونے کے ہار میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ وہ ہار کے دونوں سروں کو تھامے ہوئے اس کی گردن کے قریب لایا وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس

کے ہاتھوں سے پہننے کا مطلب یہ ہوتا کہ پہنانے والا سانسوں کے قریب آجاتا۔ اس نے بڑی محبت اور عاجزی سے کہا "پلیز میرا دل نہ توڑو اپنے ہاتھوں سے پہنانے دو۔"

وہ آگے بڑھا اس بار یہ پیچھے نہ ہٹ سکی۔ پیروں میں زنجیر سی پڑ گئی وہ بالکل روبرو ہو گیا اس نے ہار پہنانے کے لیے دوپٹے کو سر سے ڈھلکایا تو وہ ڈھلکتا ہوا فرش پر چلا گیا۔ اس پر جو گزر رہی تھی اس کے بعد اسے پردے کا ہوش نہ رہا تھا۔ وہ سحرزدہ ہوگئی تھی اور وہ اس پر جھکا ہوا ہار پہنا رہا تھا کہ گرم گرم سانسیں چہرے پر طلسم جگاتی جا رہی تھیں۔

ایسے میں دل کیا تھا؟ بے ایمان ہو رہا تھا۔

دماغ کیا تھا؟ احساسات کے ہجوم میں پگلا رہا تھا۔

اور بدن کیا تھا؟ جذبوں کی سان پر چڑھا ہوا تھا۔

سانسیں تھیں کہ دریا کی طرح چڑھ رہی تھیں۔ دریا کی طرح اتر رہی تھیں۔ پیار کرنے والے سو آوارگی میں اتنا چڑھا دیتے ہیں کہ پھر وہاں سے اترنا محال ہوجاتا ہے۔

اسے اپنے کان میں سرگوشی سنائی دی۔ وہ چڑھتی ہوئی سانسوں میں کہہ رہا تھا۔ "شکریہ تم نے میری پناہ میں آکر مجھے عالم پناہ بنا دیا ہے۔"

وہ سستے کے دور میں بنوائی ہوئی پندرہ لاکھ کی مضبوط کوٹھی تھی اب اس کی قیمت تقریباً" چالیس لاکھ روپے ہوگئی تھی۔ اتنی مہنگی کوٹھیاں صرف شان و شوکت کی نمائش کے لیے نہیں بنوائی جاتیں۔ پردہ شرافت اور تہذیب قائم رکھنے کے لیے یہ دبدبہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ وہاں باہر کی گندگی اندر نہیں آتی ہے۔ یہاں سے ٹکرا کر واپس جانے والا گندگی کا سیلاب غریبوں کے کچے مکانوں میں گھستا ہے۔

یہ محض خوش فہمی ہے۔ گندگی کے ریلے کو مضبوط اور قیمتی دیواریں نہیں روک پاتیں۔ اسے تو صرف عورت کی شرم اور مرد کی غیرت روکتی ہے۔ اس کوٹھی میں خاندان کا سربراہ چودھری عنایت حسین تھا۔ وہ جوان بیٹی کی ذمہ داری بیگم کو سونپ کر گیا۔ بیگم اپنی بہو کے بھروسے پر اسے چھوڑ گئی تھی۔ وہاں ایک غیرت مند بھائی تھا جو بیوی کو خوش کرنے کے لیے کوٹھی کے درودیوار کو بہن کا محافظ بنا کر چلا گیا۔ جانا بھی ضروری تھا۔ بیوی نے گھر کی عزت کو داؤ پر لگا کر بارہ لاکھ کی رشوت لی۔ میاں ڈیم کا پانی بیچ کر حرام کماتا تھا اور جس گھر میں حرام آجاتا ہے وہاں محض دکھاوے کی عزت اور غیرت باقی رہ جاتی ہے۔

کبھی اس بے حیا ملاقات کا راز کھلے گا تو ایک دوسرے سے پوچھا جائے گا کہ یہ سیلاب گھر کے اندر کیسے آیا تھا۔ وطن عزیز کے اہلکاروں کی طرح کوئی اپنے سر پر الزام نہیں لے گا کہ یہ برائیاں اور تباہیاں کہاں سے آتی ہیں؟ بے حسی' غیر ذمہ داری' منافع خوری اور رشوت کے حصول کا ذکر بھی نہیں آئے گا۔ سب اپنا بچاؤ کریں گے اور اسے مقدر کی مرضی اور قدرت کی رضا کہیں گے جبکہ یہ تسلیم شدہ کلیہ ہے کہ عورت کسی مرد کی شرکت اور بے غیرتی کے بغیر بے حیا نہیں بنتی۔ یہ جو گھروں میں سیلاب آتا ہے یہ چند بڑے اہلکاروں کی شرکت اور بے غیرتی سے آتا ہے۔

چودھری عنایت حسین ایک بجے دوپہر کا کھانا کھانے آئے تو بیٹی کو تنہا دیکھ کر حیران ہوئے لیکن اس کی معصومیت اور گھر کے بند دروازے دیکھ کر مطمئن ہوگئے۔ پھر فیروزہ نے جھوٹ کہہ دیا کہ بھابی ابھی بازار گئی ہیں' جلد ہی آجائیں گی۔

وہ کھانے کے بعد پھر شو روم گئے اور نصیحت کرگئے کہ دروازہ اچھی طرح بند رکھنا کسی

اجنبی کی آواز پر اسے نہ کھولنا۔ بہو جلد نہ آئے کوئی پریشانی ہو تو فون کر دینا وہ گھر آجائیں گے۔

وہ اپنی کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔ فیروزہ نے دروازے کو اندر سے بند کردیا۔ چودھری اکبر اس کی خواب گاہ میں تھا۔ پلنگ کے نیچے سے نکل آیا۔

وہ اپنے باپ کو معصوم کیسے نہ نظر آتی۔ اس نے باپ کی آمد سے پہلے ہی غسل کیا تھا۔ لباس تبدیل کیا تھا۔ چہرے کے کچھ چغلی کھانے والے ہلکے نشانات کو لوشن' کریم اور لپ اسٹک سے چھپایا تھا۔ بے حیائی آنکھوں سے جھلکتی ہے۔ اس نے نظریں جھکا کر باپ سے باتیں کی تھیں اور باپ کی شرافت کا یہ عالم تھا کہ وہ جوان بیٹی کو نظریں اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا اور یوں لٹی ہوئی معصومیت کا بھرم رہ گیا۔

سہ پہر تین بجے سلمیٰ نے منگلا سے فون پر فیروزہ کو مخاطب کیا پھر پوچھا۔ "میری سہیلی! خیریت سے ہو؟"

"بھابی آپ نے سہیلی بن کر دھوکا دیا ہے۔"

"سہیلی! یہ تو مانتی ہو کہ اس فریب نے آج تمہیں لالہ و گل بنا دیا ہے۔"

وہ ذرا شرمائی اور کھل کر مسکرائی پھر ریسیور اکبر کو دیتے ہوئے بولی "تمہاری آپا ہیں۔"

وہ ریسیور لے کر بولا "ہیلو آپا! تمہاری مرضی سے مجھے فیروزہ کی یادگار محبتیں مل رہی ہیں۔"

"اس خوشی میں میری عزت کا خیال رکھو۔ ابھی تک وہاں کیا کر رہے ہو؟"

"تمہیں کیا بتاؤں کہ کیا کر رہا ہوں۔"

"بس وہاں سے فوراً" نکل جاؤ میں تمہارے بہنوئی کے ساتھ آرہی ہوں۔"

"اچھا میں جارہا ہوں۔"

"ریسیور رکھتے ہی چلے جاؤ۔ میرا خیال کرو مجھے اس گھر میں زندگی گزارنی ہے۔"

"بھئی جارہا ہوں۔ تم تو پیچھے پڑگئی ہو۔"

وہ ریسیور کو کریڈل پر رکھ کر فیروزہ سے بولا "تم سے الگ ہونے کو جی نہیں چاہتا مگر جانا پڑے گا۔ آپا اور جواد بھائی آرہے ہیں۔"

وہ وہاں سے اٹھ گئے اکبر نے قمیض پہنتے ہوئے آئینے میں دیکھا' کنگھی سے بالوں کو درست کیا۔ فیروزہ پاس آکر اس کی پشت سے لگ گئی پھر بولی "میں اکیلی رہ جاؤں گی۔"

"میری جان میں پھر آؤں گا۔"

"کب آؤ گے؟ جب تک نہیں آؤ گے یہ کمرا مجھے ستائے گا۔"

"تم نے بتایا ہے کہ آپا کی خواب گاہ کا دروازہ کوٹھی کے پچھلے حصے کی طرف کھلتا ہے۔ میں اسی پچھلے دروازے سے آؤں گا۔"

"لیکن اس خواب گاہ میں بھائی جان سوتے ہیں۔"

KUTUBISTAN.BLOGSPOT.COM

"اس کی فکر نہ کرو- یہ آپا کا مسئلہ ہے وہ نمٹ لیں گی-"

وہ باتیں کرتے ہوئے بڑے ڈرائنگ روم میں آئے- وہاں سے بیرونی دروازے پر آکر اسے کھولا۔ باہر لان میں اور کوٹھی کے احاطے میں کوئی نہیں تھا- فیروزہ نے مطمئن ہوکر اکبر کو باہر آنے کے لیے کہا- پھر اس کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی احاطے کے گیٹ تک جانے لگی- وہ بہت خوش تھا- بڑی زندہ دلی سے بول رہا تھا لیکن فیروزہ سے اس کی جدائی برداشت نہیں ہو رہی تھی- وہ گیٹ کھولنے سے پہلے بولی- "میں تمہارے بغیر اندر سے خالی خالی رہوں گی- میں ساری رات جاگتی رہوں گی' تمہارے انتظار میں صبح کر دوں گی-"

"تم اطمینان رکھو- میں فون پر آپا سے معاملات طے کروں گا کہ وہ کس طرح اپنے کمرے کا پچھلا دروازہ استعمال کرنے دیں گی اور یہ کب ممکن ہوگا جب بھی ممکن ہوگا میں چلا آؤں گا-"

وہ تھوڑی دیر تک اپنا ہاتھ. اس کے ہاتھ میں دیئے کھڑی رہی- آنکھوں سے دل کی باتیں کرتی رہی- باہر اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوسکتا تھا- پھر اس نے گیٹ کے چھوٹے بغلی دروازے کو کھول دیا- اسی وقت ایک ٹیکسی سامنے آکر رک گئی- اکبر آدھا دروازے کے اندر تھا- آدھا باہر نکل چکا تھا اور فیروزہ کی امی ٹیکسی کا دروازہ کھول کر آرہی تھیں- دونوں کی نظریں ٹکرائیں بلکہ تینوں کی نظریں کیونکہ اکبر کے پیچھے فیروزہ بھی نمایاں ہوگئی تھی-

امی جان بیٹی اور اکبر کو ایک ساتھ دیکھ کر ٹھٹک گئیں- پہلا سوال یہی کیا "سلمٰی رانی کہاں ہے؟"

ماں کی ناگہانی آمد نے بیٹی کو ذرا بدحواس کردیا- اکبر نے سنبھالا دیا- "وہ ابھی ابھی بازار گئی ہیں- آتی ہی ہوں گی-"

انہوں نے گھور کر اکبر کو دیکھا- پھر کہا "میں نے تم سے نہیں پوچھا تھا تم جاسکتے ہو-"

وہ فیروزہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی احاطے کے اندر آئیں- بغلی دروازے کو بند کیا- پھر ہاتھ پکڑ کر کوٹھی کے اندر اسے لے آئیں- فیروزہ حواس قائم رکھنے کی کوشش کر رہی تھی اور محاسبے کے وقت اپنے بچاؤ کے لیے جوابات سوچ رہی تھی- اس کی امی ڈرائنگ روم میں آکر چاروں طرف نظریں دوڑا رہی تھیں- کچھ جاسوسی کا انداز تھا- وہ کچھ سمجھنا چاہتی تھیں- پھر بولیں "وہ کب آیا تھا؟"

"ابھی دس منٹ پہلے-"

"اور سلمٰی تجھے اپنے بھائی کے پاس اکیلی چھوڑ کر چلی گئی؟"

"زیادہ دور نہیں گئی ہیں- آتی ہی ہوں گی-"

"تو سچ نہیں بولے گی؟"

"امی! آپ خواہ مخواہ شبہ کر رہی ہیں- کیا آپ کو اپنی بیٹی پر بھروسہ نہیں ہے-"

"میں ماں ہوں- تجھے نو مہینے پیٹ میں رکھا ہے- تو میرے پیٹ سے پاؤں نکال کر

میرے ہی منہ پر لات مار رہی ہے-"

"آخر میں نے کیا کیا ہے؟"

وہ پھر ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی اور ایک سمت لے جاتی ہوئی بولیں- "ابھی بتاتی ہوں-"

اس کی امی عمر کا پچاسواں برس گزار رہی تھیں- دیسی خالص گھی اور دودھ مکھن ہضم کرتی آئی تھیں اس لیے ہاتھ پاؤں کی پہلوان تھیں- جوان بیٹی کو کبھی کھینچتی ہوئی کبھی رگیدتی ہوئی لے جارہی تھیں- پھر اس کی خواب گاہ میں آکر ٹھہر گئیں- وہاں کی بے ترتیبی بستر کی ابتری اور چادر کی شکنوں پر پڑا ہوا ہیروں کا نیکلس زبان بے زبانی سے کہہ رہا تھا کہ ابھی ابھی سکندر اعظم فتوحات کے جھنڈے گاڑتا ہوا گزرا ہے-

تاریخ بتاتی ہے کہ سکندر جہلم تک آیا تھا- تمام دنیا کو فتح کرنے کے عزم سے بے شمار ممالک کو تسخیر کرتا اور تابع بناتا رہا تھا- اس کے متعلق یہ متفقہ رائے قائم ہوگئی تھی کہ دنیا کی کوئی فوجی طاقت اس کا راستہ نہیں روک سکے گی- ایسی پسپائی کے دور میں جہلم ایک ایسا غیرت مند دریا تھا جس نے فاتح اعظم کو بھاری لشکر سمیت آگے بڑھنے سے روک دیا- چند آستین کے سانپوں نے اسے ایک رات وارا پور کے نشیبی علاقے سے دریا پار کرایا- اس نے پورس کو شکست دی لیکن حالات کے ریلے نے اسے پھر جہلم کے مغربی کنارے پر واپس پھینک دیا- دنیا کی کوئی بھی فوج کسی ملک یا شہر میں جاتی ہے تو پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے وہاں سے اناج اور ہوس کی بھوک مٹانے کے لیے جوان عورتیں حاصل کرتی ہیں- جہلم کے عوام نے اسی حکمت عملی سے اتنی بڑی فوج کو واپس جانے پر مجبور کیا کہ انہوں نے اناج کی قلت پیدا کردی- اپنی بہو بیٹیوں کو ان کے ہاتھ لگنے نہیں دیا- سپاہی بھوک اور بیماری سے حوصلہ ہار گئے تو کبھی نہ پسپا ہونے والی فوج اس زمین سے واپس چلی گئی-

دکھ یہ تھا کہ آج کے سکندر ہوس کا دریا پار کر جاتے ہیں اور انہیں روکنے کی احتیاطی تدابیر ناکام ہوجاتی ہیں- اس ناکامی کی تہہ میں کوئی لعنت جڑ پکڑ گئی ہے جو سمجھ میں آتے ہوئے بھی سمجھ میں نہیں آتی-

ماں نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر مارا- وہ لڑکھڑا کر سنگار میز کے پاس آکر گری- انہوں نے اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اسے آئینہ دکھاتے ہوئے کہا- "دیکھ! میں نے چہرے پر یہ بے حیا نشان دیکھ کر سمجھ لیا تھا کہ تو نے ہماری عزت خاک میں ملا دی ہے-"

وہ اسے دونوں ہاتھوں سے مارتی ہوئی بولیں- "بول! تو اتنی دیوانی کیوں ہوگئی تھی کہ باپ کی سفید داڑھی کا بھی خیال نہ کیا- تیرے غیرت مند بھائی کو معلوم ہوگا تو وہ تیری اور اپنی جان سے کھیل جائے گا-"

وہ غیرت مند بھائی جہلم پہنچ گیا تھا- کوٹھی سے ذرا دور اکبر ان کا منتظر تھا- اس نے ہاتھ کے اشارے سے گاڑی رکوائی- پھر کار کی کھڑکی کے پاس آکر سلمٰی سے بولا- "آپا! میں تم سے ملنے گیا تھا- وہاں صرف فیروزہ تھی' میں اس سے باتیں کرتے ہوئے گیٹ سے باہر

آرہا تھا تو جواد بھائی کی امی آ گئیں۔ انہوں نے غصے سے پوچھا سلمٰی کہاں ہے؟ میں نے کہا ابھی بازار گئی ہیں۔ بس یہ سن کر مجھ پر غصہ دکھانے لگیں۔ فیروزہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی کوٹھی کے اندر لے گئیں۔"

سلمٰی نے جواد سے کہا۔ "یہ تمہاری امی میرے بھائی کو دیکھ کر مرچیں کیوں چبانے لگتی ہیں۔"

وہ بولا۔ "گھر چلو انہیں کچھ غلط فہمی ہوگئی ہے۔"

"اب آپ گھر جاکر یہ نہیں بتائیں گے کہ منگلا گئے تھے۔ میرے بھائی نے کہا ہے میں ابھی بازار میں ہوں۔ اس لیے آپ بھی یہی کہیں گے ورنہ امی کی غلط فہمی اور بڑھ جائے گی۔"

"میں امی سے کہہ دوں گا کہ میں تمہیں زبردستی منگلا لے گیا تھا۔"

"پھر امی آپ کو بے غیرت کہیں گی کہ جوان لڑکی کو گھر میں تنہا چھوڑ کر بیوی کے ساتھ تفریح کے لیے گئے تھے۔ آپ کیوں بات بڑھانا چاہتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا جھوٹ بول کر ماں کو مطمئن کر دیں۔"

جواد نے پوچھا۔ "یعنی یہ کہنا ہوگا کہ میں ڈیوٹی پر نہیں گیا تھا۔ یہیں شہر میں تھا۔"

وہ بولی۔ "ہاں ہم یہیں صبح سے اپنی کوٹھی میں فیروزہ کے ساتھ تھے۔"

"لیکن ابا دوپہر کو گھر آتے ہیں اور ہم گھر میں نہیں تھے۔"

اکبر نے بے اختیار کہا۔ "فیروزہ نے ابا سے بھی یہی کہا تھا کہ آپا تھوڑی دیر کے لیے بازار گئی ہیں۔"

سلمٰی نے کہا "ٹھیک ہم کہہ دیں گے ایک بجے دوپہر کو بازار گئے تھے اور دوسری بار اب بازار سے آرہے ہیں۔ باقی تمام دن فیروزہ کے ساتھ رہے۔"

جواد نے کہا "امی کی ناراضگی کا خیال نہ ہوتا تو میں اتنے پیچیدہ جھوٹ نہ بولتا۔"

"رہنے بھی دیں۔ آپ ایسے سچے مومن بھی نہیں ہیں۔ جھوٹ اور رشوت کی کمائی سے بنک بیلنس بڑھا رہے ہیں اور میرے سامنے ہی جھوٹے نہ ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔"

اس طنز کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے خاموشی سے کار اسٹارٹ کی۔ پھر آگے بڑھاتے بڑھاتے رک گیا۔ اس نے چونک کر اکبر کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔ "ابھی تم نے کیا کہا تھا فیروزہ نے دوپہر کو ابا جان سے بھی یہی بہانہ کیا تھا کہ ہم بازار گئے ہیں۔"

اکبر کو پہلے ہی احساس ہوگیا تھا کہ ایسا کہہ کر وہ خود چور بن گیا ہے۔ جواد نے پوچھا۔ "اس کا مطلب ہے اکبر! کہ تم دوپہر سے بلکہ صبح ہمارے جانے کے بعد سے فیروزہ کے ساتھ ہو؟"

وہ ایک جھٹکے سے کار کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے بولا۔ "یہ میرے گھر میں کیا

بدمعاشی ہو رہی ہے۔ اکبر اپنی پوزیشن کلیئر کرو ورنہ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

سلمٰی اپنی طرف کا دروازہ جلدی سے کھول کر بھائی کے سامنے ڈھال بنتی ہوئی بولی۔ ارے رے کیا آپ کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ گھر کی عزت باہر اچھال رہے ہیں۔ راستے میں تماشا بننا چاہتے ہیں۔ چلیں گاڑی میں بیٹھیں اور آرام سے باتیں کریں۔"

اکبر نے کہا "جواد بھائی! کیا ہوگیا ہے۔ ہم بھی بڑک مار سکتے ہیں مگر جو بات آرام سے ہوسکتی ہے اسے آرام سے ہی کریں۔"

سلمٰی نے اپنے میاں کو پکڑ کر پھر کار میں بٹھایا پھر کہا "واہ کیا عقلمندی دکھائی ہے۔ بہن کے معاملے میں اچھل کر سڑک پر آگئے۔ تمہیں تو انجینئر نہیں سلطان راہی بننا چاہیے۔"

وہ غصہ دکھاتے ہوئے بولا۔ "بکواس نہ کرو۔ مجھے صاف صاف بتاؤ اصل بات کیا ہے؟"

"اصل بات یہی ہے کہ میں ابھی پندرہ منٹ پہلے آپ کے گھر گیا تھا مجھے معلوم ہوا کہ آپا نہیں ہیں تو الٹے پاؤں لوٹ گیا۔ فیروزہ تشویش ظاہر کر رہی تھی کہ بھابی ابھی تک نہیں آئی ہیں اور وہ دوپہر کو ابا سے بھی جھوٹ کہہ چکی ہے کہ بھابی بازار گئی ہیں۔"

سلمٰی نے کہا "سن لیا آپ نے وہ بے چاری ہم دونوں کو بزرگوں سے ڈانٹ کھانے سے بچا رہی ہے انہیں یہ نہیں بتا رہی ہے کہ ہم اسے تنہا چھوڑ گئے ہیں۔ میرا بھائی پندرہ منٹ پہلے گیا تھا۔ صبح سے تمہاری بہن کے پاس نہیں تھا۔ میرے بھائی پر شک کرنے سے بہتر ہے شرم سے ڈوب مریں۔ ابھی گھر جاکر صفائی پیش کرنے کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں آپ سے بات کرنا گوارا نہ کرتی۔ ابھی اسی وقت اسی گاڑی میں میکے چلی جاتی۔"

وہ شرمندہ سا ہوا۔ نرم پڑ کر بولا۔ "اکبر مجھ سے چھوٹا ہے۔ اسے غصہ دکھایا ہے تو ناراض کیوں ہوتی ہو۔ میں اس کے کان پکڑ کر اس کی پٹائی بھی کرسکتا ہوں۔"

اکبر نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "جواد بھائی! میں آپ کا غلام ہوں آپ جوتیاں بھی مار سکتے ہیں۔ آپا کے ساتھ اچھے موڈ میں جائیں اور معاملہ کو نمٹائیں۔"

اس نے پھر کار اسٹارٹ کی۔ امی نے گیٹ کھولا۔ پھر یہ کہہ کر اندر چلی گئیں کہ میرے کمرے میں آؤ میں تنہائی میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

سلمٰی نے کہا۔ "آپ کی امی سیاست دکھا رہی ہیں۔ کیا میری موجودگی میں آپ سے باتیں نہیں کرسکتی تھیں، کیا پتا کیا الٹی سیدھی پٹی پڑھانے والی ہیں۔"

"میں کوئی نادان بچہ نہیں ہوں۔ وہ جو کہیں گی اس کا معقول جواب دوں گا۔"

"ایک بات یاد رکھیں۔ چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہوجائے آپ یہ اقرار نہ کریں کہ فیروزہ کو یہاں تنہا چھوڑ گئے تھے۔ بس اسی بات پر قائم رہیں کہ ہم تمام دن فیروزہ کے ساتھ رہے تھے۔"

وہ ماں کی طرف گیا۔ سلمیٰ اپنی نند کی خیریت معلوم کرنے گئی۔ ماں نے بیٹے کو کمرے میں بلانے کے بعد دروازے کو اندر سے مقفل کرکے چابی اپنی مٹھی میں رکھ لی۔ جواد نے پوچھا۔ ”امی! یہ کیا؟ آپ مجھے قید کررہی ہیں؟“

”ہاں تمہاری سلامتی کے لیے یہ ضروری ہے۔ میں جو کہنے والی ہوں۔ اسے سن کر لازمی نہیں ہے کہ تمہیں غیرت آئے۔ کیونکہ جورو کا غلام کبھی غیرتمند نہیں ہوتا۔“

”ابھی تمہیں معلوم ہوگا کہ میں اس کے پیچھے پڑگئی ہوں یا وہ ہماری عزت کا جنازہ نکالنے کی قسم کھاچکی ہے اور تیری جی حضوری سے وہ کامیاب بھی ہوگئی ہے۔“

میں سمجھ رہا ہوں آپ کیا کہنا چاہتی ہیں لیکن آپ جو سمجھ رہی ہیں وہ بالکل غلط ہے۔“

”اگر تم اور سلمیٰ میری بیٹی کو تنہا چھوڑ کر نہ جاتے اور آج اس کے...“

وہ بات کاٹ کر بولا۔ ”ہم اسے چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔ تمام دن اس کے ساتھ تھے۔“

”کیا سچ کہہ رہے ہو یہاں تمام دن تھے؟“

”جی ہاں۔ صرف دن کے ایک بجے اور ابھی آدھ گھنٹہ پہلے ہم تھوڑی دیر کے لیے باہر گئے تھے۔“

”ہاں فیروزہ کہہ رہی تھی کہ تم دونوں نے اس کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا تھا لیکن مجھے یقین نہیں آیا۔“

جب ہم تینوں کہتے ہیں کہ کھانا کھایا تھا تو پھر بے یقینی کیوں ہے؟“

”تم یہ بتاکر یقین دلا دو کہ آج ہمارے ہاں کون سی دال اور کون سا سالن پکایا گیا ہے۔“

اس نے ایک دم سے لاجواب ہوکر ماں کو دیکھا۔ وہ بولیں۔ ”میرا بیٹا دوپہر کو کھایا شام کو بھول گیا۔ بہو بیگم بھی بیچاری بھول گئی ہوگی۔“

وہ شکست خوردہ انداز میں بستر پر بیٹھ گیا۔ سلمیٰ نے خوب اچھی طرح تیار کرکے امتحان میں بھیجا تھا لیکن وہ پہلے ہی سوال میں فیل ہو کر بھانڈا پھوڑ چکا تھا کہ وہ دونوں فیروزہ کو تنہا چھوڑ کر گئے تھے۔

وہ بولیں۔ ”بہتر ہے تم خود ہی آج صبح سے شام تک کی بے حیا سازش کا فسانہ سنادو۔“

”امی! آپ بے حیائی کا لفظ استعمال نہ کریں۔ میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں۔“

”اتنے نہیں ہو تو کتنے ہو؟ کچھ زیادہ ہو؟ یا کچھ کم؟ مگر ہو۔ تمہاری بیوی نے کہا جوان بہن کو سالے کے پاس چھوڑ کر چلو اور تم چلے گئے۔“

وہ گرج کر بولا۔ ”یہ جھوٹ ہے۔“

”گرجتے وقت یہ بھی سوچ لیا کرو کہ گھر کی عزت باہر اچھال رہے ہو۔ ذرا ہولے ہو کر بولو۔ صبح بیوی کے ساتھ جاتے وقت تمہارے ضمیر نے تمہیں بہن کی یاد دلائی تھی؟“

اسے یاد آیا کہ اس نے سلمیٰ سے کہا تھا کہ فیروزہ گھر میں اکیلی رہ جائے گی اور سلمیٰ نے کہا تھا وہ ننھی سی بچی نہیں ہے پھر اپنے گھر کی چار دیواری میں ہے کیا اسے شیر اٹھا کر لے جائے گا؟“

اور وہ قائل ہوکر اس کے ساتھ چلا گیا تھا۔ وہ سر جھکا کر بولا۔ ”امی مجھ سے غلطی ہوگئی مجھے فیروزہ کو تنہا چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا۔“

”بیٹے! میں تمہیں پیدائش کے وقت سے جانتی ہوں۔ تم بزدل ہو کبھی غصہ آئے تو خوب گرجتے ہو مگر برسنے کا وقت آئے تو پیچھے ہٹ جاتے ہو۔“

”امی آپ میری انسلٹ کررہی ہیں۔“

”جو ہوا اسے تسلیم کرو۔ میں نے فیروزہ سے سب کچھ اگلوا لیا ہے۔ اس نے اعتراف کیا ہے کہ چودھری اکبر ہماری عزت مٹی میں ملا گیا ہے۔“

”نہیں۔“ وہ گرجتا ہوا اچھل کر کھڑا ہوا۔ ماں نے ایک الٹا ہاتھ منہ پر رسید کیا تو وہ بستر پر گر پڑا۔ پھر اٹھتے ہوئے بولا ”امی مجھے جانے دیں۔ میں منہ کالا کرنے والی بہن کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

ماں نے ایک چھڑی اٹھا کر اسے مارتے ہوئے کہا ”میں نے اسی لیے چابی اپنی مٹھی میں رکھی ہے کہ تو دروازہ نہ کھول سکے اور بہن تک نہ پہنچ سکے۔ تجھے چودھری اکبر کو قتل کرنے کا حوصلہ نہیں ہوگا۔ وہ تجھ سے تگڑا ہے۔ افسر سے مار کھا کر آنے والا ملازم گھر کی عورت پر غصہ اتارتا ہے۔“

پھر وہ چھڑی کو ایک طرف پھینک کر بولیں۔ ”جب تو تیرہ برس کا ہوا تو میں نے چھڑی سے مارنا چھوڑ دیا تھا۔ پندرہ برس بعد اس لیے تجھ پر چھڑی اٹھائی ہے کہ آج بھی تو غلطیاں کرنے والا نادان بچہ ہے۔ کیا اتنی سے بات نہیں سمجھ سکتا کہ بہن کو گالیاں دینے یا مارنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔“

”تو پھر کیا ہوگا؟ میں یہ بے عزتی کیسے برداشت کروں گا؟“

”عقل سے کام لوگے تو یہ بے عزتی نہیں رہے گی۔“

”آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟“

”فیروزہ اس کے پیچھے پاگل ہو رہی ہے۔ میں نے اس کی پٹائی کی اسے نرمی سے سمجھایا لیکن وہ قسم کھاتی ہے کہ چودھری اکبر سے شادی نہ ہوئی تو اپنی جان دیدے گی۔“

”بکواس کرتی ہے میں ایک منٹ میں اسے سیدھا کردوں گا۔“

”وہ ہم سب کو سیدھا کردے گی ہم اسے بچپن سے دیکھتے سمجھتے آرہے ہیں۔ وہ بلا کی ضدی اور ارادے کی پکی ہے تم جبر کروگے تو وہ ٹوٹ جائے گی مگر جھکے گی نہیں۔“

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ ایسے وقت اس کا اوندھا دماغ بیوی کو خوش کرنے کی بات سوچ رہا تھا۔ وہ فیروزہ اور اکبر کے رشتے پر راضی ہوکر بیوی کو بارہ لاکھ کی کار جیتنے کا موقع فراہم کرسکتا تھا۔

ماں نے کہا۔ "میں جو بنیادی بات سوچ رہی ہوں وہ یہ ہے کہ تمہارے ابا دل کے مریض ہیں۔ یہ باتیں ان کے کانوں تک نہیں پہنچنی چاہئیں۔ تم سلمیٰ سے کہو اس کے میکے والے اکبر کے لیے فیروزہ کا رشتہ مانگنے آئیں۔ ہم قبول کرلیں گے۔"

"لیکن ابا جان وٹے سٹے کو برا مانتے ہیں۔"

"میں بھی اسے اچھا نہیں سمجھتی ہوں۔ کسی کے گھر سے بیٹی لے کر اپنی بیٹی ان کے گھر دینے سے بڑے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن جو شرمناک مسئلہ فیروزہ نے پیدا کردیا ہے اس کے بعد ہمیں آنکھیں بند کرکے اس کا نکاح پڑھا دینا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے میں سلمیٰ سے کہوں گا۔ اس کے میکے والے رشتہ مانگنے آئیں گے۔ آپ دروازہ کھولیں۔"

وہ چابی سے لاک کھولتے ہوئے بولیں۔ "میں فیروزہ کے پاس جارہی ہوں تم بہن کو ایک انگلی بھی نہ دکھانا۔"

"ٹھیک ہے۔"

"نفرت سے گالی بھی نہ دینا۔"

"نہیں دوں گا۔"

وہ اپنے بیڈ روم میں سلمیٰ کے پاس آیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی بولی۔ "یہ آپ کی امی کیا کرتی پھر رہی ہیں؟ میں ابھی فیروزہ سے ملنے گئی تھی۔ پتا چلا بڑی بی دروازے کو لاک کرکے بیٹی کو کمرے میں قید کرکے گئی ہیں۔"

"امی کو معلوم ہوتا کہ گھر کے چراغ سے آگ لگنے والی ہے تو وہ بہت پہلے فیروزہ کو تم سے بچا کر رکھتیں۔"

"اچھا تو جناب کی امی نے کچھ گھول کر پلا دیا ہے۔"

"امی کی باتوں سے ایک عقل آئی ہے کہ ہم لڑکی والے ہیں ہمیں صرف ضرورت کے مطابق بولنا چاہیے لہٰذا میں بات نہیں بڑھاؤں گا۔ آج صبح تم نے کہا تھا کہ فیروزہ کو اپنی بھابی بنانا چاہتی ہو۔"

"ہاں اب بھی یہی کہتی ہوں۔"

"تو پھر اکبر سے کہہ دو۔ اپنے بزرگوں کو ہمارے بزرگوں کے پاس بھیج دے۔"

وہ خوش ہوکر بولی۔ "کیا سچ کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں میں نے تمہاری خوشی کی خاطر امی کو راضی کرلیا ہے تم کار جیت لو۔"

وہ گردن میں باہیں ڈال کر بولی۔ "اوہ جواد! آپ سچ مچ ایک فنٹاسٹک شوہر ہیں۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "اکبر کو فون کرو۔ وہ آکر اپنی کار لے جائے اور شادی کے سلسلے میں تم سے باتیں بھی کرلے۔"

"ٹھیک ہے۔ وہ آئے گا تو میں اس کے ساتھ باہر جاؤں گی اور اس سے ساری باتیں کرکے آجاؤں گی۔"

"اوکے۔ میں غسل کرنے جارہا ہوں۔"

وہ غسل خانے میں گیا۔ کوئی پون گھنٹے بعد اکبر آیا۔ سلمیٰ اس کے ساتھ کار میں بیٹھ کر بولی۔ "لمبی ڈرائیو کرو۔ لمبی باتیں ہیں۔ تم بڑے خوش نصیب ہو۔"

وہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔ "فون پر تم نے کہا کہ بڑھیا اپنی بیٹی کا رشتہ دینے کے لیے راضی ہے تو مجھے یقین نہیں آیا۔ کم بخت شام کو مجھے گھور کر دیکھ رہی تھی۔"

وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "بھئی بیٹی دینا چاہتی تھی اس لیے گھور کر جائزہ لے رہی تھی۔"

"ویسے آپا! سنجیدگی سے سوچنے کی بات ہے۔ شام کو حالات ہمارے موافق نہیں تھے پھر اچانک سازگار ہوگئے۔"

"فیروزہ بہت ہی خودسر اور ضدی لڑکی ہے۔ میں نے جواد سے اگلوایا ہے وہ ماں کے سامنے قسم کھا رہی تھی کہ چودھری اکبر سے شادی نہ ہوئی تو اپنی جان دیدے گی۔"

اکبر نے مسکراتے ہوئے دل میں اعتراف کیا۔ واقعی فیروزہ جان دینے کی حد تک اسے چاہتی ہے۔ اسی نے اپنی ضد سے گھر والوں کے مزاج بدل دیے ہیں۔ اور فیصلہ اپنے یار کے حق میں کرایا ہے۔

وہ اس بات پر مسکرا رہا تھا لیکن زیادہ خوش نہیں ہو رہا تھا۔ خوشی اس وقت ہوتی ہے جب کوئی آسمان کا تارا ہو اور اسے توڑ کر لانے میں کامیابی ہو۔ وہ پہلے سے جانتا تھا کہ تارا خود ہی ٹوٹ کر اس کی گود میں آئے گا۔ جو اس کی طرف مائل ہوتی تھی اسے حاصل ہو جاتی تھی۔ آج تک کسی کے لیے جوئے شیر لانے کی فکر لاحق نہیں ہوئی قدرت نے اسے زبردست مقناطیس بنایا تھا۔

جب قدرت کی طرف سے کچھ زیادہ ہی خوبروئی اور پرکشش شخصیت عطا ہوجاتی ہے تو وہ شخص مغرور لازمی ہوتا ہے۔ وہ فاتح کی شان سے آتا ہے۔ آنکھیں چار کرتا ہے۔ حواس پر ہلہ بولتا ہے۔ شب خون مارتا ہے۔ فتح کرتا ہے۔ پھر اگلی فتوحات کے لیے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنا فاتح کی شان نہیں ہوتی لیکن اس بار چودھری اکبر پلٹ پلٹ کر فیروزہ کو دیکھ رہا تھا۔ پہلی بار ایک ایسی حسینہ سے دو چار ہوا تھا جو بھڑک کر بجھ جانے والی ہوس کی آگ ہی نہیں تھی ایک بھرپور شاعری بھی تھی۔ شاعری کی کتاب پہلے صفحے سے آخری صفحے تک پڑھ ڈالو وہ ختم ہوجاتی ہے لیکن اس کے معنی و مفہوم ختم نہیں ہوتے ان کی شعریت بعد میں بھی دل کی تہ میں اترتی رہتی ہے۔ ایک معنی خیز شعر کی سرگوشی کبھی فرصت کے وقت گدگداتی ہے اسی طرح فیروزہ مفتوح ہونے کے بعد بھی اس کے اندر شور

مچا رہی تھی۔

اس نے سلمیٰ سے کہا۔ "میں اس سے پھر ملنا چاہتا ہوں۔"

"فی الحال یہ ممکن نہیں ہے یوں بھی اب چھپ کر ملنا کیا ضروری ہے؟ کل ہی شادی کا پیغام بھیج دو۔"

"آپا! جب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ میں قبول کیا جا رہا ہوں تو پھر پیغام بھیجنے میں جلدی نہیں کرنا چاہیے۔ یہ تاثر نہیں دینا چاہیے کہ ان کی لڑکی ہمارے لیے بہت اہم ہے بلکہ ایسے حالات پیدا کرنا چاہئیں کہ میں ان کے لیے بے حد ضروری ہوتا رہوں۔"

"ہاں تمہارا یہ نظریہ درست ہے لڑکی والوں کو ترسا ترسا کر رشتہ قبول کرنا چاہیے لیکن اس میں میرا نقصان ہے؟"

"تمہارا کیا نقصان ہے؟"

"تم نے کہا تھا شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی مجھے یہ کار دوگے۔ اب اس معاملہ میں دیر ہوگی تو میں اس سے محروم رہوں گی تمہیں چاہیے کہ شادی کی تاریخ مقرر ہونے کی شرط نہ رکھو۔ جیسے ہی تمہاری نئی گاڑی آئے مجھے یہ گاڑی دے دو۔"

"نہیں آپا! جو بات طے ہوگئی ہے وہ وہی رہے گی۔ ہاں تمہارے لیے یہ ہو سکتا ہے جب بھی کار کی ضرورت ہوا کرے دو چار روز کے لیے لے جایا کرو۔"

"مجھے ہمیشہ مانگنا اچھا نہیں لگتا۔"

"تم یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ یہ گاڑی تمہاری ہے۔ میرے پاس رکھی ہوئی ہے۔ اپنی ضرورت کے وقت لے جاتی ہو' پھر میری کوٹھی میں چھوڑ جاتی ہو۔ بہن بھائی سے مانگتی نہیں ہے۔ اپنا حق لیتی رہتی ہے اب اس موضوع کو ختم کرو میرے مطلب کی بات کرو۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "تم اول نمبر کے مطلبی ہو بولو کیا چاہتے ہو؟"

"ابھی کہہ چکا ہوں' اپنی نند سے ملاقات کراؤ۔"

"تم تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے کو کہتے ہو ابھی حالات بگڑتے بگڑتے بن رہے ہیں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے تم دونوں کی ملاقات والی بات کھل گئی ہے۔ بڑی بی نے فیروزہ کو تالے چابی میں رکھا ہے ورنہ میں اس سے حقیقت معلوم کر لیتی۔"

"وہ بلبل کو کب تک قید میں رکھے گی کوٹھی کی چار دیواری میں آزاد چھوڑنا ہی ہوگا۔"

"وہ کوٹھی کے اندر آزاد رہے گی تو تمہارا بھلا نہیں ہوگا۔ تم مجھ سے ملنے آؤ گے تو فیروزہ کو پردہ کرایا جائے گا۔"

"پردے میں سو چھید ہو سکتے ہیں۔ بڑی آسانی سے یوں ملاقات ہو سکتی ہے۔ اس گھر کے کسی فرشتے کو خبر نہیں ہوگی۔"

"کیا تم نے کوئی تدبیر سوچی ہے؟"

"ہاں۔ تمہارے بیڈ روم کا دروازہ پچھلی گلی میں کھلتا ہے۔ میں رات کو تمہارے کمرے سے ہو کر فیروزہ کے کمرے میں پہنچ سکتا ہوں اور اتنی ہی رازداری سے واپس آسکتا ہوں۔"

"ہوش میں تو ہو۔ کیوں مجھے پھنسانے والی تدبیر سوچتے ہو۔ تمہیں پتا نہیں ہے جواد کچی نیند سوتے ہیں ذرا سی آہٹ پر آنکھ کھول دیتے ہیں۔"

"آپا! تم کسی پنڈ میں نہیں رہتی ہو۔ یہاں کئی قسم کی خواب آور دوائیں مل جاتی ہیں۔ میں ابھی تمہیں ایک شیشی خرید کر دیتا ہوں۔ چونکہ جواد بھائی کوئی نشہ نہیں کرتے ہیں۔ اس لیے شیشی کی ایک ہی گولی انہیں آرام سے صبح تک سلائے رکھے گی۔"

"مجھ سے اتنے بڑے بڑے کام کراتے ہو میں کیوں کروں؟ تم میرے لیے کیا کرتے ہو؟ ایک گاڑی دینے کا وعدہ کر کے انتظار میں لٹکا رہے ہو۔"

"میں کہہ چکا ہوں گاڑی تمہاری ہے' وعدہ کے مطابق تمہیں مل جائے گی۔ ابھی اس کی بات نہ کرو۔ کل ملاقات کی خوشخبری سناؤ۔ میں تمہیں دس ہزار کی شاپنگ کراؤں گا۔"

وصال یار کے لیے دس ہزار یا زیورات کا سیٹ کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ وہ ایک رات میں مجرا کرنے والیوں کو اس سے زیادہ دے دیا کرتا تھا۔ البتہ بارہ لاکھ والی کار بہت زیادہ قیمتی تھی۔ رشوت کے حوالے سے سلمیٰ کا نامعقول مطالبہ تھا۔ اس لیے وہ کار کے معاملے میں اسے ٹال رہا تھا۔

فی الحال وہ شاپنگ کی رشوت سے خوش ہوگئی۔ رات کو واپس آئی تو دیر ہو چکی تھی۔ گھر کے افراد کھاپی کر اپنے بستروں پر چلے گئے تھے۔ اس رات فیروزہ سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔ پتا چلا امی نے اسے اپنے پاس سلایا ہے۔

وہ اس حرکت سے جل بھن گئی۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ ساس کا بھروسا اس پر سے اٹھ گیا ہے۔ وہ اپنی بیٹی کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ دوسرے دن فیروزہ کبھی لاؤنج میں کبھی کچن میں ماں کے ساتھ رہی لیکن ایک بار اپنی ماں کی نظریں بچا کر بھابی کو مسکرا کر دیکھا اور اس انداز سے جتا دیا کہ وہ ایسے حالات میں بھی اپنی بھابی کی سہیلی ہے۔"

دن کے گیارہ بجے ماں غسل خانے میں گئی تو اس نے سلمیٰ کو ماں کے بیڈ روم کے قریب بلایا پھر پوچھا۔ "بھابی! میں کیا کروں؟ امی مجھے سائے کی طرح لیے پھر رہی ہیں۔"

"کب تک ایسے پھریں گی تم اس بات کی ضد کرو کہ امی کے کمرے میں نیند نہیں آتی ہے۔"

"کل رات میں نے یہی کہا۔ کبھی ٹہلتی رہی کبھی کرسی پر بیٹھتی رہی امی نے کئی بار نیند سے آنکھیں کھول کر سمجھایا گالیاں بھی دیں کہ میں سو جاؤں لیکن میں یہی جتاتی رہی کہ وہاں نیند نہیں آرہی ہے۔"

"شاباش تم بہت سمجھ دار ہو۔"

"مگر یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ میں آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں مجھے اکبر سے بہت کچھ کہنا ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ کسی طرح پھر سے اپنے کمرے میں رہنا اور سونا شروع کرو اگر ہماری ملاقات پر پابندی ہوگی تو میں تم سے باتیں کرنے کی کوئی دوسری صورت نکالوں گی۔"

"کیا صورت ہوگی بھابی؟ فون پر امی کا پہرا رہے گا۔"

"میں اکبر سے کہوں گی وہ تمہارے لیے واکی ٹاکی لے آئے گا۔ تم اسے چھپا کر رکھوگی۔ اس کے ذریعے ہم رازداری سے باتیں..."

وہ بات پوری نہ کرسکی۔ غسل خانے سے ماں نے پکارا۔ "فیروزہ! کہاں ہو؟ ادھر آؤ۔"

"آئی امی!" وہ فوراً ہی بھابی کو چھوڑ کر دوڑتی ہوئی غسل خانے کی طرف چلی گئی۔ وہ سچ مچ پچھلی رات ماں کے کمرے میں جاگتی رہی تھی۔ اسے یہ خواہش جگاتی رہی تھی کہ جس کمرے میں اکبر کے ساتھ دن گزارا تھا' وہیں رات گزارے۔ اس خالی بستر پر اپنے پورے وجود کو بچھا کر محبوب کی یادوں سے ملاقات کرتی رہے۔ یار نہ رہے خیال یار تو سلامت رہے۔

ماں نے غسل خانے سے نکل کر بیٹی کو دیکھا۔ وہ دیوار سے لگی کھڑی تھی اور اونگھ رہی تھی۔ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی۔ ایسی ضدی تھی کہ دن کے وقت بھی ماں کے کمرے میں نہیں سونا چاہتی تھی۔

وہ غصہ سے بولیں۔ پتا نہیں کون سی شیطانی گھڑی تھی جب یہ ضدی اولاد پیدا ہوئی تھی۔ رات سے کہہ رہی ہوں سوجا۔ تھوڑی دیر کے لیے مرجا۔ کم بخت مرتی بھی نہیں ہے۔"

"فکر نہ کریں امی! میں اسی طرح جاگتے جاگتے مرجاؤں گی۔"

انہوں نے الماری کھولتے ہوئے کہا "میرے کمرے میں میرے بستر پر تجھے کانٹے چبھتے ہیں۔"

وہ الماری کی دراز سے ایک چابی نکال کر فیروزہ کے منہ پر پھینکتی ہوئی بولیں۔ "جا اپنی میت اپنے کمرے میں لے جا مگر خبردار! بھابی کے پاس زیادہ گھسے گی تو پھر چابی چھین لوں گی۔ تجھے اپنے ہی کمرے میں بند رکھوں گی۔"

وہ فرش پر سے چابی اٹھا کر کمرے سے باہر آگئی۔ ماں کی ایک مجبوری تھی۔ بیٹی کو ہر رات اپنے کمرے میں سلا نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ بیٹی کے ابا وہاں سویا کرتے تھے۔ اس رات انہوں نے خاوند سے کہا تھا۔ "آپ ایک رات مہمان خانے میں سو جائیں۔ آج فیروزہ میرے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔"

چونکہ ایک رات کی بات تھی چودھری عنایت حسین نے ماں کے لیے بیٹی کا لاڈ پیار سمجھ کر وہ رات دوسرے کمرے میں گزاری۔ دوسری رات کوئی بہانہ نہیں ہوسکتا تھا اور وہ خاوند سے کہہ نہیں سکتی تھیں کہ آئندہ بیٹی کے کمرے میں رات گزارا کریں گی۔ اس بات پر خاوند ضرور پوچھتا کہ بیٹی کی پہریدار کیوں بن گئی ہو؟

اس سوال کے کئی شرمناک جواب ہوتے جسے وہ شریف اور غیرت مند باپ برداشت نہ کرتا۔ اسی لیے ماں نے شکست کھا کر بیٹی کو اس کے کمرے کی چابی دے دی تھی۔

وہ چابی لے کر کوریڈور میں آئی۔ سامنے ڈرائنگ روم کا دروازہ تھا۔ پھر وہ دوسری سمت مڑنے والی راہداری میں پہلا کمرا اس کا تھا اور آخری کمرا بھابی کا۔ وہ بھابی کے دروازے پر آکر اسے کھول کر ایک چٹکی میں چابی کو جھلاتی ہوئی بولی۔ "بھابی! یہ رہی چابی۔ اب میں اپنے کمرے میں رہا کروں گی۔"

سلمٰی نے قریب آکر پوچھا۔ "امی! اتنی جلدی راضی کیسے ہوگئیں؟"

"جیسے بھی ہوگئیں۔ آپ کچھ روز مجھ سے دور رہیں اور شام تک میرے لیے واکی ٹاکی لے آئیں۔ میں سونے جارہی ہوں۔"

وہ پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔ راہداری کے موڑ پر اس کی امی کھڑی ہوئی تھیں۔ بیٹی اور بہو کو گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ بہو نے بے پروائی سے اونہہ کہہ کر اپنے کمرے کا دروازہ بند کرلیا۔ فیروزہ بھی اپنا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

ان لمحات میں ماں کے دل کی گہرائیوں سے بددعا نکلی میرے معبود! تو قادر مطلق ہے۔ میری بچی کو بہو کے شر سے بچا۔ ایسی بہو کو غارت کردے جو گھر کو آگ لگاتی ہے اگر تو اسے غارت نہ کرے سزا نہ دے تو عقل اور شرافت ہی دیدے۔

ساس نے بہو کے حق میں بددعا بھی کی اور دعا بھی مانگی لیکن جس طرح ایک چھت کے نیچے ساس اور بہو خوش نہیں رہتیں اسی طرح بیک وقت دعا اور بددعا قبول نہیں ہوتی اگر دعا قبول ہو بہو کو عقل آئے تو ساس اور بہو ایک ساتھ ہنسیں گی جبکہ ایک چھت کے نیچے ایسے معجزے نہیں ہوتے۔

شام کے وقت سلمٰی نے ساس اور سسر کو کمرے میں باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ پھر تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی وہاں سے ایک چھوٹا پیکٹ اٹھایا۔ پھر فیروزہ کے پاس آکر بولی۔

"اس پیکٹ میں واکی ٹاکی ہے۔ میں جارہی ہوں۔ دروازہ اندر سے بند کرلو۔ میں ابھی اپنے کمرے سے بات کروں گی۔"

وہ جتنی تیزی سے آئی تھی اتنی ہی تیزی سے ہدایات دے کر چلی گئی۔ فیروزہ نے دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ پیکٹ کھول کر واکی ٹاکی کو نکال کر دیکھا۔ ایک منٹ بعد ہی اشارہ موصول ہوا۔ اس نے ایریل کو باہر کھینچ کر ایک بٹن کو دبایا پھر اسے کان سے لگا کر کہا

"ہیلو میں بول رہی ہوں۔"

سلمٰی کی آواز آئی "اور میں ہوں تمہاری سہیلی۔ موجد حضرات کا جس قدر شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ انہوں نے ایسی چیزیں ایجاد کرکے عشق کو آسان بنادیا ہے۔ ہمارے بزرگ لاکھ پہرے بٹھاتے رہیں۔ محبوب سے کھل کر گفتگو ہوتی رہے گی۔"

"میری پیاری بھابی! کیا اکبر سے بھی گفتگو ہوسکتی ہے؟"

"ہاں اس کے پاس بھی ایک واکی ٹاکی ہے۔ وہ اس وقت ہماری کوٹھی کے پیچھے احاطے کے باہر ہے۔ گھڑی دیکھو چار بج رہے ہیں۔ ٹھیک دس منٹ بعد وہ تم سے رابطہ کرے گا۔"

"میں آپ سے کب رابطہ کروں؟"

"تم کبھی مخاطب نہ کرنا۔ تمہارے بھائی جان کو معلوم ہوجائے گا کہ ہم دونوں کے پاس یہ خفیہ ذریعہ ہے۔ میں خود ہی موقع دیکھ کر تم سے بات کروں گی۔ اچھا خدا حافظ۔"

اس نے رابطہ ختم کردیا۔ فیروزہ نے واکی ٹاکی کو آف کیا پھر اسے دونوں ہاتھوں سے تھام کر اپنے چہرے کے سامنے لاکر یوں دیکھنے لگی جیسے چودھری اکبر کو دیکھ رہی ہو۔ وہ دل و دماغ کو تسخیر کرنے والا ابھی اپنی آواز کا جادو جگانے والا تھا۔ دس منٹ میں ابھی تین ہی منٹ گزرے تھے باقی سات منٹ پہاڑ لگ رہے تھے۔

وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی کہ جب تک اس سے سلسلہ کلام جاری رہے امی پر غفلت طاری رہے انہیں بیٹی کا خیال نہ آئے اور دروازے پر کوئی دستک نہ دے۔

دعا مانگتے مانگتے دس منٹ گزر گئے وہ بے چینی سے گھڑی کو اور کبھی واکی ٹاکی کو دیکھنے لگی۔ اس پر محبوب کا چہرہ جھلک رہا تھا مگر وہ خاموش تھا وہ اسے چوم کر بولی "اے چپ کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟ کچھ تو بولو پیار گونگا نہیں ہوتا۔"

اس نے جیسے سن لیا اشارہ موصول ہونے لگا اس نے پھر ایریل کو باہر کھینچا بٹن کو دبا دیا۔ پھر اسے کان سے لگا کر بولی "ہیلو میں ہوں۔"

اس کی آواز کان کے راستے دل میں گونجنے لگی "جان من! اُدھر تم ہو اِدھر میں ہوں بیچ میں ایسی دیواریں ہیں کہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے یہی کیا کم ہے کہ تمہاری آواز سن رہا ہوں اور اپنی سنا رہا ہوں۔"

وہ ذرا چپ ہوا اس نے کہا "بولتے رہو پتا نہیں چلتا تم بولتے ہو یا منتر پڑھتے ہو میرے دماغ پر میری دنیا پر ایسی دھند چھا جاتی ہے کہ نہ کوئی دوسرا دکھائی دیتا ہے' نہ سنائی دیتا ہے۔"

"میں دکھائی بھی دینا چاہتا ہوں۔ اتنے سخت پہرے کے باوجود تم جب بھی مجھے بلاؤ گی میں تمہاری ریشمی باہنوں کے پھندے میں چلا آؤں گا۔"

"اچھا تو میں پھندا ہوں؟"

"جانی! تیرے پھندے میں سنگینی بھی ہے رنگینی بھی۔ ایسی ہی اسیری میں کہا جاتا ہے

کہ رہائی ملے گی تو مرجائیں گے۔"

وہ مسکرانے لگی۔ کسی کو یوں جیت کرکے خوشی نہیں ہوتی۔ اس نے پوچھا "ابھی تم کہہ رہے تھے میں جب بھی بلاؤں گی تم چلے آؤگے؟"

"نہیں بلاؤ گی تب بھی آؤں گا تم میری چیز ہو میں جب چاہوں تمہیں حاصل کرسکتا ہوں۔"

"اس دعوے میں کتنی صداقت ہے؟"

"میں آج رات تمہارے کمرے میں آؤں گا۔"

"میں خوشی سے مرجاؤں گی مگر بچوں کی طرح نہ بہلاؤ یہ ناممکن ہے۔"

"میں ممکن بنادوں گا میری جان۔"

"تم بڑے مضبوط لہجے میں بول رہے ہو پلیز بتاؤ کیسے آسکتے ہو؟"

"ایسے کہ تمہارے بھائی جان گہری نیند میں ہوں گے۔ میری آپا پچھلا دروازہ کھول دیں گی۔ ان کے کمرے سے تمہارے کمرے کا دروازہ تقریباً" آٹھ فٹ کے فاصلے پر ہے۔"

"نہیں اکبر! ایسے نہ آنا۔ بھائی جان کچی نیند سوتے ہیں ہلکی سی آہٹ سے اٹھ جاتے ہیں۔"

"تم اپنے بھائی کے متعلق یہ بھی جانتی ہوگی کہ وہ کھانے کے بعد چائے پیتے ہیں۔ آپا اس چائے میں نیند کی دوا ملادیں گی۔"

وہ سوچ میں پڑگئی دل اس سے ملنے کے لیے پنچھی کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا اور کمزور پڑنے والا ضمیر کہہ رہا تھا بھائی کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

وہ شش و پنج میں تھی اکبر نے پوچھا "ہیلو خاموش کیوں ہوگئیں؟"

وہ کمزور سے لہجے میں بولی "یہ اچھی بات نہیں ہے میرے بھائی کو بے ہوش رکھا جائے گا۔ یہ سن کر ہی دل خراب ہو رہا ہے۔"

"بچے کو لوریاں سنا کر اور بے خوابی کے مریض کو دوائیں کھلا کر سلانا کوئی جرم نہیں ہے۔ ہم انہیں بے ہوش نہیں کر رہے ہیں۔ تمہارے بھائی جان میرے بہنوئی ہیں میرے لیے بھی اتنے ہی محترم ہیں۔ وہ ڈیوٹی سے تھک کر آتے ہیں انہیں صبح تک گہری نیند سلانا آپا کا فرض ہے۔ اگر تم اسے دشمنی سمجھتی ہو تو کوئی بات نہیں میں ملنے نہیں آؤں گا۔"

وہ دھڑکتے ہوئے دل سے بولی "تم آنے کی بات کہہ چکے ہو۔ نہیں آؤ گے تو رات نہیں گزرے گی لیکن ڈر لگ رہا ہے۔"

"کیسا ڈر؟"

"امی میرے سلسلے میں بہت پریشان اور محتاط ہیں۔ وہ میری لاعلمی میں نگرانی کر رہی ہوں گی اگر رات کے وقت تم ان کی نظروں میں آؤ گے تو پھر کیا ہوگا؟"

"خواہ مخواہ اندیشوں میں مبتلا ہو رہی ہو۔ تمہاری امی رات بھر پہرا نہیں دیں گی۔"

"اگر ایسا ہوگیا تو کیا ہوگا؟ کسی طرح مجھے حوصلہ دو۔"

"اگر دیکھ لیا جاؤں گا تو صاف صاف کہہ دوں گا کہ تم سے شادی کر رہا ہوں مرد کا بچہ ہوں کل ہی برات لے کر آجاؤں گا۔"

"تم واقعی مردوں والی باتیں کرتے ہو۔ میں تو تمہاری ایک ایک بات پر قربان ہونے لگتی ہوں۔ میرا حوصلہ بڑھ گیا ہے۔ بتاؤ کب آؤ گے؟"

"میں دس اور گیارہ بجے کے درمیان تم سے رابطہ کرکے بتاؤں گا۔"

"ہائے کب شام ڈھلے گی کب رات آئے گی۔ انتظار کرو تو وقت رک جاتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ابھی اسی لمحے سے ساری دنیا سوجائے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا "اسی طرح خیالوں میں رت جگا مناتی رہو انتظار کی گھڑیاں آسانی سے گزر جائیں گی۔ اب میں جارہا ہوں تمہاری کوٹھی کے پیچھے زیادہ دیر رہنا مناسب نہیں ہے۔ دس بجے کے بعد ملاقات ہوگی۔"

"جی تو نہیں چاہتا کہ تمہیں جانے دوں مگر مجبوری ہے۔"

"فیروزہ میں نے اپنے واکی ٹاکی پر ہونٹ رکھ دیے ہیں۔"

فیروزہ کے بدن میں حرارت سی دوڑ گئی۔ اس نے بھی اپنے لبوں کو اپنے واکی ٹاکی پر رکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔ پھر تشنہ لبی دریا دریا پہنچ کر تھم گئی۔ واکی ٹاکی بجھ گیا تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک اسے ہاتھوں میں لیے بیٹھی رہی۔ پھر دستک سن کر چونک گئی۔ جلدی سے اٹھ کر الماری کھولی۔ واکی ٹاکی کو کپڑے میں لپیٹ کر چھپانے لگی دروازے پر پھر دستک ہوئی وہ بولی آ رہی ہوں۔ بس ایک منٹ۔"

جلدی جلدی میں وہ کپڑا نیچے گر پڑا جس میں واکی ٹاکی تھا۔ اس نے گھبرا کر بند دروازے کو دیکھا۔ پھر دستک سنائی دی۔ وہ فرش پر جھک کر اسے اٹھاتے ہوئے اور پھر سے کپڑے میں لپیٹتے ہوئے بولی "آرہی ہوں ذرا تو صبر کریں۔"

اس نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کپڑے کو الماری کے اندر رکھا اس کے پٹ بند کیے پھر تیزی سے چلتی ہوئی دروازے کی طرف آئی اس بار ماں کی آواز آئی "تیرا ایک منٹ کب پورا ہوگا اور یہ دروازہ کب کھلے گا؟"

وہ دروازہ کھول کر بولی "توبہ ہے امی! آپ تو دروازے پر دھماکے کر رہی ہیں۔ کیا میں کھڑکی توڑ کر بھاگ رہی تھی؟"

ماں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ تیزی سے چلتی ہوئی وہاں آئی وہ کھلی ہوئی تھی۔ اس کی چوکھٹ میں لوہے کی جالی لگی تھی۔ کوئی کوٹھی کے پیچھے سے آجا نہیں سکتا تھا۔ لیکن کھڑکی کے پاس آکر باتیں کرسکتا تھا۔ باہر شام کا اندھیرا چھا رہا تھا اور پچھلے حصے میں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔

ماں نے کھڑکی سے پلٹ کر پوچھا "ہوں تو دروازہ کھولنے میں اس لئے دیر کی کہ اسے

بھاگنے کا موقع مل جائے؟"

"بیٹی پر اتنی بھی بے اعتمادی اچھی نہیں ہوتی۔ برداشت سے بڑھ کر زیادتی ہو تو اولاد گستاخ ہو جاتی ہے۔"

"بے حیا بننے کے بعد گستاخ بننے کے لیے اور کیا رہ جاتا ہے؟ سچ بتاؤ وہ کھڑکی کے پاس آیا تھا اور میرے آتے ہی تم نے اسے بھگا دیا؟"

"آپ تو اتنے یقین سے کہہ رہی ہیں جیسے میری عمر میں یہی کھیل کھیلتی رہی ہیں۔"

ماں نے ایک زور کا طمانچہ مارا "ذلیل کمینی! ماں پر اس بڑھاپے میں کیچڑ اچھال رہی ہے۔"

"کوئی شریف زادی ماں کو گالی نہیں دیتی میں نے صرف گستاخی کا نمونہ پیش کیا ہے۔"

"یعنی دھمکی دے رہی ہے کہ اس سے زیادہ گستاخ اور بے شرم ہوجائے گی؟"

"میں کہہ چکی ہوں۔ زیادتی اولاد کی برداشت سے بڑھ کر نہیں ہونی چاہیے۔"

وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی جانے لگیں۔ پھر دروازے پر رک کر سوچنے لگیں ابھی بیٹی کو تھپڑ مارتے وقت کمرے میں کچھ دیکھا تھا اور اسے نظرانداز کردیا تھا۔

وہ پلٹ کر کمرے کی ایک ایک چیز کو غور سے دیکھنے لگیں۔ پھر ان کی نظریں الماری پر ٹھہر گئیں اس کے دونوں پٹ بند تھے لیکن اندر رکھے ہوئے ایک کپڑے کا کچھ حصہ باہر جھانک رہا تھا۔ عجلت میں الماری بند کرتے وقت اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کپڑے کا کچھ حصہ باہر کی طرف پھنسا رہ جاتا ہے۔

ماں کے ساتھ بیٹی کی نظریں بھی الماری پر گئیں۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی وہاں گئی اس کا ایک پٹ کھول کر کپڑے کو اندر ٹھونسا۔ پھر بڑی دلیری سے دونوں پٹ کھول کر ماں سے کہا "وہاں سے کیا دیکھ رہی ہیں یہاں آکر شبہ دور کرلیں۔ ہوسکتا ہے مجھے ایک اور طمانچہ مارنے کا بہانہ مل جائے۔"

سامنے پوری الماری بے گناہی کا چیلنج بن کر کھلی ہوئی تھی' وہ الماری کہہ رہی تھی سانچ کو آنچ نہیں۔ میرے اندر کچھ نہیں۔"

ماں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "تونے مجھے نہیں میں نے تجھے پیدا کیا ہے اور بڑے کمال کی بیٹی کو پیدا کیا ہے۔ الماری بند کرلے۔"

وہ پلٹ کر دروازہ کھولتی ہوئی باہر چلی آئیں۔ راہداری کے فرش پر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی سوچنے لگیں "الماری میں ضروری کچھ تھا۔ اس کی گھبرائی ہوئی دلیری بتا رہی تھی کہ وہ عادی چوروں کی طرح ڈھیٹ بن گئی ہے۔ میں تلاشی لے کر کیا کرتی؟ اس نے اکبر کا کوئی خط چھپایا ہوگا یا کوئی تحفہ۔ میں اس سے خطوط اور تحفے چھین کر اسے گمراہی سے بچا نہیں سکوں گی۔ مار پیٹ سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

وہ بہو اور بیٹے کے کمرے کے سامنے آکر رک گئیں۔ پھر دروازے پر دستک دی۔

دروازہ جلد ہی کھل گیا۔ سلمیٰ نے ساس کو دیکھ کر کہا "امی آپ؟ آئیں اندر آجائیں۔"

وہ بڑے کرب سے بولیں "نہیں بیٹی! میری کمر ٹوٹ رہی ہے۔ اندر نہیں آؤں گی۔ یہیں بتادو تمہارے بزرگ فیروزہ کا رشتہ مانگنے کب آئیں گے؟"

وہ مسکرا کر بولی "ایسی جلدی بھی کیا ہے؟ کیا بیٹی کہیں بھاگی جارہی ہے؟"

"جس گھر سے تہذیب اور شرافت بھاگ جائے وہاں سے پھر بھاگنے کے لیے بزرگوں کی زندگی رہ جاتی ہے۔ اس گھر میں ہم دو بوڑھے مرنے والے ہیں۔"

"مجھے سن کر افسوس ہو رہا ہے میں دو بوڑھوں کے حق میں دعا کروں گی۔"

"دوا کرو۔ یہی بہت ہے' تمہارا بڑا احسان ہوگا۔"

"میں نے اکبر سے کہا تھا کہ وہ ہمارے بزرگوں کو رشتہ مانگنے کے لیے بھیج دے۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے فون پر بتایا ہے کہ ہمارے ابا زمینوں پر گئے ہیں۔ آپ تو جانتی ہیں ہماری زمینیں میلوں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ کام بھی اتنا ہی پھیلا ہوا ہے۔ وہ جب جاتے ہیں تو کئی مہینوں میں واپس آتے ہیں۔"

انہوں نے مایوس ہوکر بہو کو دیکھا کچھ سوچا پھر کہا "تمہاری امی کسی بزرگ کے ساتھ آسکتی ہیں۔"

"میں آپ کا یہ مشورہ اپنے میکے پہنچا دوں گی لیکن ہمارے خاندان میں زمین یا لڑکی خریدتے وقت ابا کی مرضی اور منظوری ضروری ہوتی ہے۔"

"زبان کو لگام دو سلمیٰ! ہم شریف لوگ ہیں بیٹیاں بیچتے نہیں بیاہتے ہیں۔ اسی لیے تمہیں بھی خریدا نہیں ہے تم عزت سے یہاں بیاہ کر لائی گئی ہو۔"

"میری عزت تھی اس لیے عزت سے بیاہ کر آئی جس کی عزت نہ رہی ہو اس کے متعلق کیا خیال ہے؟"

ان کے دل پر گھونسا سا لگا وہ دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر ذرا جھک گئیں۔ سر کو جھکا لیا پھر ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے واپس ہونے لگیں۔ دل رو رہا تھا پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ وہ بیٹی کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے رک گئیں اس دروازے کو دیکھا پھر اچانک ہی آگے بڑھ کر اس دروازے سے لپٹ کر رونے لگیں۔

پتا نہیں سب سے پہلا دروازہ کب بنا تھا اور کہاں بنا تھا؟

ایک خیال ہے کہ رونے کے لیے پہلا دروازہ جہنم کا بنایا گیا تھا۔

عقل کہتی ہے آدم اور حوا کے درمیان سب سے پہلا شرم کا دروازہ بنایا گیا۔ جب تک دروازہ بند رہا دونوں ہنستے بولتے اور مسرتوں سے مالا مال ہوتے رہے دروازہ کھلتے ہی رونے کا مقام آیا۔ اس سے پہلے حیات آدم میں آنسو نہیں تھے۔

ازل سے موجودہ لمحے تک کسی رشتے نے اتنے آنسو نہیں بہائے جتنے ایک ماں اپنی بیٹی کے دروازے پر بہاتی ہے انہوں نے دروازے سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے کہا "میری نادان بیٹی! کیا میں اپنا سر پھوڑلوں؟ تم لڑکیوں کی سمجھ میں اتنی سی بات کیوں نہیں آتی کہ نکاح سے پہلے مرد کے ہاتھ لگنے والی لوٹ کا مال بن جاتی ہے۔ باسی کھانے کو پھر سے پکاؤ تب بھی وہ تازہ نہیں ہوتا۔ توڑا ہوا پھول کنواری شاخ پر دوبارہ نہیں لگتا اتنی سی بات سمجھ میں کیوں نہیں آتی؟ میں سمجھانے والی زبان کہاں سے لاؤں میں کیا کروں؟ میں کیا کروں؟"

وہ دروازے کو گھونسے مار رہی تھیں اور نڈھال سی ہوکر فرش پر بیٹھتی جارہی تھیں۔

اسی وقت جواد گھر میں داخل ہوا۔ ماں کی ماتمی آواز سن کر دوڑتا ہوا راہداری میں آیا۔ پھر فرش پر جھک کر ماں کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بولا "امی! کیا ہوگیا ہے؟ آپ فیروزہ کے دروازے پر کیوں رو رہی ہیں؟"

سلمیٰ نے قریب آکر کہا "یہ پاگل ہو رہی ہیں۔ کہتی ہیں ہمارے گھر والے آج ہی رشتہ مانگنے آجائیں۔ میں نے سمجھایا کہ ذرا صبر کریں۔ ابا زمینوں پر گئے ہوئے ہیں۔ واپس آتے ہی رشتہ طے ہوجائے گا مگر یہ ایک طرف بہو کو کوس رہی ہیں دوسری طرف بیٹی کو گالیاں دینے کے لیے اس بے چاری کے دروازے پر بیٹھ گئی ہیں۔"

جواد نے ناگواری سے کہا "امی! یہ کیا حرکتیں ہیں؟ کیا اس طرح بدنامی باہر نہیں جائے گی؟"

وہ فرش پر سے اٹھتے ہوئے عاجزی سے بولیں "بیٹے! میں اپنے دودھ کی قسم دیتی ہوں

ماں کی بات پر بھروسا کر تھوڑی دیر پہلے تیری بیوی نے تیری بہن کے لیے کہا ہے کہ اس کی عزت نہیں رہی ہے اس لیے وہ عزت سے بیاہی نہیں جائے گی۔ تیری بہن کو زمین کی طرح بکنے اور خریدنے والی لڑکی کہتی ہے۔"

فیروزہ نے دروازہ کھول کر کہا "امی! میں اپنے کمرے میں تھی میں نے تو بھابی کو ایسا کہتے نہیں سنا۔"

ماں نے کہا "تو کمرے میں تھی۔ یہ بہت چالاک ہے دھیمی آواز میں تجھ پر اور ہم پر کیچڑ اچھال رہی تھی۔"

جواد نے کہا "امی! آپ کو پتا ہے سلمٰی ہماری فیروزہ سے کتنی محبت کرتی ہے۔ اس کا بس چلے تو ابھی بھائی سے نکاح پڑھوا کر اسے بھابی بنالے میری سمجھ میں نہیں آتا آپ روایتی ساس کیوں بن رہی ہیں؟"

"ارے نالائق! میں ساس اس وقت کہلاؤں گی جب تو مجھے ماں سمجھے گا۔ تو نے میرا کیا مان رکھا ہے۔ تجھ میں ذرا سی بھی غیرت ہے تو جلد سے جلد بہن کی غلطی پر پردہ ڈال ابھی اکبر سے بول کہ قاضی کو لائے اور نکاح پڑھالے۔ گناہ کو آگے نہ بڑھائے۔"

"آپ کیسی باتیں کرتی ہیں جب اس کے ابا زمینوں پر گئے ہوئے ہیں تو..."

وہ بات کاٹ کر گرجتے ہوئے بولیں "جہنم میں گئیں زمینیں۔ تو چاہے تو ابھی اس کے باپ کو زمینوں سے واپس لاسکتا ہے۔"

"میں کیسے بلا سکتا ہوں؟"

"اس کے باپ کے پاس موبائل فون ہے تو فون پر کہہ سکتا ہے کہ اکبر نے تیری بہن سے زیادتی کی ہے لہٰذا کل شام سے پہلے دونوں کا نکاح پڑھا دیا جائے۔"

"کیا وہ میری بات مان کر ان کا نکاح پڑھوانے آجائیں گے؟"

"اگر وہ آنے سے انکار کریں تو دھمکی دینا کہ بہن عزت سے نہ بیاہی گئی تو اکبر کی بہن کو طلاق دے دے گا۔"

سلمٰی نے چیخ کر کہا "اب آئی ہے دل کی بات زبان پر ساری دشمنی تو مجھ سے ہے۔ تمہاری ماں مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہے۔ چھڑالو پیچھا ماں کا کلیجہ ٹھنڈا کرو مگر یاد رکھو۔ میں اس گھر سے جاکر بھی فیروزہ کو اپنی بھابی بناؤں گی کیونکہ میں اسے نند نہیں سمجھتی یہ میری جان سے زیادہ پیاری سہیلی ہے۔"

فیروزہ اس جذبہ سے بھر گئی کہ سلمٰی اپنا گھر اجاڑ کر بھی اسے اکبر کی شریک حیات بنانا چاہتی ہے۔ یہی پیاری سہیلی ہونے کا ثبوت تھا۔ وہ آگے بڑھ کر بڑے جذبے سے سلمٰی کو گلے لگا کر رونے لگی اور کہنے لگی "میں اپنی بھابی پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔ امی اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔ آپ گھر بسانے والی باتیں کر رہی ہیں۔ یا گھر اجاڑنے پر تلی ہوئی ہیں۔"

ماں نے جواد سے کہا "یہ کہتی ہے میں ہوش میں نہیں ہوں تیرا کیا خیال ہے؟"

"امی! اس وقت جو بھی آپ کی باتیں سنے گا آپ کو نارمل نہیں کہے گا۔"

انہوں نے بڑے دکھ سے بیٹے کو دیکھا وہ حقیقتاً" بہو کو طلاق دلانا نہیں چاہتی تھیں۔ بیٹے کو بہن کی لٹی ہوئی عزت کا احساس دلانا چاہتی تھیں محض طلاق کی دھمکی دے کر بیٹی کو اس کا جائز حق دلانا چاہتی تھیں۔

انہوں نے شکست کھا کر سر کو جھکا لیا۔ وہاں سے جانے لگیں۔ جواد نے آواز دی "امی! فیروزہ کی ذمے داری مجھ پر ہے' آپ پریشان ہونا چھوڑ دیں اور ایک خوشخبری سنیں۔"

ماں رک گئی۔ بیٹے نے کہا "سلمٰی ماں بننے والی ہے اور آپ دادی۔"

وہ بولیں "خدا تم سب کو شادو آباد رکھے۔ یہ بہت بڑی خوشخبری ہے۔ ایک پھانس اٹکی ہے وہ نکل جائے تو ہم جشن منائیں گے۔"

وہ سر جھکا کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آکر ایک صوفے میں گرنے کے انداز میں دھنس گئیں۔ یوں دلدل میں دھنسنے کا گمان ہو رہا تھا۔ اکبر ایک جونک کی طرح فیروزہ کے وجود سے چمٹ گیا تھا۔ اس جونک کو ہر طرح سے الگ کرنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ فیروزہ کے بدن کو نہیں چھوڑ رہی تھی۔

یہ آزمودہ نسخہ ہے کہ جونک بدن کو نہ چھوڑ رہی ہو تو ایک چٹکی نمک اس پر ڈال دیا جائے وہ فوراً" بدن کو چھوڑ کر مرجاتی ہے اسے مارنے اور الگ کرنے کا دوسرا طریقہ نقصان دہ ہوتا ہے اسے جبراً" کھینچ کر الگ کرو تو وہ جسم کے اس حصے کی کھال نوچتی ہوئی علیحدہ ہوتی ہے اور وہاں زخم چھوڑ جاتی ہے۔

ماں نے ہر ممکن کوشش کرلی اور ہر کوشش کے نتیجے میں بیٹی پہلے سے زیادہ زخمی دکھائی دی۔ جونک نے چمٹنے کے عمل کو اور زیادہ تشویشناک بنا دیا۔ ماں کو وہ چٹکی بھر نمک نہیں مل رہا تھا جس سے نجات بھی حاصل ہو جاتی ہے اور بے حیائی کا داغ بھی مٹ جاتا۔

رات کے آٹھ بجے چودھری عنایت حسین شو روم سے واپس آئے بیگم کا منہ دیکھ کر بولے "کیا بات ہے؟ بہو سے پھر جھگڑا ہوگیا؟"

"نہیں اپنی تقدیر سے جھگڑا کر رہی ہوں۔"

"نیک بخت! بہو بیٹے کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ جتنی سانسیں رہ گئی ہیں انہیں کسی طرح پوری کرلو۔ ہمیں اپنی دنیا کو اولاد کے حوالے کرکے جانا ہوتا ہے۔"

"آپ منہ ہاتھ دھو کر لباس بدلیں۔ میں کھانا گرم کر رہی ہوں۔"

وہ چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ کھانے کی میز پر آئے پھر انہوں نے کھانا شروع کرتے ہوئے کہا "آج چودھری صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔"

بیگم نے پوچھا "کون چودھری صاحب؟"

"یہی اپنے سمدھی سلمٰی کے ابا۔"

بیگم نے چونک کر کہا "لیکن سلمٰی تو کہہ رہی تھی کہ اس کے ابا زمینوں پر گئے ہیں۔"

"شاید سلمٰی کو نہ معلوم ہو۔ وہ بیٹی سے ملنے بھی ہمارے ہاں نہیں آتے ہیں۔ کہہ رہے تھے ایک مقدمہ میں ملوث ہیں۔ فرصت ملے گی تو آئیں گے۔"

پھر وہ کچھ سوچ کر بولے "مگر چودھری صاحب کہہ رہے تھے کہ سلمٰی ان سے ملنے شہر والی کوٹھی میں گئی تھی۔ باپ بیٹی کی ملاقات ہوئی تھی پھر اس نے یہاں باپ کی موجودگی کو کیوں چھپایا ہے؟"

بیگم نے بڑے کرب سے ایک گہری سانس چھوڑی۔ وہ خاوند سے نہیں کہہ سکتی تھیں کہ ہماری جوان بیٹی کو بے حیائی کی مٹی میں رلنے کے لیے چھوڑا جارہا ہے۔ باپ بیٹی اور بیٹا یہاں آکر فیروزہ کا رشتہ مانگنا نہیں چاہتے۔ جھوٹ اور فریب سے اس گھر کی عزت کو خاک میں ملایا جارہا ہے۔"

چودھری عنایت حسین نے پوچھا "کیا سوچ رہی ہو؟"

وہ بولیں "کچھ نہیں۔ اب سوچنا کیا ہے۔ جھوٹوں کے خاندان سے بہو لائے ہیں' یہ رشتہ نباہنا ہی ہوگا۔"

"لیکن اس جھوٹ کا مطلب کیا ہوا کہ ابا زمینوں پر گئے ہیں؟"

"ایسا کہنے میں ان کی مصلحت ہوگی۔ کچھ فائدے حاصل ہو رہے ہوں گے' آپ ان معاملات میں سر نہ کھپائیں۔ آرام سے روٹی کھائیں۔"

وہ خود آرام سے روٹی نہیں کھا رہی تھیں۔ لقمہ چبا کر نگلنا چاہتی تھیں مگر لقمہ الٹ کر باہر آنا چاہتا تھا۔ وہ خاوند کو کھلانے کے لیے جبراً" کھا رہی تھیں۔ اب یہ فریب پوری طرح واضح ہوگیا تھا کہ فیروزہ جب تک کھلونا بنتی رہے گی کھیلنے والا کھیلتا رہے گا۔ بہن معاون ومددگار رہے گی۔ اس گھر میں رہ کر گناہ کے چور دروازے کھولتی رہے گی۔

فریب واضح ہونے کے بعد وہ نئے حوصلوں سے سوچ رہی تھیں کہ بیٹی کی نگرانی اور سختی سے کریں گی۔ اسے سلمٰی اور اکبر کے طلسم سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہیں گی۔ بدی سے جنگ کرو تو ابتدا میں مایوسی ہوتی ہے پھر بدی کا منہ توڑ جواب دینے کے راستے نکلتے رہتے ہیں۔

نگرانی کے لیے یہ طے کرلیا کہ آج سے کچھ راتیں جاگتی رہیں گی۔کیونکہ چوروں اور گناہ گاروں کے لیے رات کی تاریکی سازگار ہوتی ہے۔ پھر شام ہی سے کالے بادل چھا رہے تھے۔ رات دس بجے تک بارش ہونے لگی تھی۔ انہیں خاوند کی طرف سے اطمینان تھا۔ وہ ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق نیند کی گولیاں کھا کر سوتے تھے۔ انہیں اس بات کا پتا نہ چلتا کہ ماں بیٹی کو گمراہی سے بچانے کے لیے صبح تک جاگ رہی ہے۔

وہ پونے گیارہ بجے اپنے کمرے سے نکلیں راہداری میں نیم تاریکی تھی بارش کے باعث ہلکی سی خنکی تھی۔ وہ دبے قدموں چلتی ہوئی دوسری راہداری میں آئیں پہلے بیٹی کے اور پھر بہو کے دروازے کو دیکھا۔ دونوں دروازے اندر سے بند تھے۔ انہوں نے بیٹی کے

دروازے سے لگ کر پھر کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ گہری خاموشی تھی۔ پوری کوٹھی میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ تقریباً" پندرہ منٹ تک اسی طرح کوئی آواز یا آہٹ سننے کی توقع کرتی رہیں۔ پھر مطمئن ہوکر وہاں سے ہٹ گئیں۔ اپنے کمرے میں واپس آگئیں۔

چودھری عنایت حسین گہری نیند میں تھے۔ اب بیگم کو بھی سو جانا چاہیے تھا مگر عجیب سی بے چینی تھی۔ نیند نہیں آرہی تھی۔ بیٹی کے دروازے سے مطمئن ہوکر آئی تھیں لیکن وہاں کی خاموشی پراسرار لگ رہی تھی۔ بڑی تیز بارش ہو رہی تھی۔ایسے میں سوچا نہیں جاسکتا تھا کہ باہر سے کوئی آئے گا یا اندر سے کوئی باہر جائے گا لیکن نہ سوچو تب بھی شبہ ہوتا ہے بعض اوقات بڑی وارداتیں بھری برسات میں ہوا کرتی ہیں۔

وہ اپنے کمرے میں سکون سے نہ بیٹھ سکیں پھر آہستگی سے کمرہ کھول کر راہداری میں آگئیں۔ وہاں سے چلتی ہوئی دوسری راہداری میں پہنچیں۔ باہر بادل گرج رہے تھے اور خوب برس رہے تھے زمین جل تھل ہو رہی ہوگی اندر پانی نہیں تھا۔ وہ ننگے پاؤں فرش پر چل رہی تھیں پھر چونک کر رک گئیں۔

فیروزہ کے دروازے کے سامنے فرش تھوڑا گیلا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب آئی تھیں تو وہ فرش گیلا نہیں تھا۔ بالکل خشک تھا۔ وہاں کی نیم تاریکی میں کچھ اچھی طرح قدموں کے نشانات نظر نہیں آسکتے تھے لیکن یہ طے تھا کہ کوئی باہر سے بھیگ کر آیا ہے۔

وہ دبے قدموں چلتی ہوئی بہو کے دروازے تک گئیں فرش اس دروازے تک نم تھا۔ یہ یقینی اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی بہو کے دروازے سے نکل کر بیٹی کے دروازے میں غروب ہوگیا ہے۔

اگرچہ بوڑھی ماں کو وہاں کوئی نہیں دیکھ رہا تھا مگر بے چاری نے مارے شرم کے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ ان لمحات میں ڈوب مرنے کی شدید خواہش ہو رہی تھی' مگر عقل کہہ رہی تھی مرنے سے بیٹی کو اور آزادی سے نوچا کھسوٹا جائے گا۔ زندہ رہنا اور ایسا کچھ کرگزرنا چاہیے کہ یہ بے حیائی کا کھیل ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

وہ بیٹی کے دروازے پر آئیں۔ وہاں کان لگا کر کچھ سننے اور کسی کی موجودگی کی تصدیق کرتے شرم آرہی تھی۔ اول تو گناہ گار خاموشی اختیار کیے رہتے ہیں پھر یہ کہ کوئی شرمناک آواز سنائی دی تو وہ کھڑے کھڑے مرجائیں گی۔

وہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آگئیں۔ ان کے اندر شرافت اور حیا چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں۔ اگر واقعی شیطان غلاظت پھیلانے گھر میں گھس آیا ہے تو اسے مار ڈال۔ اسے زندہ نہ چھوڑ۔ وہ فیروزہ کو کبھی عزت و آبرو سے دلہن بنا کر نہیں لے جائے گا۔

انہوں نے الماری کھولی پھر ایک دراز کھول کر اس میں سے ایک چھوٹی سی ٹارچ نکالی۔ وہ اس کی روشنی میں باہر جاکر دیکھنا چاہتی تھی کہ باہر سے کوئی اندر آیا ہے یا نہیں؟

اگر نہیں آیا ہے تو خدا کا شکر ہے اور اگر آیا ہے تو؟

انہوں نے الماری کی اندرونی تجوری کھولی۔ وہاں زیورات اور نوٹوں کی گڈیوں کے درمیان ایک پستول رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے پستول اٹھا لیا۔ باہر زور سے بجلی کڑک رہی تھی۔ اگر کوئی اندر آیا ہے تو اسے آئندہ آنے کے لیے زندہ نہیں رہنا چاہیے۔

وہ پھر ایک بار کمرے سے باہر آئیں۔ اس بار کچن میں آئیں۔ اس کوٹھی میں دو پچھلے دروازے تھے۔ ایک جواد کے کمرے میں اور دوسرا کچن میں۔ وہ کچن کا دروازہ کھول کر باہر آئیں۔ بارش کی تیز پھواروں میں بھیگنے لگیں۔ بجلیاں رہ رہ کر چمک رہی تھیں۔ بادل گرج رہے تھے احاطے کے باہر پچھلی گلی کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ اس لیے تاریکی گہری ہوگئی تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی ایک کھڑکی کے پاس رک گئیں۔ وہ فیروزہ کے کمرے کی کھڑکی تھی۔

بجلی کی لحاتی روشنی میں کھڑکی بند نظر آئی۔ اس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ تاریکی میں وہاں سے گزر کر سلمیٰ کے کمرے کی کھڑکی کے پاس آئیں۔ وہ کھڑکی بند تھی اس پر بھی پردہ پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے ٹارچ روشن کی چند قدم کے فاصلے پر دروازہ تھا۔ دروازے کے سامنے جو پختہ فرش تھا۔ وہ پانی کی بوچھاڑ سے دھلا ہوا تھا لیکن کیچڑ آلود قدموں کے نشانات تھے جو باہر سے بہو کے کمرے کے اندر گئے تھے۔

بجلی زور سے کڑکتی ہوئی آسمان پر ادھر سے ادھر گئی۔ ایک بجلی ماں کے کلیجے میں اتر گئی تھی۔ پستول پر گرفت مضبوط ہوگئی تھی یہ ثابت ہوگیا تھا کہ عزت کا لٹیرا گھر میں گھسا ہوا ہے۔ اگر اسے گھر میں گولی ماری جائے گی تو بدنامی باہر دور تک جائے گی۔ اگر وہ باہر گلی میں مارا جائے گا تو گلیوں میں کتے مرتے ہی رہتے ہیں۔

وہ تن کر چلنے لگیں احاطے میں کھلے حصے میں آکر وہاں تیز بارش میں بھیگتے ہوئے پلٹ کر دور بہو کے دروازے کو دیکھا۔ وہ بہو کا بھائی اسی دروازے سے باہر آنے والا تھا۔

وہ پھر پلٹ کر چلتی ہوئی احاطے کے گیٹ سے باہر آئیں۔ وہ بھی اسی گیٹ سے باہر نکلنے والا تھا۔ بادل رہ رہ کر گرج رہے تھے۔ کڑکتے چمکتی ہوئی بجلیوں کی روشنی میں کچی گلی کیچڑ سے بھری ہوئی نظر آرہی تھی۔ کنارے کے گڑھوں میں پانی لبالب بھر گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ایک درخت کے سائے میں آکر کھڑی ہوگئیں۔

وہ دعا مانگنے لگیں "ربا! آج اتنا کرم کردے کہ سب کام خیر خیریت سے ہوجائے اور فیروزہ کے ابا کو کچھ نہ معلوم ہوسکے۔ میرے معبود! تو میرے ارادوں کو سمجھتا ہے میں بیٹی کی غلطیوں کو باپ کے کانوں تک نہیں پہنچانا چاہتی۔ میرے مالک! اس غیرت مند باپ کو کچھ نہ معلوم ہو اور تمام بے حیائیاں آج رات یہیں ختم ہوجائیں۔"

وہ دعا مانگ رہی تھیں اور وقت گزرتا جارہا تھا۔ انتظار کرتے کرتے دو بج گئے۔ قیامت کا انتظار تھا۔ جب تین بجنے لگے تو بہو کے کمرے کا چور دروازہ بڑی چوری سے کھلنے لگا۔ پہلے بہو نے ذرا باہر نکل کر دور تک آس پاس نظریں دوڑائیں پھر مطمئن ہوکر اشارہ کیا

اشارہ پاکر اکبر باہر آیا۔ بہو اندر چلی گئی دروازے کو بند کرلیا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا احاطے سے گزرتا ہوا گیٹ سے باہر آنے لگا۔

وہ سمجھ رہی تھیں اکبر درخت کے پاس سے گزرنے کے لیے ان کی طرف آئے گا لیکن وہ مخالف سمت جانے لگا۔ وہ بھی درخت کے سائے سے نکل آئیں۔ اس کے پیچھے کیچڑ میں پاؤں جما جما کر چلنے لگیں۔ اکبر کو بارش کے شور میں پہلے تو کیچڑ کی چھپ چھپ سنائی نہ دی پھر وہ چلتے چلتے رک گیا۔ اسے تعاقب کا احساس ہوا تھا۔ اس نے گھوم کر پیچھے دیکھا تو بیگم عنایت کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے پوچھا "آ... آپ؟"

بیگم نے پستول والا ہاتھ اٹھایا پھر اس پستول کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس کا نشانہ لیا، وہ سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ "یہ... آپ کیا کر رہی ہیں۔ دیکھئے گولی چل جائے گی۔"

وہ شدید نفرت سے بولیں "ذلیل کتے! اس میں جتنی بھی گولیاں ہیں، تیرے لیے کم ہیں۔ مجھے اپنی بیٹی کی رسوائی کا ڈر نہ ہوتا تو تجھے دوڑا دوڑا کر اور تڑپا تڑپا کر مارتی لیکن میں بے حیائی کا یہ کھیل ختم کرنے اور اپنے خاندان کی عزت بچانے کے لیے فوراً تجھے جہنم میں پہنچا رہی ہوں۔"

اکبر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جان بوجھ کر کیچڑ میں پھسل گیا۔ ان ہی لمحات میں گولی چلی تھی۔ بجلی کی زوردار کڑکتی ہوئی آواز اور بادلوں کی گرج میں فائرنگ کی آواز گڈمڈ ہوگئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرا فائر کرتیں' اکبر نے دونوں ہاتھوں سے کیچڑ کو سمیٹ کر ان کے منہ پر اچھال دیا وہ کیچڑ آنکھوں میں گئی۔ آنکھیں نہ ہوں تو گولی کدھر چلائی جائے۔

آنکھوں میں شدید تکلیف ہونے کے باوجود انہوں نے اندازے سے گولی چلانی چاہی لیکن کلائی فولادی گرفت میں آگئی۔ اکبر نے اتنی زور سے کلائی موڑی کہ وہ چیخ پڑیں۔ پستول ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ پھر منہ پر ایک زوردار الٹا ہاتھ پڑا۔ وہ لڑکھڑا کر کیچڑ میں چاروں شانے چت ہوگئیں۔

ایک تو عورت کی کمزوری اس پر اندھے پن والی بے بسی۔ وہ دلدل سے اٹھنا چاہتی تھیں۔ اکبر نے اٹھنے سے پہلے دبوچ لیا۔ وہ پھڑپھڑانے لگیں۔ اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرنے لگیں۔ وہ بڑی مضبوطی سے ان کی گردن اور سر کو پکڑ کر ان کے چہرے کو کیچڑ میں ڈبو رہا تھا اور کیچڑ میں رگڑ رہا تھا تاکہ اس طرح دم گھٹ جائے۔

اور ایسا ہی ہو رہا تھا۔ ان کا دم الجھ رہا تھا۔ وہ بدنامی کے ڈر سے چلانا اور مدد کے لیے پکارنا نہیں چاہتی تھیں اور اگر چیخنا بھی چاہتیں تو بار بار کیچڑ میں سانس رکنے کے باعث کچھ بولنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔ وہ گردن پر گھونسے مار مار کر ان کے سر کو کیچڑ اور پانی میں ڈبو رہا تھا اور کہتا جارہا تھا "سور کی بچی! مجھے گولی مارنے آئی تھی۔ کتنی ہی ماؤں کی بیٹیوں کو ہضم کرچکا ہوں تو کوئی نرالی ماں آئی ہے۔ اچھا ہے تیرے بعد راستہ بالکل صاف

رہے گا۔"

منہ ناک اور آدھا چہرہ بڑی دیر سے کیچڑ میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ ہزار کوششوں کے باوجود منہ اٹھا کر کھلی ہوا میں سانس نہ لے سکیں۔ قوت مدافعت کمزور پڑتے پڑتے بالکل سرد پڑگئی۔ پورا جسم ساکت ہوگیا۔ اکبر نے ہانپتے ہوئے اسے چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا شاید ابھی جان باقی ہو لیکن منہ گردن تک اسی طرح ڈوبا رہا۔ اب سانس کے آنے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ایک ماں اپنی بیٹی کی پیدا کی ہوئی کیچڑ میں منہ چھپا کر مرگئی تھی۔ چودھری اکبر نے ماں کے مردہ جسم کو ایک ٹھوکر ماری پھر وہاں سے چلا گیا۔

وہ تہذیب اور شرم کی خاطر لڑنے والا جسم وہاں پڑا رہا۔ بارش آہستہ آہستہ تھم گئی وقت چیونٹی کی چال سے گزرتا گیا پھر خاموش فضا میں فجر کی اذان گونجنے لگی۔ دو نمازیوں نے مسجد کی سمت جاتے ہوئے وہ لاش دیکھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورے محلے میں ہلچل مچ گئی۔ چودھری عنایت حسیؔن اور ان کے گھر والوں کو تمام محلّہ جانتا تھا لیکن بیگم صاحبہ پہچانی نہیں گئیں کیونکہ چہرہ کیچڑ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پورا جسم کیچڑ سے آلودہ تھا بس اتنا سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ کسی عورت کی لاش ہے۔

پولیس والوں نے آکر لاش کو ہاتھ لگایا۔ چہرے کی آلودگی صاف کی تو سب ہی حیرت سے چیخ پڑے "یہ تو بیگم صاحبہ ہیں بیگم عنایت ہیں۔ یہ کوٹھی والی خالہ ہیں...."

انسپکٹر نے چودھری عنایت حسیؔن اور ان کے بیٹے جواد حسین کو بلایا وہ دونوں پچھلی گلی کی بھیڑ میں آئے جواد ماں کی لاش دیکھ کر سکتے میں رہ گیا۔ چودھری صاحب چکرا کر کیچڑ میں گر رہے تھے کہ لوگوں نے انہیں سنبھال لیا۔

یہ المناک اطلاع فیروزہ اور سلمٰی کو ملی فیروزہ تو چیخیں مار کر رونے لگی۔ سلمٰی تشویش میں مبتلا ہوگئی۔ محلے کی ایک عورت سے کرید کرید کر تفصیلات معلوم کرنے لگی۔ اندر کی بات کون جانتا تھا کہ یہ قتل کی واردات کیسے ہوئی؟ اس عورت نے اتنا ہی بتایا کہ قاتل نے بیگم صاحبہ کو کیچڑ میں دھنسا کر مارا ہے۔ لاش کے پاس ایک پستول بھی پایا گیا ہے پولیس والے لاش کے ساتھ چودھری صاحب اور جواد کو بھی لے گئے ہیں۔

بڑی کوٹھیوں میں رہنے والی بیگمات افسوس کے لیے سلمٰی اور فیروزہ کے پاس آنے لگیں۔ سلمٰی نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ پھر فیروزہ کو ایک طرف لے جاکر بولی "میں جانتی ہوں اس وقت تم صدمات سے چور چور ہو لیکن ایسے وقت ہوش و حواس میں رہنے کی ضرورت ہے۔ پولیس والے ہم سے بھی سوالات کریں گے۔ یہ کبھی بھول کر بھی نہ کہنا کہ اکبر یہاں رات کو آیا تھا۔"

فیروزہ نے سوالیہ نظروں سے بھابی کو دیکھا۔ بھابی نے کہا۔ "میں نے معلوم کیا ہے باہر یہ چرچا ہے کہ کسی شخص نے امی کو کیچڑ میں دھنسا کر مارا ہے۔ پولیس والے ہمارے گھر

کے مردوں پر شبہ کریں گے یا ایسے شخص کے متعلق پوچھیں گے جو پچھلی رات ہم سے ملنے آیا ہو۔"

"کیا یہ معلوم ہوا ہے کہ امی رات کو باہر پچھلی گلی میں کیوں گئی تھیں؟"

"ابھی کچھ معلوم نہیں ہوسکا مگر تم عقل سے بہت کچھ سمجھ سکتی ہو یاد رکھو بھول سے بھی اکبر کی یہاں موجودگی کا اعتراف نہ کرنا۔"

وہ دونوں ڈرائنگ روم میں خواتین کے درمیان آگئیں۔ خواتین بیگم عنایت مرحومہ کی خوبیاں بیان کرکے ان کی ناگہانی موت پر افسوس کر رہی تھیں۔ فیروزہ اور سلمٰی کو صبر کی تلقین کر رہی تھیں لیکن فیروزہ کے دماغ میں سنسنی سی پیدا ہوگئی تھی۔ عقل کہہ رہی تھی کہ ماں رات کو پہرا دے رہی تھی۔ اس نے اکبر کو دیکھ لیا تھا۔ پھر بات بڑھ گئی ہوگی اور اکبر نے ہمیشہ کے لیے ان کی زبان بند کردی ہوگی۔

وہ سوچ رہی تھی "اگر یہی کچھ ہوا ہے تو مجھے ماں کی موت پر ماتم کرنا چاہیے یا عشق کا نوحہ پڑھنا چاہیے؟ میں کس زبان سے اکبر کو اپنی امی کا قاتل کہوں؟ خدا کرے یہ جھوٹ ہو میرا احمقانہ خیال ہو اور قاتل کوئی اور ہو۔"

اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ سر جھکا ہوا تھا بالکل گم صم بیٹھی ہوئی تھی۔ خواتین سمجھ رہی تھیں کہ ماں کے غم سے نڈھال ہے اس پر نیم سکتہ سا طاری ہے لیکن اس کے اندر ماں کے صدمے سے زیادہ اکبر کے لیے کشمکش پیدا ہوگئی تھی۔ وہ اپنے دل کو یہ سوچ کر بہلا رہی تھی کہ اسے جی جان سے پیار کرنے والا اکبر اس کی ماں کو قتل نہیں کرسکتا۔ وہ تو ماں کے اطمینان کے لیے کسی دن بھی برات لانے اور مجھے بیاہ کرلے جانے کا ارادہ کرچکا تھا۔ ایسا محبت کرنے والا جانی دشمن نہیں ہوسکتا۔

سلمٰی نے دوبار فون کے ذریعے اکبر سے رابطہ کرنا چاہا۔ پتا چلا وہ اپنی کوٹھی میں نہیں ہیں۔ چودھری عنایت حسین نے تھانے سے واپس آکر بتایا کہ اکبر اور جواد پوسٹ مارٹم رپورٹ کے لیے رکے ہوئے ہیں۔ وہ جلد ہی لاش لے کر گھر آئیں گے۔ فیروزہ کو باپ کی زبان سے یہ سن کر اطمینان ہوا کہ اکبر گھر کے فرد کی طرح اس کی امی کی آخری رسومات کی ادائیگی کے لیے بھاگ دوڑ میں مصروف ہے۔

چودھری عنایت حسین نے تھانے میں اعتراف کیا تھا کہ لاش کے پاس پایا جانے والا پستول اپنا ہے۔ وہ حیران تھے کہ بیگم رات کو پستول لے کر پچھلی گلی میں کیوں گئی تھیں؟ کسے قتل کرنا چاہتی تھیں؟ اور کس کمبخت کے ہاتھوں ماری گئی تھیں؟ جواد کے پاس بھی ان سوالات کے جواب نہیں تھے۔ پولیس والے بھی معاملے کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ کوٹھی کے احاطے سے پچھلی گلی تک صبح ہوتے ہی اتنی بھیڑ لگ گئی تھی کہ قاتل کے قدموں کے نشانات نہیں مل سکتے تھے۔

بیگم کی موت کے بعد گھر میں چند روز تک ماتمی ماحول رہا۔ دور و نزدیک کے رشتے دار

پُرسے کے لیے آتے جاتے رہے۔ چودھری اکبر کی آمدورفت کچھ زیادہ ہوگئی۔ اب اسے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں رہا تھا۔ جب چودھری عنایت حسین شو روم جاتے تھے اور جواد منگلا چلا جاتا تھا تو اکبر وہاں آکر تمام دن فیروزہ کے کمرے میں گھسا رہتا تھا۔

ابتدا میں فیروزہ اپنے محبوب سے کتراتی رہی۔ اکبر نے کہا۔ "میں جانتا ہوں تمہیں اپنی امی کی موت کا بے حد صدمہ ہے مگر مرنے والوں کا ماتم تمام عمر نہیں کرتے۔ ان کا دکھ ان کی یادیں دل میں چھپا کر رکھتے ہیں۔"

فیروزہ نے کہا۔ "میرا دل تمہارے پاس آنے کو مچلتا ہے مگر کوئی بات مجھے روکتی ہے۔"

"وہ کیا بات ہے؟"

"میں سوچتی ہوں امی کے قاتل کا سراغ کیوں نہیں مل رہا ہے۔"

"اس لیے کہ قاتل نے اپنے پیچھے کوئی ثبوت' کوئی پہچان نہیں چھوڑی ہے۔ اس کے باوجود پولیس والے اسے تلاش کر رہے ہیں۔"

"کسی نام و نشان کے بغیر کیسے تلاش کر رہے ہیں؟"

"یہ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"ابا جان نے بتایا ہے کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق رات کے پچھلے پہر تین اور چار بجے کے درمیان قتل ہوا ہے اور پولیس والے ہم سے یہ سوال کرچکے ہیں کہ اس وقت ہمارے ہاں کوئی ملنے آیا تھا یا نہیں؟ اور ہم سب کا جواب ہے کوئی نہیں آیا تھا۔ جبکہ تم موجود تھے۔"

"کیا تم مجھ پر شبہ کر رہی ہو؟"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آتا ہے میں تم پر شبہ نہیں کرنا چاہتی ہوں اس کے باوجود مشکوک سے لگتے ہو۔"

اس نے ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا "بہت دنوں سے میری محبت کی خوراک تمہیں نہیں ملی ہے اس لیے بہک رہی ہو آؤ میں تمہارے دل کا سارا میل دھو ڈالوں گا۔"

وہ کسمانے لگی۔ "نہیں مجھے چھوڑ دو۔"

"آخر کیوں؟"

"بس بہت ہوچکا۔ اب یہ نہیں ہونا چاہیے۔ پہلے شادی کرو۔"

"میری جان! شادی بھی ہوجائے گی۔"

"آخر کب ہوگی؟"

"ذرا عقل سے سوچو۔ چالیس دن سے پہلے شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"تو چالیس دنوں تک یہ بھی نہیں ہونا چاہیے جو تم چاہتے ہو۔"

وہ خود کو چھڑا کر الگ ہوگئی۔ حسن انکار کرے تو شوق اور بڑھ جاتا ہے۔ چودھری اکبر

نے اس کا بھرپور سراپا دیکھا۔ سیاہ ماتمی لباس میں اس کی گوری اور گلابی رنگت آنکھوں کو چکا چوند کر رہی تھی۔ آہ وزاری کے بعد سوجی ہوئی آنکھیں اور افسردہ چہرہ ہمدردی اور محبت کے لیے پکار رہا تھا۔

اس نے ہمدردی اور محبت سے ہاتھ بڑھایا۔ وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”نہیں مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ ہم محبت میں اندھے ہوکر گناہ کرتے رہے۔ اتنی سی بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ میری یہ گمراہی امی کو مار رہی ہے۔ اکبر! میرا ضمیر کہتا ہے کہ میں نے اور تم نے مل کر امی کو قتل کیا ہے۔“

اکبر نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔ نظریں چراتے ہوئے کہا ”تم خواہ مخواہ جذباتی ہوکر ایسا سوچ رہی ہو۔ اپنے دماغ سے یہ منفی خیال نکالو ورنہ صدمات میں اضافہ ہوتا رہے گا۔“

”میں کیا کروں؟ جب تنہا رہتی ہوں تو ایسے ہی خیالات مجھے پریشان کرتے ہیں۔“

”اسی لیے ہم تمہیں تنہا چھوڑتے۔ میں اور سلمٰی باری باری تمہاری تنہائی دور کرتے ہیں۔“

وہ پھر پلٹ کر قریب آیا اور بولا۔ ”میری بات مانو لوگ مرنے والوں کے لیے صبر کرتے ہیں اور نئے طور سے زندہ رہنے کے جتن کرتے ہیں۔ تم خود کو میری محبت میں گم کردو۔ نیند آئے تو میرے سینے سے لگ کر سو جاؤ۔ ماں کی یاد آئے تو میری قربتوں میں کھو جاؤ۔ اس لیے کہ تم اگلی تمام زندگی میرے ساتھ گزارنے والی ہو۔“

اس نے پھر اسے پکڑ کر کھینچ لیا۔ وہ سینے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ رونے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے آنسو پونچھنے کے لیے رومال مل گیا ہو۔ چودھری نے گلاب سے چہرے کو اٹھایا پھر جھک کر ہونٹوں کے رومال سے آنسو پونچھنے لگا۔ اسے ہمدردی ملنے لگی۔

ہمدردی کے معنی ہیں کسی کے درد میں شریک ہونا۔

شرکت کا انسانی اصول یہ ہے کہ ہم تمہارا درد دور کرتے ہیں تم ہماری بے چینی دور کرو۔

گویا درد سے بھی منافع کمایا جاتا ہے۔

وہ جو گلے لگا کر درد بانٹنے آتے ہیں بڑے وہ ہوتے ہیں۔ خود بھی درد ہی درد ہوتے ہیں۔

وہ لذت درد سے آشنا تھی مگر اس حقیقت سے ناآشنا تھی کہ جسے یہ لذت لگ جائے وہ غم نصیب ہوتی جاتی ہے۔ وہ اپنا نصیب اس کے نام لکھتی جارہی تھی اور قسمیں لیتی جارہی تھی کہ چالیس دن پورے ہونے کے بعد وہ اس کے باپ کے پاس رشتہ مانگنے آئے گا۔

اس نے چالیس دن کے بعد کہا ”لاہور میں میرا ایک مقدمہ زیر سماعت ہے۔ میں پیشی بھگتنے جارہا ہوں۔ ایک ہفتے میں واپس آؤں گا تو تمہارے ابا سے تمہیں مانگ لوں گا۔“

وہ باپ بیٹے کسی کو کسی بھی معاملے میں ٹالنا چاہتے تھے تو کسی مقدمے میں مصروف اور پریشان رہنے کا بہانہ کرتے تھے۔ چودھری اکبر بھی اسی بہانے لاہور میں مجرا سننے آگیا۔ آخر جاگیردار زادہ تھا۔ نہ کوئی کاروباری پریشانیاں تھیں نہ بیوی بچوں کی فکر تھی۔ وقت اتنا ہوتا تھا کہ گزرتا نہیں تھا۔ دولت اتنی تھی کہ خرچ ہوتے ہوتے بھی ختم ہونے کو نہیں آتی تھی۔ اس لیے معیاری عیاشی میں وقت گزرتا تھا۔ یعنی عیاشی کا معیار یہ تھا کہ بازار والیوں کو منہ نہیں لگاتا تھا صرف مجرا سنتا تھا۔ شریف زادیوں کو منہ لگاتا تھا مگر گلے کا پھندا نہیں بناتا تھا۔

اب وہ کچھ تشویش میں مبتلا ہو رہا تھا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ فیروزہ کو نظر انداز کرے۔ جتنی لوٹ مار کرنی تھی کرچکے۔ اب کچھ نہیں رہا لیکن کچھ رہ گیا تھا۔ وہ اس سے کترانے کا ارادہ کرتا تھا پھر اس البیلی حسینہ کی طرف کھنچا چلا آتا تھا۔

حسن تو دنیا میں بکھرا پڑا ہے حسین عورتوں کی کمی نہیں ہے۔ چودھری نگر نگر گھوم چکا تھا مگر جانے کیوں فیروزہ اس کی ضرورت بن گئی تھی۔ اس میں کوئی بات کوئی کشش دوسروں سے مختلف تھی جو اسے اپنی طرف کھینچتی تھی۔ وہ لوٹنے آتا تھا لیکن اداؤں کی گرم بازاری میں لٹ کر چلا جاتا تھا۔

اگر وہ چاہتا تو اس رات اس کی ماں کو ہلاک نہ کرتا پستول کی گولی سے بچ گیا تھا اس اطمینان سے گھر چلا جاتا کہ ماں بیٹی کی عزت رکھنے کے لیے شور نہیں مچائے گی۔ زیادہ سے زیادہ یہی کرے گی کہ اپنے ہاں اس کا داخلہ بند کردے گی۔ اپنی بیٹی سے ملنے نہیں دے گی۔ بس وہ یہی نہیں چاہتا تھا۔

اس نے درمیانی دیوار گرادی تھی۔ پھر پچھتاتا بھی رہا کہ کیوں گرادی۔ وہ بڑھیا ہوتی تو اسی کی سختی اور پہرے داری کے بہانے فیروزہ سے دور ہوجاتا۔ وہ پہلے کبھی ایسی دوغلی کیفیت سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ اس سے دوری بھی چاہتا تھا اور اُسے دیوانے کی طرح مانگتا بھی تھا اس کے ساتھ کبھی بدنام نہیں ہونا چاہتا تھا اور اس کی خاطر ایک نہیں کئی قتل بھی کرسکتا تھا۔

اس نے لاہور آکر اسے بھلانے کی کوشش کی۔ بھلانے کے لیے کتنی ہی حسینائیں تھیں لیکن سمندر کا جھاگ تھیں۔ ہوس کے بجھتے ہی ان کی ضرورت بھی بجھ جاتی تھی۔ ان کے بعد فیروزہ ہی کی آنچ آتی رہتی تھی۔ بعض عورتیں ہوس اور گناہ سے بالاتر ہوکر غیر محسوس طریقوں سے متاثر کرتی ہیں۔ یہ بات چودھری کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

اس نے کسی طرح دو ماہ وہاں گزار دیے۔ پھر ایک دن مجبور ہو کر اسے فون کیا دوسری طرف سے سلمٰی کی آواز آئی۔ اس نے کہا ”میں اکبر بول رہا ہوں۔“

"اوہ اکبر! تم کہاں غائب ہوگئے ہو یہ فیروزہ تمہارے لیے روتی رہتی ہے۔"

فیروزہ کی آواز سنائی دی۔ "بھابی! مجھے دو میں بات کروں گی۔"

پھر اس نے سلمٰی سے ریسیور لے کر کہا "ہیلو اکبر! کیا آج ہماری یاد آئی ہے؟ کیا خوب وفا کر رہے ہو۔"

وہ بولا۔ "تم مجھے خوب طعنے دینا۔ پہلے میری مجبوری سن لو۔ مقدمہ اتنا پیچیدہ ہوگیا تھا کہ جیل جانے کی نوبت آگئی تھی۔"

"یہاں میرے مرنے کی نوبت آگئی ہے میں ماں بننے والی ہوں۔"

"کیا؟" اس نے چیخ کر پوچھا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟"

وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔ "میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔"

"پریشانی کی کیا بات ہے بچہ ڈراپ کردو۔"

"کیا کردو؟"

"بھئی ڈراپ کردو۔ اسے دنیا میں لانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں سلمٰی سے کہتا ہوں۔ وہ نوٹ پھینکے گی تو سارے کام آسان ہوجائیں گے۔"

"میں بھی نوٹ پھینکنا جانتی ہوں مگر بچہ نہیں پھینکوں گی۔ تمہیں ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ یہ ہماری محبت کی نشانی ہے۔ فوراً آکر مجھ سے نکاح پڑھواؤ۔ بدنامی کے تمام اندیشے ختم ہوجائیں گے۔"

"میری جان! فون پر یہ بحث مناسب نہیں ہے۔ ایک بچہ ختم ہوگا تو محبت ختم نہیں ہوگی۔ آئندہ بھی تالاب میں پانی آتا رہے گا اور مچھلیاں پیدا ہوتی رہیں گی۔"

"اکبر! مجھے غصہ آرہا ہے۔ میں سوچ رہی تھی تم باپ بننے کی خوشخبری سے ہی دوڑے چلے آؤگے۔"

سلمٰی نے کہا۔ "فیروزہ! غصے میں آواز پر قابو رکھو۔ اگر ابا جان نے..."

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر کمرے سے باہر جاکر دیکھنا چاہا کہ سسر صاحب اپنے کمرے میں ہیں یا نہیں لیکن دروازے کی طرف پلٹتے ہی اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ چودھری عنایت حسین دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ پکڑے بہو کی چوکھٹ پر پڑے تھے اور بری طرح لرز رہے تھے۔ یہ تیسری بار ان پر دل کا دورہ پڑا تھا۔

فیروزہ پہلے تو بھید کھلنے پر سہم گئی تھی پھر باپ کی حالت دیکھتے ہی فون پر چیخ کر کہا۔ "اکبر! جلدی آؤ۔ ابا جان پر پھر دورہ پڑا ہے۔ ہم انہیں ہسپتال لے جارہے ہیں۔"

پھر وہ رابطہ ختم کرکے ایمبولینس کے لیے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ سلمٰی دوڑتی ہوئی جواد کو آوازیں دیتی ہوئی کمرے سے جاچکی تھی۔ بیٹی نے ایمبولینس کی بات کرکے ریسیور کو رکھا۔ پھر دوڑتی ہوئی باپ کے پاس آئی وہ بہو اور بیٹی کی بے حیا دہلیز پر پڑا ہوا دیدے پھیلائے دیکھ رہا تھا۔ بیٹی نے جھک کر اسے سہارا دینے کے لیے دونوں ہاتھ بڑھائے اس نے

ایک جھٹکے سے پیچھے ہونا چاہا۔ مگر کمزوری سے بس تھرتھراتا رہ گیا۔ منہ سے "ہونہہ ہونہہ" کی آواز نکلی صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ ان ناپاک ہاتھوں سے دور ہونا چاہتا ہے۔

وہ بڑی ندامت اور پشیمانی سے بولی۔ "ابا جان!"

اس سے آگے نہ بول سکی۔ ابا جان نے ایک آخری جواب دیا۔ تھرتھراتے ہوئے اس کی طرف منہ کرکے تھوکا۔ آخری سانسوں میں تھوک صحیح طرح نہیں نکلا۔ ہونٹوں سے ابل کر باچھوں سے رسنے لگا۔ دیدے پھیل گئے تھے۔ گردن ڈھلک گئی تھی۔ سانسیں تمام ہوگئی تھیں۔ وہ چیخیں مارتی ہوئی باپ سے لپٹ گئی۔

کون نہیں مرتا؟ سب ہی کے باپ مرتے ہیں۔ لیکن ایسے کم نصیب باپ کم کم ہوتے ہیں، جن کے منہ پر بیٹی تھوک بن کر پھیل جاتی ہے۔ وہ تھوک ان کی باچھوں سے رستا ہوا مردہ چہرے پر پھیلتا جارہا تھا۔

وہ یکبارگی چیخ مار کر اٹھی۔ "امی!"

پھر وہ دوڑتی ہوئی راہداری میں آئی۔ "امی! امی جلدی آئیں۔ کہاں ہیں آپ؟ جلدی آئیں..."

ادھر سے سلمٰی اور جواد آرہے تھے جواد نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ کہاں بھاگی جارہی ہو؟"

"بھائی جان! امی کو بلانے جارہی ہوں ابا جان فوت ہوگئے۔"

وہ پھر امی امی پکارتی ہوئی جانا چاہتی تھی، بھائی نے اسے پکڑ لیا۔ بھابی نے کہا "ہوش میں آؤ۔ امی اس دنیا میں نہیں ہیں۔"

"آں؟" اس نے چونک کر بھابی کو پھر بھائی کو دیکھا وہ دونوں اسے ساتھ لے کر چودھری عنایت حسین کی لاش کے پاس آئے بیٹا باپ کو مردہ دیکھتے ہی پاس آکر فرش پر دوزانوں ہوگیا۔ سر جھکا کر رونے لگا۔

اسے روتے دیکھ کر فیروزہ یکبارگی ہنسنے لگی۔ سلمٰی نے اسے تعجب سے دیکھا وہ آگے پیچھے ڈگمگاتی ہوئی ہنستی جارہی تھی۔ سلمٰی نے اسے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ہوگیا ہے تجھے؟"

وہ بدستور ہنستی ہوئی بولی۔ "ابا جان کے مرتے ہی مجھے امی کا خیال آیا کہ وہی ایک ایسی ہیں جو میرے باپ کی میت پر روئیں گی۔ میں تو باپ کی قاتل ہوں۔ مجھے رونے اور ماتم کرنے کا حق نہیں ہے اسی لیے میں امی کو پکار رہی تھی۔ بھائی جان تو آپ کے سگنل پر ہنستے ہیں اور آپ کے سگنل پر روتے ہیں۔ مگر دیکھو دیکھو یہ ہنسنے کی بات ہے یا نہیں؟ یہ پہلی بار آپ کی اجازت کے بغیر رونے کی غلطی کر رہے ہیں۔"

سلمٰی اسے گھور کر دیکھ رہی تھی اور سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ نند سہیلی آج طعنے دے رہی ہے یا باپ کی موت سے ذہنی توازن بگڑ رہا ہے؟

وہ دوسرا خیال درست تھا۔ کوئی سوا تین ماہ پہلے ماں کو قتل کیا گیا اور آج باپ بھی

گیا۔ اس کے ذہن پر برا اثر پڑا تھا۔ وہ ہنستے ہنستے چکرا کر گر پڑی پھر اسے ہوش نہ رہا۔

پتا نہیں کتنا وقت گزر گیا۔ جب اس نے آنکھ کھولی تو اپنے کمرے میں اپنے بستر پر تھی۔ کمرے کے باہر کچھ عورتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنتے ہی پھر آنکھیں بند کرلیں۔ ایک عورت کی آواز آئی وہ کہہ رہی تھی "میت اٹھنے والی ہے بیٹی اپنے باپ کا آخری دیدار کرلیتی تو اچھا ہوتا۔"

دوسری آواز سنائی دی۔ "مگر یہ تو ابھی تک بیہوش ہے۔"

پھر دور سے سلمٰی کی آواز آئی وہ پوچھتی آرہی تھی۔ "کیا ہوا؟ فیروزہ کو ہوش آیا؟"

"نہیں یہ ابھی تک ایسی ہی پڑی ہے۔"

سلمٰی نے کہا۔ "ڈاکٹر کہہ رہا تھا دو چار گھنٹے میں ہوش آجائے گا' یہاں تو چھ گھنٹے گزر چکے ہیں۔ میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔ پلیز آپ سب یہاں سے چلیں۔ اسے تنہا چھوڑ دیں۔"

فیروزہ نے بند آنکھوں کے پیچھے سے اندازہ لگایا۔ جانے والوں کی کچھ آہٹیں سنیں۔ پھر دروازہ بند ہونے کی آواز آتے ہی اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے سن لیا تھا کہ گھر سے باپ کا جنازہ اٹھ رہا ہے۔ ابا جان کو آخری بار دیکھ لینے کو دل تڑپنے لگا تھا مگر اپنے آپ پر بھروسا نہیں تھا۔ یہ اندیشہ تھا کہ احساسِ جرم سے پھر ذہنی رو بہک جائے گی اور وہ جنون میں سچائیاں اگلنے لگے گی۔

وہ بڑے دکھ سے سوچنے لگی۔ "آہ! یہ کیا ہوگیا؟ میں نے اور اکبر نے محبت کو گناہ بنایا اور امی ابا جان کی موت نے اس محبت کو جرم بنادیا ہے۔ میں اندھی کیوں ہوگئی تھی؟ یہ احساسِ جرم پہلے کیوں نہ ہوا؟"

کسی بے عقل کو اچانک عقل نہیں آتی۔ اس کے احساس کے جاگنے اور ضمیر کے چونکنے کی وجوہات کبھی سمجھ میں آتی ہیں کبھی سمجھ میں نہیں آتیں۔ دراصل پہلے فیروزہ کا نہیں ایک ماں کا ضمیر اس وقت جاگا تھا جب فون پر اکبر نے کہا تھا بچے کو ضائع کردو۔

تب پتا چلا اولاد کیا ہوتی ہے۔ تب معلوم ہوا کہ اس کی امی اسے رسوائی سے بچانے اس کی آبرومندی اور نیک نامی کو قائم رکھنے کے لیے کیسی باؤلی ہو رہی تھیں۔ اس ماں نے اس کے پیٹ میں آنے والے بچے کو روکنے کیلیے پہرا دیتے دیتے اپنی جان دے دی اور جب جان دے دی اور جب بچے نے اپنی آمد کی خبر دیدی ہے تو یار کا حکم ہوتا ہے بچے کو مار ڈالو۔

"کیسے مار ڈالوں؟" وہ مٹھیاں بھینچ کر اور دانت پیس کر زیرِ لب بڑبڑائی۔ "میں اس ماں کی بیٹی ہوں جس نے مجھے عزت سے زندہ رکھنے کے لیے جان دی۔ میں بھی اپنی اولاد کو دنیا میں لاؤں گی اور اسے زندہ رکھوں گی۔"

دیکھا جائے تو گناہ کے ثمر کو قائم رکھنے کا عزم احمقانہ تھا گناہ چھپایا جاتا ہے نہ چھپ

سکے تو اس کی نشانی مٹا دی جاتی ہے۔ لیکن کوئی ہوشمند اور کوئی عالم فاضل اس بچے کو ہلاک کرنے کی اجازت نہیں دے گا جو کوکھ میں اپنے وجود کا اعلان کرچکا ہو۔

ایسے بچے کو مطعون نہیں کیا جاتا بلکہ معصوم اور بے گناہ کہا جاتا ہے۔ البتہ اس کی پیدائش کے ذمہ دار گناہگاروں کو سنگسار کرنے کا حکم ہے۔

ابھی وہ دین اور فتاوٰی کے پہلوؤں سے نہیں سوچ رہی تھی۔ ابھی تو اس کے اندر بارودی دھماکے ہو رہے تھے۔ وہ اس منظر کو بھلا نہیں پارہی تھی جب باپ نے مرتے مرتے اس پر تھوکا تھا۔ ندامت اور پچھتاوے سے اس کا دماغ پھٹ پڑنا چاہتا تھا مگر وہ ذہن کو قابو میں رکھنے کی پوری کوششیں کر رہی تھی۔ اس کے متعلق ماں باپ اور بھائی کی متفقہ رائے یہی ہوا کرتی تھی کہ وہ ضدی اور خود سر اور ارادے کی پکی ہے جو سوچ لیتی ہے وہ کر گزرتی ہے اسی قوت ارادی سے وہ خود کو نارمل رکھنے میں کامیاب ہو رہی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد پھر کمرے کا دروازہ کھلا۔ سلمٰی ایک ڈاکٹر کے ساتھ اندر آئی۔ فیروزہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ "سلمٰی بیٹی تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی تھیں۔ ہماری فیروزہ تو بالکل ٹھیک ہے۔"

وہ بولی۔ "ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں ہوش میں ہوں۔ آپ بھی ہوش میں رہیں ڈاکٹر صاحب! اس گھر میں ماتم ہو رہا ہے اور آپ مسکرا رہے ہیں۔"

وہ ایک دم سے جھینپ کر سنجیدگی سے بولا۔ "سوری ہم ڈاکٹر اپنے مریضوں سے مسکرا کر بولتے ہیں۔ میں تمہیں ہوش میں دیکھ کر چند لمحوں کے لیے یہاں کے ماتمی ماحول کو بھول گیا تھا۔ سو سوری۔"

اس نے نبض تھامنے کیلیے ہاتھ بڑھایا وہ بولی "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے ڈاکٹر اور دوا کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے یہاں تک آنے کی زحمت کی ہے اس کے لیے ممنون ہوں۔ آپ کا شکریہ۔"

ڈاکٹر کمرے سے چلا گیا۔ کچھ عورتیں اندر آگئیں۔ سلمٰی نے پوچھا "یہ کیا حرکت ہے تم نے ڈاکٹر کو بھگا دیا۔ وہ کیا سوچ رہا ہوگا۔"

"آج سے میں نے یہ سوچنا چھوڑ دیا ہے کہ دنیا کیا سوچے گی۔ بس اتنا جانتی ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

ایک خاتون نے کہا "ہاں بیٹی! اب تو والدین کا سایہ نہ رہا تمہیں اپنا اچھا برا خود سوچنا اور سمجھنا چاہیے۔"

دوسری نے سلمٰی کو خوش کرنے کے لیے کہا۔ "اپنی فیروزہ تو خوش نصیب ہے کہ ایسی پیار کرنے والی بھابی ملی ہے۔ اللہ نے چاہا تو سلمٰی بھابی اسے والدین کی کمی محسوس نہیں ہونے دے گی۔"

فیروزہ نے کہا "میں بھی آئندہ بھابی کو ساس کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گی۔"

سلمٰی نے واضح طور سے محسوس کیا کہ آج نند سہیلی کے پیچھے ساس بول رہی ہے۔ باپ کے مرتے ہی فیروزہ کے تیور بدل گئے ہیں۔ ویسے سلمٰی اندر سے بہت مطمئن اور بہت خوش تھی گھر کے دو قد آور پہاڑ گر چکے تھے۔ اب اس گھر کا اور دولت و جائداد کا مختار کل جواد ہو چکا تھا اور جواد کی مختار کل وہ خود تھی۔ اسے دولت جاگیر اور وہاں کی حکمرانی اچانک ہی مل گئی تھی۔

جواد آخری رسومات ادا کر کے قبرستان سے آگیا۔ تعزیت کو آنے والے رفتہ رفتہ رخصت ہوگئے۔ پنڈی اور لاہور سے آنے والے رشتے دار سوم تک وہاں رہنے آئے تھے۔ رات ہوتے ہی فیروزہ نے دروازے کو اندر سے بند کرلیا تاکہ کمرے میں کوئی نہ آئے۔ ایک آدھ بار دستک سنائی دی۔ اس نے جواب دیا نہ دروازہ کھولا۔ یہی تاثر دیتی رہی کہ سو رہی ہے۔

وہ سونے والی بات نہیں تھی۔ آج باپ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا تھا۔ وہ سونا بھی چاہتی تو نیند نہ آتی۔ دل چاہتا تھا اکبر آجائے اس کے سینے پر سر رکھ کر رونے سے دکھ کم ہوگا اور یہ استحکام حاصل ہوگا کہ والدین کے بعد سب سے مضبوط سہارا اپنا مرد ہی ہوتا ہے۔

اگرچہ اس بات کا غصہ تھا کہ وہ بچے کے لیے دشمن کے لہجے میں بول رہا تھا لیکن بولنے سے کیا ہوتا ہے؟ مرد غصہ دکھاتا ہے گالیاں دیتا ہے۔ کبھی مار ڈالنے کی دھمکیاں بھی دیتا ہے مگر کلیجے سے لگا کر پیار بھی تو کرتا ہے۔ وہ محبت سے سوچ رہی تھی کہ وہ آئے گا تو اسے اپنی طرح بچے سے بھی محبت کرنا سکھادے گی اور اس بات کا پورا یقین تھا کہ ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھنے کے بعد اکبر اسے بے یارومددگار دیکھ کر آتے ہی نکاح پڑھالے گا۔

آدھی رات کے بعد اس نے ایک چھوٹا سا کیسٹ ریکارڈ نکالا۔ والدین کی جدائی کا صدمہ دور کرنے اور ذہنی انتشار سے محفوظ رہنے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ اکبر کی یادوں میں پناہ لیتی رہے اور اس کی آواز سنتی رہے۔

اس کے پاس دس کیسٹ ایسے تھے جن میں اکبر کی اور اس کی اپنی آوازیں بھری ہوئی تھیں۔ جب وہ بند کمرے میں اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے آتا تھا۔ وہ اس کی آمد سے پہلے کیسٹ ریکارڈر چھپا کر رکھتی تھی۔ اگر وہ اکبر سے کہتی کہ محبت کی یادگار ملاقاتوں کو ریکارڈ کر رہی ہے تو وہ بھی دلچسپی لیتا اور بعد میں وہ آوازیں سنتا لیکن عورت کی فطرت ہے وہ بعد میں ایسی باتوں سے اور جذباتی آوازوں سے شرماتی ہے وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا محبوب بھی گزری ہوئی رومانی اور جذباتی ملاقاتوں کی روداد سنے۔ اس لیے اس نے ان آوازوں کو اس سے بھی چھپا کر رکھا تھا۔

وہ کانوں سے ائر فون لگا کر بستر پر لیٹ گئی۔ ریکارڈر کو اپنے سینے پر رکھ لیا۔ پھر بٹن کو دبایا چند ساعتوں تک خاموشی رہی وہ اکبر سے دوسری ملاقات والا کیسٹ تھا۔ اس رات

ہونے والی بارش کی دھیمی دھیمی سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بارش اور بادلوں کی گرج کے پس منظر میں اکبر کی واضح آواز ابھرنے لگی۔ ”میری جان! اس طوفانی بارش نے میرا راستہ روکنے کی بہت کوششیں کیں مگر تمہارا دیوانہ کسی کے روکنے سے رکنے والا نہیں ہے۔ آندھی طوفان سے لڑ کر آیا ہوں آؤ مجھے انعام دو۔“

فیروزہ نے ریکارڈ سے ابھرنے والی اپنی آواز سنی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”تمہاری یہی دیوانگی مجھے دنیا سے بیگانہ کردیتی ہے۔ پتا نہیں مجھے کیا ہوگیا ہے۔ آج میں نے تمہاری خاطر امی سے بھی گستاخی کی ہے ارے ارے یہ کیا کر رہے ہو۔ لباس تو بدلو سر سے پیر تک پانی سے بھیگے ہوئے ہو کیا مجھے بھی بھگونا چاہتے ہو۔“

”مجبوری ہے۔ جذبات کی بارش میں اپنے ساتھی کے ساتھ بھیگنا ہی پڑتا ہے۔“

”جی نہیں۔ میں نے موسم کو دیکھ کر سمجھ لیا تھا۔ کس حال میں آؤ گے اس لیے بھابی سے بھائی جان کی ایک دھوتی مانگ لائی ہوں۔ یہ لو اور اسے پہن لو۔“

اس کے بعد ریکارڈ خاموش ہوگیا۔ حالانکہ وہ آن تھا اور کیسٹ اپنی سست رفتاری سے چل رہا تھا۔ خاموشی اسی لیے تھی کہ وہ لباس بدل رہا تھا اور وہ منہ گھما کر پلنگ کے پاس آگئی تھی۔ بستر کے سرہانے بھی ایک چھوٹا ریکارڈ چھپا ہوا تھا۔ اس کمرے میں تین مختلف جگہوں پر ریکارڈنگ جاری تھی۔ وہ محدود چاردیواری میں جہاں بھی اس کے ساتھ وقت گزارتی رہی وہاں کی یادیں ہمیشہ کے لیے ریکارڈ ہوتی رہیں۔

وہ سنگدل لاہور گیا تھا۔ دو ماہ گزر چکے تھے اور واپس نہیں آیا تھا۔ ایسی جدائی کی راتوں میں وہ جاگتی رہتی تھی۔ پھر کمرے میں گھپ اندھیرا کرنے کے بعد اس کی یادوں اور آوازوں سے ملاقات کرتی رہتی تھی۔

جب اس کی آواز ابھرتی تو وہ اندھیرے میں صاف نظر آنے لگتا تھا۔ جو ریکارڈ بولتا تھا وہی خود بولتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ وہ ہاتھ بڑھاتی تھی مگر اسے چھو نہیں سکتی تھی۔ وہ پہلو میں ہوتا تھا مگر پہلو نہیں بھرتا تھا۔ وہ خالی رہ جاتی تھی۔ اندھیرے میں یہ آدھی ملاقات اندھیر کرتی رہتی تھی۔

پھر پتا نہیں وہ ڈیڑھ گھنٹے کا کیسٹ چلتے چلتے کب تھم جاتا تھا۔ اس کی یادیں اور اس کی ضرورتیں تھمنے کو نہیں آتی تھیں۔ صبح تک شور مچاتی رہتی تھیں۔

دوسرے شہروں سے آنے والے رشتے دار تین دنوں تک وہاں رہ کر رخصت ہوگئے۔ کوٹھی میں اب سلمٰی اور جواد کو اپنی طبعی عمر تک رہنا تھا۔ فیروزہ کے لیے وہ کوٹھی چڑیاں دا چنبہ تھی۔ سلمٰی سوچ رہی تھی ”یہ بھی یہاں سے اڑ جائے تو اچھا ہے۔ اب اس کی عزت کیا رہی ہے کہ میرا بھائی اسے اپنے خاندان کی عزت بنائے گا اور اس سے اپنی نسل پیدا کرائے گا۔ اس لیے فون پر بچے کو ختم کرنے کی بات کر رہا تھا۔ اب وہ یہاں آئے گا تو میں اس سے آخری فیصلہ سنوں گی۔ وہ اسے داشتہ بنا کر لے جائے یا میں کسی سے بھی اس کا

نکاح پڑھوا کر اپنے گھر سے دور کروں گی۔"

اکبر آگیا۔ اسے دیکھتے ہی فیروزہ پھٹ پڑی۔ غصے سے بولی "تم مجھ سے منہ کیوں چھپا رہے ہو؟ صاف صاف کہتے کیوں نہیں کہ دل میں کیا ہے؟"

اکبر دو ماہ بعد فیروزہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ حسین اور دل نشین لگ رہی تھی۔ وہ اتنے عرصے لاہور میں رہ کر اس کی طلب سے باز نہ آسکا تھا۔ روبرو آکر اس کا اور ضرورت مند بن گیا۔ اس نے کہا "فیروزہ میں منہ چھپانے والا بزدل نہیں ہوں۔ جب میں نے دیکھا کہ مقدمہ کی دلدل میں دھنستا جارہا ہوں اور تم سے مل نہیں پارہا ہوں تو رشوتیں دے کر پیشی کی لمبی تاریخ لے کر آرہا ہوں۔"

سلمٰی نے کہا "اکبر تم باپ بیٹے ایک مقدمہ سے نکلتے ہو اور دوسرے میں الجھتے ہو۔ یہ سلسلہ تو ساری زندگی جاری رہے گا۔ یہاں آئے ہو تو آخری فیصلہ کرو۔ میں فیروزہ کو اور بٹھاکر نہیں رکھوں گی۔ تم دیر کروگے تو میں اسے دوسری جگہ بیاہ دوں گی۔"

فیروزہ نے گھور کر پوچھا "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ یہ آپ جانتی ہیں میرے بچے کا باپ سامنے کھڑا ہے۔ پھر بھی کسی دوسرے سے میری شادی کا ارادہ کر رہی ہیں۔ کیا میں گھر میں بندھی ہوئی بھینس ہوں کہ رسا کھول کر جس کے ہاتھ میں چاہوگی مجھے تھما دوگی۔"

وہ بولی "میں ایک ہی بات جانتی ہوں کہ تمہارے ماں باپ کے بعد اس خاندان کی عزت اور شرافت کو قائم رکھنے کی ذمے داری میری ہے۔ اگر تم دونوں نے جلد ہی شادی نہ کی تو میں اپنے گھر میں ناجائز بچے کو پیدا نہیں ہونے دوں گی۔"

"آپا! تم تو گھر کی مالکن بن کر پٹاخے کی طرح بولنے لگی ہو۔ آخر کیوں نہیں بولوگی؟ کروڑوں کی جائداد کی مالکہ بن چکی ہو۔ مجھے اور فیروزہ کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینکنا چاہتی ہو۔ اب تم میں پہلی جیسی محبت اور مروت نہیں رہی۔"

"اتنی باتیں نہ کرو اکبر! دوٹوک فیصلہ سناؤ شادی اور اس بچے کا کیا ہوگا؟ تم نے کچھ تو سوچا ہوگا؟"

"ہاں سوچا ہے۔ مجھے اپنی فیروزہ پر پورا بھروسا ہے میں جو کہوں گا یہ مان لے گی۔ کل تک بچے سے نجات حاصل کرلے گی۔"

فیروزہ تڑپ کر بولی "ہرگز نہیں۔ مجھ پر ایسا بھروسہ نہ کرنا۔فوراً" شادی کروگے تو ہماری محبت کو جائز منزل ملے گی بچے کو مارنا چاہوگے تو محبت گناہ بن جائے گی۔"

"گناہ اور ثواب کے چکر میں نہ پڑو۔ دنیا والے ہم پر تھوکیں گے۔"

"ابا جان نے جس طرح مجھ پر تھوکا تھا اس طرح پوری دنیا نہیں تھوک سکے گی۔ میں رسوائی اور ذلت کی حد سے آگے نکل آئی ہوں۔ یہ بچہ سلامت رہے گا تم آج شام تک نکاح پڑھالو۔"

وہ بولا "شادی صرف ہمارا نہیں پورے خاندان کا معاملہ ہوتا ہے۔ یہ بچوں کا کھیل

نہیں ہے۔"

"یہ بچے کا ہی کھیل ہے۔ بچے کو میری اور تمہاری گود میں کھیلنے کا حق نہ ملا تو میری محبت تمہارے لیے مصیبت بن جائے گی۔"

"فیروزہ! مرد دھمکی نہیں سنتا۔ اس لیے ایک عورت کی حد میں رہ کر بات کرو۔"

وہ بولی "عورت تو میں صرف تمہاری محبت میں ہوں۔ ورنہ سیلاب بلا ہوں۔ کل اسی وقت تک نکاح نہ پڑھایا گیا تو میں پرسوں قانون داں خواتین کی انجمن میں جاؤں گی اور تمہیں شرعی عدالت میں بلاؤں گی۔"

دونوں بہن بھائی نے پریشان ہوکر اسے دیکھا۔ پھر اکبر نے کہا۔ "یہ کہنا آسان ہے کرنا مشکل ہے۔ کچھ جانتی بھی ہو شرعی عدالت میں ہم دونوں گناہ گار ٹھہرائے جائیں گے اور ہم دونوں کو سزائے موت دی جائے گی۔"

"جانتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ ہمارے بچے کو قانونی تحفظ ملے گا۔ اسے معصوم تسلیم کیا جائے گا۔ کیونکہ وہ ہمارے گناہ کا محرک نہیں ہے۔ ہم اس کی پیدائش کے محرک ہیں۔"

سلمٰی نے کہا "کیا پاگل ہوگئی ہو ساری دنیا میں رسوا اور ذلیل ہوکر سزائے موت پانا چاہتی ہو۔"

"میں عزت سے جیوں گی تو اکبر کے ساتھ۔ ذلت سے مروں گی تو اکبر کے ساتھ۔ میری زندگی کا اول اکبر میری زندگی کا آخر اکبر۔ یہ فیصلہ اکبر چوبیس گھنٹوں کے اندر کرے کہ کیسی زندگی یا کیسی موت چاہتا ہے؟"

وہ وارننگ دے کر وہاں سے جانے لگی۔ وہ بہن بھائی اسے گھور کر دیکھتے رہے جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو سلمٰی نے کہا "بات نہ بڑھاؤ اکبر! اس کے کمرے میں جاؤ اور کسی طرح اسے منالو۔"

"میں نے کبھی کسی عورت کو ہاتھ جوڑ کر نہیں منایا۔ جوتیوں کو ہمیشہ پیروں میں پہنا ہے سر پر نہیں رکھا۔ یہ مجھے کچھ زیادہ ہی پسند ہے اس لیے ذرا نخرے برداشت کرلیتا ہوں لیکن دھمکیاں سننے کے بعد اسے بھی جوتوں کی نوک پر رکھوں گا۔"

"میں جانتی ہوں تم اور ابا لڑنے جھگڑنے میں' خون خرابے میں اور مقدمے بازی میں کتنے زبردست ہو لیکن تم یہ نہیں جانتے کہ یہ لڑکی کیا بلا ہے؟ اسے محبت سے چاہے جس قدر لوٹ لو لیکن لوٹ مار کا احساس ہونے دوگے تو یہ ڈنکے کی چوٹ پر مصیبت بن جائے گی۔"

"لہٰذا میں اس مصیبت سے گھبرا جاؤں اور اس گھسی پٹی بچہ دینے والی سے شادی کرلوں؟ آپا! تم بھی مجھے غصہ دلا رہی ہو۔ کیا ہمارا خاندان ایسا ہے کہ منہ کالا کرنے والیاں بہو بن کر آسکیں؟ آپ اسے بلا سمجھتی ہیں نا؟ میں اس بلا کی اوقات بتاؤں گا۔ اگر وہ مجھے

بدنام کرنے کی حماقت کرے گی تو اسے بازار میں بٹھادوں گا۔"

وہ غصے میں تنتناتا ہوا چلا گیا۔ فیروزہ ان کی نظروں سے اوجھل ہوکر چھپی ہوئی تھی۔ اکبر کی باتوں نے اور رویے نے سمجھا دیا کہ چوبیس گھنٹے کا الٹی میٹم دے کر وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ ایسے دہشت گرد اور قاتل جاگیرداروں سے فوراً" بچاؤ کی تدبیر کرنی چاہیے۔

سب اپنے اپنے طور پر سوچ رہے تھے اور اپنی بہتری کے پیش نظر فیصلہ کر رہے تھے۔ سلمٰی کا آخری فیصلہ تھا کہ اکبر سے سمجھوتا ہو تب بھی اور نہ ہو تب بھی فیروزہ کو گھر سے جانا چاہیے۔ اگر دونوں کے درمیان اسی طرح بات بگڑتی رہی تو وہ بھی ان کے بیچ دلالی کرنے کے الزام میں پھنسے گی۔ اس سے پہلے ہی اپنے دامن کا دھبا دھو ڈالنا چاہیے۔

وہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی۔ دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر ریسیور اٹھا کر منگلا ڈیم آفس کے نمبر ڈائل کیے رابطہ قائم ہونے پر کسی نے پوچھا "آپ کون ہیں؟"

"میں بیگم جواد حسین بول رہی ہوں۔"

"جی بیگم صاحبہ! ابھی صاحب کو بلاتا ہوں۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر جواد کی آواز سنائی دی۔ وہ چاپلوسی کے انداز میں بولا "ہیلو سلمٰی رانی تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو ابھی تم سے بچھڑے ایک گھنٹہ چالیس منٹ ہوئے ہیں اور تم میرے بغیر نہیں رہ سکیں آخر فون پر بلا لیا۔"

"کیا مصیبت ہے آپ بولتے ہیں تو رکتے نہیں ہیں مجھے بھی کچھ بولنے کا موقع دیں۔"

"ہاں بولو سن رہا ہوں۔"

"ہم نے اس کوٹھی کو پیار کا محل بنایا ہے۔"

"ہاں بنایا ہے۔"

"اس محل میں تین ماہ بعد ہمارا بچہ جنم لینے والا ہے۔"

"بے شک ہم بہت بڑا جشن منائیں گے۔"

"لیکن اس سے پہلے ماتم کرنا ہوگا کیونکہ ہمارے گھر میں ایک ناجائز بچہ پیدا ہونے والا ہے۔"

"کیا بکتی ہو؟ کیسے پیدا ہونے والا ہے؟ کون پیدا کرنے والی ہے؟"

"تمہاری بہن فیروزہ۔"

وہ غصہ سے گرجنا چاہتا تھا مگر فوراً" ہی خیال آیا کہ دفتر میں ہے۔ اس نے دانت پیس کر دبی زبان سے پوچھا "فون پر کیا بکواس کر رہی ہو؟"

"اگر یہ بکواس ہوتی تو آپ کے گھر آنے کا انتظار کرلیتی لیکن سچائی انتظار نہیں کرتی۔ آپ شام تک آئیں گے تو خاندان کی بدنامی گھر سے باہر نہ جانے کہاں تک پھیل چکی ہوگی۔ آپ فوراً" اسی وقت آئیں۔"

"میں ابھی آرہا ہوں۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ سلمٰی نے ریسیور رکھ دیا۔ حالات بتا رہے تھے کہ اس خاندان میں بڑا فساد پھیلنے والا ہے۔ فیروزہ اکبر کو نہیں چھوڑے گی اور جواد فیروزہ کو مار پیٹ کر گھر سے نکالے گا اور اگر اکبر کو اپنی بدنامی اور قانونی گرفت میں آنے کا اندیشہ ہوگا تو وہ ماں کی طرح بیٹی کو بھی قتل کردے گا۔

ہر صورت میں سلمٰی کا فائدہ تھا۔ اس گھر سے نند کا کانٹا بھی نکلنے والا تھا۔ فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا اس نے ریسیور اٹھاکر کہا "ہیلو۔"

"آپا! میں اکبر بول رہا ہوں۔ ابھی غصہ میں چلا آیا تھا پھر عقل آئی کہ بھائی کو غیرت دلا کر بہن کا بچہ ضائع کرایا جاسکتا ہے۔"

"تمہیں دیر سے عقل آئی۔ میں ابھی یہ غیرت کا انجکشن جواد کو دے چکی ہوں۔ وہ غصہ میں ڈیوٹی چھوڑ کر آرہا ہے۔"

"آپا! تمہارا جواب نہیں ہے۔ آخر ہونا میری بہن بس ایک مہربانی اور کرو۔ جواد بھائی کے سامنے فیروزہ کی یہ بات کبھی تسلیم نہ کرنا کہ بچہ میرا ہے اور میں نے کبھی تنہائی میں فیروزہ سے ملاقات کی ہے۔"

"میں پاگل نہیں ہوں کہ تسلیم کرلوں گی۔ ایسا کرنے سے میں بھی پھنسوں گی کیونکہ تم میرے ہی کمرے سے گزر کر اس کے کمرے میں جاتے تھے۔"

"ہمیں پہلے سے طے کرلینا چاہیے کہ جواد بھائی کو کیا کہنا ہے۔ ہم دونوں کے بیان میں تضاد نہیں ہونا چاہیے۔"

وہ ایک دوسرے کے مشوروں سے ایک مخصوص اور مشترکہ بیان ترتیب دینے لگی۔ دونوں نے یہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ فیروزہ بچے کی خاطر جذباتی اور جنونی ہو رہی ہے۔ کسی طرح بچہ اس کی زندگی سے نکل جائے گا تو سارا جنون اور جذبے سرد پڑجائیں گے۔

بہن بھائی نے جواد کو متاثر کرنے اور اسے اپنا حمایتی بنائے رکھنے کا ایک منصوبہ بنایا۔ پھر بھائی نے کہا "میں اپنی کوٹھی میں ہوں جیسے ہی فون پر آنے کے لیے کہو گی میں چلا آؤں گا۔"

ان کا رابطہ ختم ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد جواد آگیا۔ کوٹھی میں داخل ہوتے ہی غصے سے آوازیں دینے لگا "فیروزہ! کہاں ہو فیروزہ! سامنے آؤ۔"

سلمٰی دوڑتی ہوئی اس کے پاس آکر بولی "آپ اس طرح گلا کیوں پھاڑ رہے ہیں کیا بدنامی کو گھر کے باہر پہنچانا چاہتے ہیں؟"

"تم چپ رہو۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میرا خون کھول رہا ہے۔"

"اور آپ کا خون میرے پیٹ میں پرورش پارہا ہے۔ آپ بہن کو قتل کرکے پھانسی پر چڑھ جائیں گے تو میرا اور میرے بچے کا کیا ہوگا۔"

وہ ذرا نرم پڑگیا وہ بولی "کسی گناہگار کو مار کر سزائے موت پانا اپنے بیوی بچے اور اپنا گھر برباد کرنا کہاں کی دانشمندی ہے؟"

"تو پھر میں کیا کروں؟"

"آپ عقل سے کام لیں اور بدنامی کو باہر پھیلنے سے پہلے ختم کردیں۔ بات ابھی گھر کی چاردیواری میں ہے۔ بچہ ختم ہو گا تو ذلت اور رسوائی کے تمام اندیشے ختم ہوجائیں گے۔"

"آخر یہ کس شیطان کا بچہ ہے؟"

"میں نے پوچھا تھا۔ وہ ہمیں اور ہمارے خاندان پر کیچڑ اچھال رہی ہے میرے بے گناہ بھائی کو الزام دے رہی ہے۔"

"تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ یہ الزام ہے۔ تمہارا بھائی کوئی معصوم فرشتہ نہیں ہے۔ ایک بار تم نے کہا تھا کہ وہ فیروزہ کو پسند کرتا ہے اور تم اسے بھابی بنانا چاہتی ہو۔"

"آپ کی بہن کو پسند کرنے اور اس کا رشتہ مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری نیت میں نیکی اور محبت ہے۔ گناہ کرنے والے رشتہ نہیں مانگتے۔ پھر میرا بھائی ایسی غلطی کیوں کرتا جبکہ آپ کی والدہ مرحومہ بھی اسے داماد بنانے کے لیے راضی تھیں؟"

وہ ٹھوس دلائل سن کر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر سوچنے لگا۔ سلمٰی نے پاس بیٹھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اب یہ گھر میرا ہے میں اس خاندان کے وارثوں کو پیدا کرتی رہوں گی۔ اس لیے خاندان کی عزت رکھنے کی خاطر اس حالت میں بھی فیروزہ کو بھابی بناؤں گی۔"

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ احسان مندی سے بیوی کو دیکھا پھر پوچھا "کیا اکبر اسے گناہ سمیت قبول کرلے گا؟"

"میں بڑی بہن ہوں' وہ میرا حکم نہیں ٹالے گا۔ آپ کو صرف بہنوئی نہیں بڑا بھائی سمجھتا ہے آپ کے سامنے سر جھکا کر فیروزہ کو قبول کرلے گا۔"

"واقعی تم ایک عظیم شریک حیات ہو۔ تمہاری جیسی بہویں سسرال کی عزت اور عظمت کا پرچم بن کر رہتی ہیں۔"

"لیکن ایک بات ہے۔ ہمارے خاندان کے بزرگوں کو نہ معلوم ہو کہ فیروزہ نے شادی سے پہلے کہیں منہ کالا کیا تھا۔"

"ہرگز نہیں معلوم ہوگا۔ ہم یہ بات ساری دنیا سے چھپائیں گے۔"

"چھپانے کے لیے بڑی رازداری سے بچے کو ختم کرنا ضروری ہے لیکن فیروزہ اس کے لیے راضی نہیں ہے۔"

وہ گرجتے ہوئے اٹھ کر بولا "راضی کیسے نہیں ہو گی؟ اس کا باپ بھی راضی ہو گا یہ غلاظت میرے گھر میں نہیں پلے گی کہاں ہے وہ؟"

"شاید اپنے کمرے میں ہے۔"

وہ ادھر جانے لگا۔ سلمٰی پیچھے پیچھے چلتی ہوئی بولی "آپ دماغ ٹھنڈا رکھیں اور خیال رکھیں اندر کی آواز باہر نہ جائے۔"

وہ دونوں آگے پیچھے فیروزہ کے دروازے پر آئے' جواد نے دھیمی آواز میں ڈپٹ کر کہا "فیروزہ! باہر آؤ۔"

سلمٰی نے آگے بڑھ کر دستک دی تو پتا چلا' وہ بند نہیں ہے۔ ذرا سا کھل گیا تھا۔ انہوں نے پوری طرح کھول کر دیکھا کمرا خالی تھا۔ سلمٰی نے باتھ روم کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ فیروزہ وہاں بھی نہیں تھی۔

وہ پلٹ کر کمرے میں آئی۔ بستر کی چادر پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ تکیے کے پاس ایک چھوٹا ریکارڈر اور دو کیسٹ پڑے ہوئے تھے۔ جواد نے غصے سے کہا "بے حیا' بے شرم' یہاں فلمی گانے سن رہی تھی۔ پتا نہیں کہاں گئی ہے۔"

وہ بستر سے دور تھا۔ سلمٰی نے قریب سے گزرتے ہوئے یونہی کیسٹ پر نظر ڈالی تو ایک دم سے گھبرا گئی۔ دونوں کیسٹوں پر لکھا ہوا تھا "اکبر میرا دلبر۔"

وہ فوراً" ہی جواد کے پاس آکر اس کا بازو تھام کر اسے کمرے سے لے جاتے ہوئے بولی "آپ اپنے کمرے میں چل کر لباس تبدیل کریں۔ میں فیروزہ کے کمرے کی تلاشی لوں گی۔ کوئی ایسی چیز مل سکتی ہے جس سے اس شخص کا پتا چل سکتا ہے جس کا نام وہ چھپا رہی ہے۔"

وہ بولا "مجھے بھی تلاشی میں تمہاری مدد کرنی چاہیے۔"

"ہرگز نہیں وہاں بہن کی ایسی کوئی چیز برآمد ہوسکتی ہے جسے بھائی کو نہیں دیکھنا چاہیے۔"

اس نے قائل ہوکر سر ہلادیا۔ وہ اسے اپنے بیڈ روم میں چھوڑ کر فیروزہ کے کمرے میں آئی۔ دروازے کو اندر سے بند کرکے تیزی سے کیسٹوں کے پاس آئی پھر ایک کیسٹ کو ریکارڈر میں لگایا۔ اس میں سیل موجود تھے اس نے بٹن دبا کر اسے آن کیا اور آواز کو بہت دھیما رکھا تاکہ کوئی بات باہر تک نہ جائے۔

ریکارڈر سے بہت دھیمی آواز ابھری۔ سلمٰی نے اسے کان سے لگا لیا۔ فیروزہ کی آواز آرہی تھی "ہیلو بھابی سہیلی! میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوچکی ہوں۔ یہ اچھی طرح جانتی ہوں کہ اپنے بھائی کے خلاف میرا چیلنج سن کر تم میرے کمرے میں ضرور آؤگی۔ اسی لیے دونوں کیسٹوں پر اکبر کا نام لکھ دیا ہے۔ یقیناً" تمہارا تجسّس بڑھ گیا ہوگا۔ اور شاید اب تم اسے سن رہی ہو۔"

ایک ذرا توقف سے پھر آواز ابھری "ضرور سنو۔ آگے جو باتیں اور ہوس کی گھاتیں ہیں انہیں شرعی عدالت بھی سنے گی۔ ایسے دس کیسٹ ہیں اور ان کی ماسٹر کاپیاں میرے بینک کے لاکر میں ہیں۔ ابھی میں قانونی چارہ جوئی کے لیے جہلم وومنز لائرز ایسوسی ایشن میں

جارہی ہوں۔ میری واپسی تک یہ کیسٹ سماعت فرماؤ۔"

فیروزہ کی یہ تمہید ختم ہوتے ہی ریکارڈر سے بجلی کے کڑکنے اور بادلوں کے گرجنے کی آوازیں سنائی دیں۔ بارش کی رم جھم بھی سنائی دے رہی تھی۔ پھر اکبر اور فیروزہ کی باتیں ابھرنے لگیں۔ سلمٰی کے دیدے حیرانی اور پریشانی سے پھیل گئے۔ کیونکہ ان کی باتوں سے ثابت ہو رہا تھا کہ اکبر بارش میں بھیگتا ہوا رکاوٹیں توڑتا ہوا فیروزہ کی تنہائی میں آیا ہے اور فیروزہ نے اپنی بھابی سے جواد کی ایک دھوتی مانگ کر رکھی ہے تاکہ اکبر کیلئے کپڑوں میں نہ رہے۔

یعنی ایسی ایسی باتیں ہو رہی تھیں اور دونوں کی زبان سے ایسے اعترافات ہو رہے تھے جنہیں سن کر ثابت ہو جاتا تھا کہ دونوں کی گناہگار ملاقاتوں کا سہرا سلمٰی کے سر ہے اور جب سلمٰی ان کی معاون رہی ہے ...تو پھر وہ اپنی بہن کے کمرے سے گزر کر ہی فیروزہ کے کمرے میں پہنچتا ہوگا۔

اگرچہ ان کیسٹوں میں پیار بھری شاعرانہ گفتگو بھی تھی اور کچھ بے حیائی کے اشارے بھی تھے لیکن مجموعی طور پر یہ ثبوت مل جاتا تھا کہ فیروزہ اور اکبر گناہگار ہیں اور بہرحال گردن زدنی ہیں۔

اور سب سے زیادہ دل دہلا دینے والی بات یہ تھی کہ سلمٰی کے بیان کے مطابق برسات کی اس رات جب ساس کا قتل گلی میں ہوا تھا' کوئی ان کی کوٹھی میں نہیں آیا تھا۔ جبکہ کیسٹ میں بارش کی آواز بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج سنائی دیتی تھی۔ پھر اکبر کے رخصت ہوتے وقت فیروزہ نے کہا تھا "تھوڑی دیر اور رک جاؤ۔ شاید بارش تھم جائے۔"

اکبر نے کہا "رات کے تین بج گئے ہیں بارش کے تھمنے کا انتظار کرتا رہا تو صبح ہوجائے گی۔"

یوں تو انہوں نے اور بہت سی باتیں کی تھیں لیکن اتنا ہی کافی تھا کہ اکبر نے رات کے تین بجے اس کوٹھی سے نکلنے کا اعتراف کیا تھا اور ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق بیگم عنایت حسین کا قتل رات کے تین اور چار بجے کے درمیان ہوا تھا۔

سلمٰی نے ریکارڈر کو آف کردیا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ درودیوار گھومتے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ اگرچہ فیروزہ اور اکبر کی طرح اسے سزائے موت نہ ملتی لیکن وہ گناہ کے لیے سہولتیں پیدا کرنے اور ساس کے قتل کے سلسلے میں تعاون کرنے کی مجرم تھی تھوڑی بہت سزا ضرور ہوگی۔ جیل کی چار دیواری مقدر میں لکھی جائے گی۔ پھر جواد اپنی ماں کے قاتل کی شریک کو طلاق بھی دے سکتا تھا۔

فیروزہ نے ایک ہی جھٹکے میں دن کو تارے دکھادیے۔ ساس اور سسر کے مرنے کے بعد وہ کروڑوں کی جائداد کی مالکہ بن گئی تھی اب وہ ملازمہ بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ طلاق کے بعد سماجی حیثیت بھی صفر ہونے کو تھی۔ جیل جاکر مجرمہ ہونے کا داغ لگنے والا تھا بچہ

بھی جواد لے لیتا۔ نند کی کوکھ اجاڑنے والی اپنا ہی بچہ ہارنے کو تھی۔ آج تک کسی پہلوان نے کسی پہلوان کو اس بری طرح نہیں پچھاڑا تھا جیسے فیروزہ نے اسے پچھاڑ کر رکھ دیا تھا۔

اس کا دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ دیر نہ کرے فوراً" اپنے بچاؤ کی تدبیر کرے۔ ورنہ دو کوڑی کی نہیں رہے گی۔ اس نے دونوں کیسٹوں کو اٹھا کر اپنے لباس میں چھپالیا فیروزہ نے کہا تھا دس کیسٹیں ہیں۔ وہ باقی کیسٹیں تلاش کرنے لگی۔ کیسٹ کی ریک میں رکھے ہوئے ایک ایک کیسٹ کو الٹ پلٹ کر سننے لگی۔ غزل اور گیتوں کی آوازیں آتی رہیں لیکن کوئی مطلوبہ کیسٹ نہ ملا۔

وہ مایوس ہوکر سوچنے لگی۔ ان حالات میں کیا کرنا چاہیے؟ وہ چھوٹا ریکارڈر اٹھا کر کمرے سے باہر آئی۔ اپنے کمرے کی طرف دیکھا وہاں جواد اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ وہ اکبر کو فون کے ذریعے صورت حال سے آگاہ کرنا چاہتی تھی اور یہ میاں کی موجودگی میں نہیں ہوسکتا تھا۔

وہ تیزی سے چلتی ہوئی مرحوم ساس سسر کے کمرے میں آئی' وہاں دوسرا ٹیلیفون تھا۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ اپنے لباس کے اندر سے ایک کیسٹ نکال کر اسے ریکارڈر میں لگایا پھر فون کے ذریعے رابطہ کیا وہ دوسری طرف منتظر تھا۔ رابطہ قائم ہوتے ہی بولا "ہیلو آپا! کیا ہوا؟"

"میری بربادی کا سامان ہوگیا ہے اور تم بھی اپنی حماقت سے سزائے موت تک پہنچنے والے ہو۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ کیسی سزائے موت؟ میں نے ایسی کیا حماقت کی ہے؟"

"تم جب بھی فیروزہ سے تنہائی میں ملنے جاتے تھے' اپنی اور اس کی باتیں کیسٹ میں ریکارڈ کراتے رہتے تھے۔"

"یہ جھوٹ ہے میں نے فیروزہ کے کمرے میں کبھی کوئی ریکارڈر نہیں دیکھا تھا پھر وہ ریکارڈ کیسے کرتی۔"

"اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو اس نے تم سے چھپا کر تمام ملاقاتوں کو ریکارڈ کیا ہے۔ لو ذرا نمونہ سنو۔"

اس نے ریسیور کے ماؤتھ پیس کو ریکارڈر کے پاس لاکر آن کردیا۔ تقریباً" دس منٹ تک سنانے کے بعد اسے بند کرکے ریسیور کان سے لگا کر پوچھا "کیا سنا؟ اور کیا سمجھا؟"

"یہی سمجھا کہ اس کیسٹ سے گناہگار ثابت ہوجاتا ہوں۔"

"پورا کیسٹ سنوگے تو معلوم ہوگا کہ گناہ کے راستے میں ہموار کر رہی ہوں۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ وہی رات ہے جب میری ساس کا قتل ہوا تھا۔ آگے جاکر تم نے اعتراف کیا ہے کہ تم تین بجے رات کو اس کوٹھی سے باہر آرہے ہو اور ڈاکٹری رپورٹ کہہ چکی ہے کہ وہ قتل تین اور چار بجے کے درمیان ہوا تھا۔"

"اوہ مائی گاڈ! وہ تو ہمیں بری طرح پھنسانا چاہتی ہے۔"

"پھنسانا چاہتی ہے نہیں وہ ایسا کرچکی ہے۔ اس وقت جہلم وومنز لائرز ایسوسی ایشن میں بیٹھی ہے اس سے پہلے کہ وہ ہمیں شرعی عدالت میں گھسیٹے اسے روک لو محبت سے روک لو یا عدالت سے کسی طرح بھی اپنی اور میری جان بچاؤ۔"

"درست کہتی ہو۔ اب تو بچاؤ کے لیے کچھ بھی کرنا ہوگا۔ میں اس سے ملنے جارہا ہوں۔"

چودھری اکبر علی نے بہن سے رابطہ ختم کرکے انکوائری سے ایڈووکیٹ بشریٰ ربانی کے فون نمبرز معلوم کیے۔ پھر ان کے مطابق ڈائلنگ کی۔ رابطہ ہونے پر ایک خاتون کی آواز سنائی دی وہ بولا "ہیلو میں چودھری اکبر علی ہوں۔ ایڈووکیٹ بشریٰ صاحبہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اسے انتظار کرنے کے لیے کہا گیا۔ بڑی دیر انتظار کرنے کے بعد دوسری آواز سنائی دی "ہیلو میں بشریٰ ربانی بول رہی ہوں کیا آپ واقعی چودھری اکبر علی ہیں؟"

"جی ہاں میں ہی وہ ناچیز بندہ ہوں۔"

"تعجب ہے آپ تو بڑی جلدی دوڑ پڑے۔ ابھی تو ہم حدود آرڈیننس کے مطابق ابتدائی کاغذات تیار کررہے ہیں۔"

وہ پریشان ہوکر بولا "دیکھیے محترمہ! پلیز یہ معاملہ ابھی اپنی ہی حد تک رکھیں۔ اسے آگے نہ بڑھائیں مجھے فیروزہ سے سمجھوتا کرنے کا ایک موقع دیں۔"

"آپ کس قسم کا سمجھوتا کرنا چاہتے ہیں؟"

"میں اس سے ایک بار ملاقات کرکے کسی نتیجے پر پہنچ کر ہی آپ کے سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔"

"پلیز ہولڈ آن۔"

دوسری طرف سے خاموشی رہی۔ تھوڑی دیر بعد پھر آواز آئی۔ "ہیلو چودھری صاحب! آپ دو گھنٹے بعد فیروزہ کے بھائی اور بھابی کے پاس ان کی کوٹھی میں جائیں وہیں فیروزہ سے ملاقات ہوگی۔"

"لیکن میں اس سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں۔"

"نو مور آرگومنٹس اینڈ ڈیٹس آل۔"

ادھر سے فون بند کردیا گیا چودھری اکبر نے ہیلو ہیلو کہہ کر کئی بار پکارا۔ پھر جھنجلا کر ریسیور پٹخ دیا۔ صوفے سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

وہ سوچ رہا تھا "فیروزہ ذہین اور ضدی ہے مگر اتنی چالاک دکھائی نہیں دیتی تھی جتنی چالاکی اب دکھا چکی ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ مجھ سے چھپا کر خلوت کدے کی تمام باتیں ریکارڈ کرسکتی ہے۔"

حقیقتاً وہ چالاک نہیں تھی۔ اس نے عداوتی ارادوں سے ایسا نہیں کیا تھا۔ دراصل وہ فطرتاً رومانی اور جذباتی لڑکی تھی۔ عام طور پر محبوب کو یاد کرتے رہنے کے لیے اس کی کوئی نشانی یا خطوط وغیرہ سنبھال کر رکھے جاتے ہیں۔ فیروزہ نے جدید سہولتوں کے مطابق کیسٹس میں اس کی یادوں اور ملاقاتوں کو محفوظ کیا تھا اور اکبر کو محض شرم و حیا کے باعث رومانی اور جذباتی لمحات کی ریکارڈنگ کے متعلق نہیں بتایا تھا۔

عورت شہد کی مکھی ہے، نہ چھیڑو تو شہد دیتی ہے چھیڑو تو زہریلے ڈنک مارتی ہے۔ وہ شرم سے جیتی ہے اور شرم سے مرجاتی ہے اگر یہ شرم چھین لی جائے اور اسے آبرو باختہ کہا جائے تو پھر وہ شرم کو بالائے طاق رکھ کر اپنا ننگا چہرہ لے کر اپنے یار کو سنگسار کے مقام پر لے آتی ہے۔ اس نے جن کیسٹس کو شرم و حیا کے باعث اپنے محبوب سے بھی چھپایا تھا اب انہیں سرعام لاتے ہوئے نہیں شرما رہی تھی۔ اس عزم اور حوصلے کے ساتھ کہ یہ بے رحمی اس کی اولاد کو تحفظ دے گی۔

چودھری اکبر علی اپنے کمرے سے باہر آیا۔ پھر تیزی سے چلتا ہوا کوٹھی کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا اپنے باپ کے کمرے کے سامنے آیا اور دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑا۔ پھر ایک خوب صورت کنیز نے اندر سے دروازہ کھولا اور اسے جھک کر سلام کیا۔

اس نے اندر آکر دیکھا۔ باپ شاہانہ طرز کے پلنگ پر شاہانہ انداز میں نیم دراز تھا۔ دوسری خوب صورت کنیز اس کے پاؤں داب رہی تھی۔ اس نے بیٹے کو دیکھ کر کہا "آؤ بابا کی جان! کیا بات ہے؟"

وہ قریب آتے ہوئے بولا "بابا جانی! میں ایک معاملے میں بری طرح پھنس رہا ہوں۔ اندیشہ ہے کہ حدود آرڈیننس کی زد میں آجاؤں گا۔"

"معاملہ کیا ہے؟"

وہ پوری تفصیل سے اپنی اور فیروزہ کی روداد سنانے لگا۔ چودھری قاسم علی ایک شاہ کے انداز میں جیسے فریاد سن رہا تھا اور ہوں ہوں کہتا جارہا تھا۔ اس نے تمام روداد سننے کے

بعد کہا "تم نے ہماری بیٹی اور اپنی بہن کے سسرال میں یہ گڑ بڑ کی ہے اس لیے پھنس گئے ہو۔ وہاں تم نے صرف عیاشی ہی نہیں کی ایک قتل بھی کیا ہے یہ کسی دوسرے گھر کی بات ہوتی تو ہم ماں کے بعد بیٹی کا بھی صفایا کردیتے لیکن دو باتیں تمہارے حق میں نہیں ہیں۔"

وہ ذرا چپ ہوا پھر بولا "ایک تو یہ کہ فیروزہ تم سے زیادہ تیز رفتار ہے۔ جو ارادہ کرتی ہے فوراً اس پر عمل کرتی ہے۔ یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے لاکر میں صرف دس کیسٹیں ہیں اس کا یہ تحریری بیان بھی ہوسکتا ہے کہ اس کی ماں کے قتل کی رات تم وہاں موجود تھے۔ تم نے اسے بھی قتل کی دھمکی دی ہے۔ لہٰذا جب بھی اس کی غیر طبعی موت ہوگی وہ تمہارے ہاتھوں ہوگی۔"

وہ بولا۔ "جی ہاں۔ ایڈووکیٹ بشریٰ ربانی نے اسے کچھ اور داؤ پیچ بتائے ہوں گے۔"

چودھری نے کہا "دوسری بات جو تمہارے حق میں نہیں ہے' وہ ہماری بیٹی سلمیٰ کی بربادی ہے۔ وہ کروڑوں روپے کی جائداد کی مالک اور چودھرائن بن چکی ہے۔ ہم باپ بیٹے فیروزہ کے خلاف کوئی قدم اٹھانے میں غلطی کریں گے تو ہماری سلمیٰ عزت اور عظمت کی بلندیوں سے ذلت کی پستیوں میں آگرے گی۔"

"بابا جانی! پھر تو ایک ہی راستہ ہے فیروزہ سے نکاح پڑھانا ہوگا۔"

باپ نے گھور کر دیکھا۔ بیٹے نے جلدی سے ہچکچاتے ہوئے کہا "میں اسے آپ کی بہو نہیں بنانا چاہتا۔ میں تو آپ کے اصولوں پر چلتا ہوں۔ جو داشتہ کے طور پر مل رہی ہو اسے صرف احمق ہی بیوی بناتے ہیں۔"

"ہوں' تم سلمیٰ کے گھر جاؤ۔ فیروزہ تم سے وہاں ملاقات کرنے والی ہے۔ دیکھو کہ وہ کیا کہتی ہے' کس حد تک تمہاری بات مان کر بچے کو ختم کرسکتی ہے۔ اگر وہ نہ مانے اور قانونی طور پر مضبوط دکھائی دے تو اس سے شادی کے لیے راضی ہوجاؤ۔"

"مگر بابا جانی! شادی کے بعد بھی وہ ہمارے اعصاب پر سوار رہے گی۔ میں یہ برداشت نہیں کروں گا کہ وہ میری مردانگی کے لے گالی بن جائے۔"

"وہ گالی نہیں بنے گی۔ اعصاب پر سوار نہیں ہوگی۔ جاؤ اور اس سے وعدہ کرو کہ کل تم مختصر سی برات لے کر آؤ گے میں ... چودھری قاسم علی بھی اسے اپنی بہو بنانے آؤں گا۔"

"کیا واقعی بابا جانی؟"

"ہاں کل ہم وہاں جائیں گے لیکن نکاح پڑھانے کی نوبت نہیں آئے گی۔"

"کیا آپ فیروزہ کو ..."

"نہیں۔ کسی کا قتل نہیں ہوگا' جو ہوگا' وہ کل دیکھو گے اب جاؤ یہاں سے۔"

وہ باپ کو سلام کرکے اپنے کمرے میں واپس آیا۔ دیر تک سوچتا رہا کہ ایسی کیا بات ہوگی کہ برات آئے گی اور نکاح نہیں پڑھایا جائے گا۔ اسے اپنے باپ کی جاگیردارانہ چالوں پر پورا بھروسا تھا اور وہ یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ اس معاملے میں خون خرابا نہیں ہوگا۔

وہ دو گھنٹے بعد فیروزہ سے ملنے آیا۔ سلمیٰ نے دروازہ کھولا بھائی کو دیکھ کر آہستگی سے بولی "جواد اپنے کمرے میں ہیں۔ تم مجھ سے یہیں باتیں کرو اور بتاؤ فیروزہ کے معاملے میں کیا کر رہے ہو؟ کیا اس سے ملے تھے؟"

"ایڈووکیٹ بشریٰ سے فون پر بات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ دو گھنٹے بعد یہاں مل سکتی ہے اسی لیے ملنے آیا ہوں۔"

"وہ تو ابھی تک نہیں آئی پتا نہیں کیا کرتی پھر رہی ہے۔"

"فکر نہ کرو آپا! سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"کیا ٹھیک ہوجائے گا؟ میرا گھر اجڑنے والا ہے میرا شوہر چھوٹنے والا ہے۔ اس لڑکی کو اپنی اور خاندان کی عزت کی پرواہ نہیں ہے۔ وہ عدالت میں ہم سب کو ننگا کردے گی۔ میں دونوں ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں خدا کے لیے ابھی قاضی کو بلا کر اس سے نکاح پڑھالو۔ اپنے ہونے والے بچے کو قبول کرلو۔ تم اپنے گھر خوش رہو ہمیں اپنے گھر خوش رہنے دو۔"

وہ بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا "ہم سب خوش رہیں گے بابا جانی اس معاملے میں کچھ کرنے والے ہیں۔ فی الحال یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ ہمارے خلاف کیا کرتی پھر رہی ہے۔"

اسی وقت کال بیل کی آواز سنائی دی۔ اکبر نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے فیروزہ کھڑی ہوئی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں پھر وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ فیروزہ اندر آئی۔ سلمیٰ اسے گلے لگانے کے انداز میں آگے بڑھتی ہوئی بولی "میری سہیلی کہاں چلی گئی تھی؟ میں کب سے انتظار کر رہی ہوں۔"

وہ ہاتھ اٹھا کر بھائی کو قریب آنے سے روکتی ہوئی بولی "دور سے باتیں کرو۔ تمہارے خاندان والوں کو گلے لگا کر گلا کاٹنا خوب آتا ہے۔"

جواد نے ڈرائنگ روم میں آتے ہوئے کہا "اچھا اکبر آیا ہے" پھر فیروزہ کو دیکھ کر پوچھا "تم کہاں گئی تھیں؟ میرے ساتھ آؤ۔ میں تنہائی میں ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

فیروزہ کے ہاتھوں میں ایک فائل تھی۔ اس نے فائل میں سے ایک کاغذ نکال کر جواد کو دیتے ہوئے کہا "پہلے آپ اسے پڑھ لیں اس کے بعد ضروری ہوا تو آپ سے تنہائی میں باتیں کروں گی۔"

جواد وہ کاغذ لے کر پڑھنے لگا۔ فیروزہ نے ایسا ہی دوسرا کاغذ سلمیٰ کو اور تیسرا کاغذ اکبر کو دیا۔ سب اسے توجہ سے پڑھنے لگے۔ جہلم وومنز لائر ایسوسی ایشن کی چیئرمین ایڈووکیٹ بشریٰ ربانی نے چودھری اکبر علی اور جواد حسین کے نام وہ قانونی نوٹس ارسال کیا تھا۔ وہ اس نوٹس کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں پڑھ رہے تھے۔

تحریر کچھ یوں تھی کہ فیروزہ بنت چودھری عنایت حسین مرحوم نے ایڈووکیٹ بشریٰ ربانی کو اپنا وکیل مقرر کیا ہے۔ موکلہ نے جو تحریری بیان دیا ہے اس کے مطابق چودھری

اکبر علی نے اسے عشق و محبت کے سبز باغ دکھائے۔ شادی کا وعدہ کیا۔ اب یہ موکلہ تین ماہ سے حاملہ ہے۔ چودھری اکبر علی کا رویہ منفی ہوگیا ہے۔ وہ شادی کے معاملے کو ٹال رہا ہے اور اس کے حمل کو ضائع کرنے پر بضد ہے۔

اس سلسلے میں حسب ذیل نکات قابل توجہ ہیں۔

میری موکلہ نے محبت میں گناہ گار بن جانے کا تحریری اعتراف کیا ہے اور ایسے آڈیو کیسٹس کے ڈپلیکیٹس پیش کیے ہیں جن میں چودھری اکبر علی بھی برابر کا گناہ گار ثابت ہوتا ہے۔

جہلم وومنز ایسوسی ایشن کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مظلوم خواتین کو آسان طریقہ کار کے ذریعے انصاف ملے۔ گھریلو اور خاندانی جھگڑے اور ان سے پیدا ہونے والے شرمناک معاملات عدالت میں نہ جائیں اور ہماری میز پر ہی فریقین میں صلح صفائی ہوجائے۔

لہٰذا مسمی جواد حسین سے درخواست ہے کہ وہ اپنی بہن فیروزہ کو انصاف دلانے کے لیے اس سے ہمدردی اور ہم سے تعاون کریں۔

اور مسمی چودھری اکبر علی سے درخواست ہے کہ وہ عداوت کا رویہ اختیار نہ کرے۔ وہ بچہ جو دنیا میں آنے والا ہے، اس کی ہلاکت کا مرتکب نہ بنے۔

اس ضمن میں موکلہ فیروزہ کی ایک تحریری درخواست موجود ہے جس میں موکلہ نے یقین سے لکھا ہے کہ اس کی اور بچے کی جان کو چودھری اکبر علی سے خطرہ ہے۔ اگر کبھی غیر طبع موت ہوگی تو میری ایسی موت کا ذمے دار چودھری اکبر علی کو ٹھہرایا جائے۔

اور یہ کہ موکلہ کی موت کے بعد اس کے بینک لاکر کو کھولنے اور تمام کیسٹس اور اہم کاغذات کو اپنی تحویل میں لینے کا حق صرف ایڈووکیٹ بشریٰ ربانی کو ہے۔

اب یہ چودھری اکبر علی کی صوابدید پر ہے کہ وہ مندرجہ بالا حقائق کے پیش نظر کون سی راہ اختیار کرتا ہے۔

ہمارا مشورہ ہے کہ وہ اس نوٹس کے جاری ہونے کی تاریخ سے دو دن کے اندر ہماری موکلہ فیروزہ سے نکاح پڑھالے اور تحریری طور پر فیروزہ کی جان و مال کا اور اس کے سماجی اور ازدواجی حقوق کا ضامن رہے۔

اگر ہمارا مشورہ چودھری اکبر علی کے لیے قابل قبول نہ رہا تو دو دن کے بعد اس معاملے کو باقاعدہ مقدمے کی شکل دے کر عدالت میں پہنچا دیا جائے گا۔"

اکبر، سلمٰی اور جواد وہ کاغذات پڑھتے پڑھتے بیٹھ گئے تھے پھر اس کے اختتام پر اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ جواد نے کہا "تم اپنے بھائی کے کالے کرتوت چھپا رہی تھیں۔ کیا اسے پڑھنے کے بعد اپنے جھوٹ اور مکاری سے انکار کروگی؟"

وہ بولی "آپ میرے مجازی خدا ہیں۔ مجھ سے جو غلطیاں ہوئیں اس کے لیے آپ مجھے سو جوتے ماریں لیکن پہلے خاندان کی عزت بچانے کی بات کریں۔"

وہ بیوی کی بات سے قائل ہوکر فیروزہ سے بولا "تمہیں کسی ایڈووکیٹ کے پاس جانے کی ضرورت کیا تھی؟ کیا میں مرگیا تھا؟ کیا تم مجھ سے نہیں کہہ سکتی تھیں؟"

سلمٰی نے کہا "جو باتیں ایک بھائی کو کہنے کی نہیں ہوتیں کیا وہ باتیں یہ آپ سے کرتی؟ پہلے عقل سے تولا کریں پھر بولا کریں۔ ہماری فیروزہ نے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔ ابھی اس معاملے کو عدالت تک نہیں لے گئی ہے۔ ابھی یہ قانون کی زبان سے اکبر کو سمجھا رہی ہے۔"

اکبر سر جھکائے کھڑا تھا۔ فیروزہ کے سامنے کمزور پڑ کر اپنی توہین محسوس کر رہا تھا۔ شکست کی وجہ سے توہین ہوتی ہے لیکن وہ عورت کی وجہ سے بے عزتی محسوس کر رہا تھا۔ مرد نے عورت کو اس قدر اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے کہ کسی معاملے میں اس سے کمتر ہونا نہیں چاہتا۔ اپنی دانستہ غلطیوں کے باوجود برتر رہنا چاہتا ہے اور یہ سراسر تکبر ہے انسانی تدبر نہیں ہے۔

اس نے سر اٹھا کر سلمٰی سے کہا "آپا! یہ بات آگے نہیں بڑھے گی میں کل صبح دس بجے بابا جانی کے ساتھ قاضی صاحب کو لے کر آؤں گا' چار بندے ہمارے ہوں گے اور چار تمہارے' پھر میں نکاح پڑھا کر فیروزہ کو اپنی شریک حیات بنالوں گا۔"

فیروزہ نے اپنے محبوب کو پالینے کی مسرتوں سے نہال ہوکر اسے دیکھا لیکن اکبر کو یوں لگا وہ اس کی شکست پر مسکرا رہی ہے۔ وہ غصہ سے پلٹ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد جواد نے کہا "میری لاعلمی میں جو کچھ ہوا وہ میرے لیے شرم کی اور ڈوب مرنے کی بات ہے۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ معاملہ عزت آبرو سے نمٹ رہا ہے۔"

سلمٰی نے فیروزہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "آج میں بہت خوش ہوں میری سہیلی کل یہاں سے دلہن بن کر جائے گی۔"

"بھابی! میں دلہن ضرور بنوں گی مگر یہاں سے نہیں جاؤں گی۔"

"لیکن شادی کے بعد دلہن سسرال جاتی ہے۔"

"اس لیے جاتی ہے کہ بے چاری دلہنوں کو پہلے سے سسرال کا جغرافیہ معلوم نہیں ہوتا ہے۔ جبکہ میں جانتی ہوں وہاں میری ایک سوکن اور دو سوتیلے بچے ہیں۔ ایک ایسا چالاک سسر ہے جو زمینیں حاصل کرنے کے لیے صغریٰ جیسی بے یارومددگار لڑکی کو بہو بنا کر کچرے کی طرح کہیں پھینک دیتا ہے۔ اور کسی تقریب وغیرہ میں بہو کو خاندانی اور سماجی مان مرتبہ نہیں دیتا ہے۔ ایسا سسر میرے ساتھ کیسا سلوک کرے گا یہ میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں اور یہ جو میرا مجازی خدا بننے والا ہے اسے تو میں شادی سے پہلے ہی اچھی طرح سمجھ چکی ہوں۔"

سلمٰی چپ چاپ اپنے باپ اور بھائی کی بے عزتی برداشت کر رہی تھی اس کے سوا کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ فیروزہ نے کہا "اس لیے کل نکاح کے بعد میں اسی گھر میں

رہوں گی۔ پھر اکبر اسی شہر میں میری رہائش کا الگ انتظام کریں گے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس رات سلمیٰ فون پر کبھی بھائی سے اور کبھی باپ سے باتیں کرتی رہی۔ ان سے یہ کہتی رہی کہ فیروزہ کو نکاح کے بعد میکے میں نہیں رہنا چاہیے۔ وہ اس کی علیحدہ رہائش کا فوراً انتظام کریں اور نند سے اس کا پیچھا چھڑائیں۔

فیروزہ نے اسی شام ایڈووکیٹ بشریٰ کو اپنی شادی کی خوشخبری سنائی۔ اسے اور وومنز لائرز ایسوسی ایشن کی چند خواتین لائرز کو شادی میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ چونکہ وہ سب خواتین کے مسائل حل کرنے کے معاملات میں پیش پیش رہتی تھیں اس لیے دوسری صبح دس بجے جواد کی کوٹھی میں حاضر ہوگئیں۔

جواد نے اپنے خاندان کے پانچ بزرگوں کو مدعو کیا تھا۔ چودھری قاسم علی بھی پانچ بزرگوں کے ساتھ آیا۔ ڈرائنگ روم میں فرشی نشست کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایک طرف مرد اور دوسری طرف خواتین بیٹھ گئیں۔ تب چودھری قاسم علی نے بلند آواز سے کہا "مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ ہمارے شہر کی سب سے مشہور و معروف ایڈووکیٹ بشریٰ ربانی یہاں تشریف رکھتی ہیں مجھے امید ہے کہ محترمہ کی موجودگی سے میرا ایک مسئلہ حل ہوجائے گا اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ میں جن قاضی صاحب کو یہاں لارہا تھا انہوں نے آنے سے انکار کردیا ہے۔"

ایک بزرگ نے پوچھا "انہوں نے انکار کیوں کیا ہے؟"

چودھری نے کہا "قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ ہمارے مذہب میں حاملہ عورت کا نکاح جائز نہیں ہے۔"

یہ سنتے ہی تمام بزرگ چونک گئے "حاملہ عورت؟ اور نکاح؟"

سب ایک دوسرے سے کچھ نہ بول رہے تھے۔ بشریٰ ربانی گہری سوچتی ہوئی نظروں سے چودھری قاسم علی کو دیکھ رہی تھی۔ ایک بزرگ غصے سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے "لاحول ولا قوۃ" ہمیں پہلے کیوں نہ بتایا کہ تم خلاف شرع ایسی بہو لینے آئے ہو؟"

چودھری نے کہا "میں مجبور تھا۔ اس شہر کی سب سے بڑی ایڈووکیٹ نے نوٹس بھیجا تھا کہ دو دن کے اندر میں نے اپنے بیٹے اور فیروزہ کا نکاح نہ پڑھایا تو ہمیں عدالت کا منہ دیکھنا پڑے گا۔"

کتنے ہی بزرگوں نے سوالیہ نظروں سے ایڈووکیٹ بشریٰ ربانی کو دیکھا۔ چودھری نے کہا "بزرگو! آپ یہ نہ سمجھیں کہ ایڈووکیٹ صاحبہ ہماری دشمن ہیں۔ یہ تو میرے بیٹے اور اپنی موکلہ فیروزہ کو عدالتی سزا سے بچانا چاہتی ہیں۔ اگر ابھی یہ شادی ہوجائے تو میرا بیٹا اور ہونے والی بہو قانون کی نظروں میں گناہ گار نہیں رہیں گے۔"

ایک نے کہا "ارے میاں عقل کی بات کرو۔ سیاہ کپڑے پر لفظ سفید لکھ دینے سے وہ

سفید نہیں ہوجائے گا۔ سیاہ ہی رہے گا۔ اسی طرح جو گناہ ہے وہ نکاح کے بعد بھی گناہ رہے گا۔"

دوسرے نے کہا "اتنے دلائل کی کیا ضرورت ہے۔ ہم ایک ہی بات جانتے ہیں، مذہب میں حاملہ عورت کا نکاح جائز نہیں ہے۔ اس لیے ہم اس ناجائز کام میں شریک نہیں ہوں گے۔"

سب ہی اٹھنے لگے اور کہنے لگے "چلو چلو۔ ہمیں تو اس گھر کا پانی بھی نہیں پینا چاہیے۔"

وہ سب جانا چاہتے تھے۔ جواد اور کچھ افراد انہیں روکنے کی کوشش کررہے تھے مگر وہ رکنا نہیں چاہتے تھے۔ ایڈووکیٹ بشریٰ ربانی نے تیزی سے آگے بڑھ کر دروازے کو بند کیا پھر چٹخنی چڑھادی۔ باہر جانے کے لیے وہی ایک دروازہ تھا۔ جانے والوں میں سے ایک نے غصے سے کہا "یہ کیا حرکت ہے آپ دروازہ کھولیں۔"

"وہ بولیں "پہلے آپ حضرات میری گزارش سنیں گے پھر یہ کھل جائے گا۔"

دوسری خواتین لائرز بھی بشریٰ ربانی کے آس پاس آکر راستہ روک کر کھڑی ہوگئیں۔ بزرگ حضرات پیچھے ہٹ گئے۔ایک نے کہا "بیٹی! ہم جانتے ہیں تم بہت ذہین ایڈووکیٹ ہو لیکن تم نے چودھری کو جو نوٹس دیا ہے اس سے ایک مذہبی حکم کی نفی ہوتی ہے اور ہم مذہب کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کریں گے۔"

بشریٰ ربانی نے کہا "الحمد اللہ میں بھی مسلمان ہوں۔ میں بھی مذہب کے خلاف کوئی بات گوارا نہیں کرتی۔ میں ایک سوال کرتی ہوں کیا اللہ تعالیٰ گناہگاروں کی توبہ قبول کرتا ہے؟"

سب نے کہا "بے شک گمراہی سے لوٹ آنے والوں کی توبہ قبول ہوتی ہے۔"

"آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ توبہ اور معافی کے بعد فیروزہ اور اکبر گناہگار نہیں کہلائیں گے۔"

"ہم مانتے ہیں لیکن ان کے گناہ معاف ہوئے یا نہیں یہ اندازہ کیسے ہو؟"

"ان دونوں کو آپ بزرگ حضرات معاف کریں گے۔یہ نکاح کے ذریعے راہ راست پر آنا چاہتے ہیں۔ آپ انہیں رشتہ ازدواج میں منسلک کرکے دعائیں دیں۔ یاد رکھیں آپ نفرت سے انہیں چھوڑ کر جائیں گے تو یہ مزید گناہگار بنتے رہیں گے۔ آپ محبت سے دعائیں دیں گے تو انہیں نیک اعمال کی ترغیب ملے گی۔"

ایک بزرگ نے کہا "بیٹی! تمہاری باتیں دل کو لگتی ہیں۔ لیکن معاف کرنا... شیطان بھی ایسی ہی لچھے دار باتیں کرتا ہے۔ تم یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہی ہو کہ حاملہ عورت سے نکاح جائز ہے۔"

"ہرگز نہیں" بشریٰ ربانی نے کہا "ایسا نکاح جائز نہیں ہے میں نے چودھری اکبر علی کو

جو نوٹس دیا ہے اس میں نکاح کی وضاحت نہیں ہے۔ میں قانون داں ہوں میرے نزدیک ایک قاضی ایک وکیل اور دو گواہوں سے نکاح عمل میں آتا ہے۔ اگر یہ حضرات گواہی دیں گے اور آپ حضرات تائید کریں گے تو فیروزہ اور اکبر میاں بیوی کہلائیں گے اور اگر آپ سب انکار کریں گے تو میں کل ہی دو گناہگاروں کا مقدمہ عدالت میں پہنچا دوں گی بولو چودھری قاسم علی کیا کہتے ہو؟"

وہ پریشان ہو کر بولا "نہیں محترمہ! یہ' ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے' نکاح ہو جائے تو اچھا ہے۔"

بشریٰ ربانی نے کہا "یہ نکاح اس لیے نہیں ہے کہ یہ دونوں ازدواجی رشتہ قائم کرلیں چونکہ دینی حکم کے مطابق نکاح جائز نہیں ہے اس لیے یہ دونوں نامحرم رہیں گے۔ فیروزہ اکبر سے پردہ کرے گی' اس کے ساتھ ایک چھت کے نیچے نہیں رہے گی۔"

ایک نے پوچھا "پھر ایسے نکاح کا فائدہ کیا ہے؟"

"درحقیقت یہ نکاح ایک معاہدہ ہے کہ اکبر ہی فیروزہ کے ہونے والے بچے کا باپ ہے۔ معاہدہ یہ ہے کہ فیروزہ کی زچگی عدت کے بعد اکبر پھر آج کی طرح آپ لوگوں کو یہاں لائے گا اور باقاعدہ نکاح پڑھوا کر فیروزہ کو شریک حیات بنائے گا۔"

سب اپنی اپنی جگہ سوچ میں پڑ گئے۔ بشریٰ ربانی نے کہا "چودھری قاسم علی! تم قاضی صاحب کو لاتے تب بھی میں قانونی نکاح نامے پر نکاح ہونے نہیں دیتی۔ میں نے ابھی جو کہا ہے اسی کے مطابق ایک معاہدہ تیار کر کے لائی ہوں۔ یہ معاہدہ ایک عارضی نکاح یعنی ایک عہد نامہ ہے کہ زچگی کے بعد فیروزہ کو اکبر کی طرف سے نکاح اور ازدواجی زندگی کے جائز حقوق ملیں گے۔ اس معاہدے پر آپ تمام حاضرین کے دستخط ہوں گے۔"

بشریٰ ربانی نے ایک خاتون وکیل سے چند کاغذات لے کر چودھری قاسم علی کو پیش کیے وہ کاغذات لے کر پڑھنے لگا اور اپنے بزرگوں کو سنانے لگا۔ فیروزہ کو ہر پہلو سے تحفظ فراہم کرنے اور تمام جائز حقوق دلانے کے لیے سخت شرائط پیش کی گئی تھیں۔ چودھری انہیں تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اکلوتے جوان بیٹے کی گردن پھنسی ہوئی تھی۔ اس نے دستخط کر دیے۔ پھر باری باری سب ہی نے دستخط کر دیے۔ اکبر اور فیروزہ کے بھی دستخط لیے اس طرح یہ نکاح نما معاہدہ تکمیل کو پہنچا۔

واپسی میں باپ بیٹا اور ان کے پانچ بزرگ پجیرو میں سفر کر رہے تھے بیٹے نے کہا "بابا جانی! ہم ایک سخت معاہدے کے جال میں جکڑ گئے ہیں۔"

باپ نے کہا "کوئی بات نہیں بابا کی جان! میں چاہتا تھا نکاح نہ ہو وہ نہیں ہوا یہی ہماری جیت ہے۔"

"لیکن زچگی کے بعد تو نکاح ہو گا۔"

"بیٹے! کل کس نے دیکھی ہے۔ آج کی بات کرو۔ کم از کم چھ ماہ زچگی کے اور اس

کے بعد چلہ نہانے تک وہ تمہاری بیوی نہیں ہے' میری بہو نہیں ہے۔ اپنے میکے میں بدنامی کا پیٹ لے کر رہے گی... کتنوں کو معاہدہ دکھائے گی کہ آئندہ کبھی تم اس سے شادی کرنے والے ہو کتنے لوگ ہیں جو معاہدہ پر یقین کریں گے۔"

"بابا جانی! لوگ ہم سے تصدیق کریں گے۔"

"معاہدہ میں یہ شرط نہیں ہے کہ اس مدت کے پورا ہونے تک ہمیں اسی شہر میں رہنا ہو گا۔ لہٰذا نہ ہم رہیں گے اور نہ ہی کسی کے سامنے تسلیم کرنے کی نوبت آئے گی کہ ہم نے ایسا کوئی معاہدہ کیا ہے۔"

اکبر نے کہا "میں ملک سے باہر چلا جاؤں گا۔"

چودھری نے ایک بزرگ سے کہا "وڈے چاچا! میں زمینوں پر چلا جاؤں گا۔ آپ یہاں رہ کر سڑک چھاپ غنڈوں موالیوں کو خریدیں گے۔"

وڈے چاچا نے کہا "فکر نہ کرو بہت اچھی طرح ان غنڈوں سے کام لوں گا۔"

چودھری نے دوسرے بزرگ سے کہا "نکے چاچا! ہماری چاچی سماجی کارکن ہیں۔ آپ ان کے ذریعے عورتوں کا محاذ قائم کریں گے۔ ہر علاقے اور محلے کی دو چار عورتیں ہونی چاہئیں تاکہ فیروزہ جہاں سے گزرے وہاں سے طعنے ملتے رہیں۔ دماغی ٹارچر پہنچانے کے تمام ہتھکنڈے استعمال کیے جائیں۔"

نکے چاچا نے کہا "تم جو چاہتے ہو اس سے کچھ زیادہ ہی ہو گا۔ ہم اسے دماغی مریضہ بنا دیں گے۔"

"ہاں اسے زندہ رکھنا ہے مگر مردے سے بدتر بنانا ہے۔ اس نے تحریری بیان دیا ہے کہ اگر اسے ہلاک کیا جائے گا یا وہ کسی حادثے کا شکار ہو کر مرے گی تو اس کی موت کا ذمے دار میرے بیٹے کو ٹھہرایا جائے گا لہٰذا ہم اسے جسمانی طور پر کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے اسے زندہ رکھیں گے۔"

پھر وہ حقارت سے بولا۔ "یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ وکیلوں اور بیرسٹروں کو سب سے زیادہ عقل ہوتی ہے؟ ہوتی ہو گی مگر جاگیرداروں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ ایڈووکیٹ بشریٰ نے ہی فیروزہ سے لکھوایا ہو گا کہ اسے میرا بیٹا قتل کر سکتا ہے۔"

اس نے قہقہہ لگایا پھر کہا "نہیں قتل کرے گا بھئی میرا بیٹا ایسی حماقت نہیں کرے گا۔ وہ ماں بننے والی زندہ رہے گی لیکن بچہ پیٹ میں رہ کر مرے گا تو ایڈووکیٹ بشریٰ اس کی موت کا ذمے دار کسے ٹھہرائے گی؟"

اس نے پھر قہقہہ لگایا اور کہا "سنا ہے بچہ یوں مرجائے تو اس کا زہر ماں کے جسم میں پھیل جاتا ہے۔"

وہ ہنستا جارہا تھا اور بولتا جارہا تھا۔ کامیاب منصوبہ بندی کا نشہ ایسا ہوتا ہے کہ سامنے سے صرف دشمن کی موت دکھائی دیتی ہے' اپنی نظر نہیں آتی یکبارگی اکبر نے چیخ ماری "بابا

جانی!"

اس کے بعد بابا جانی کو یہ بتانے کا موقع نہیں ملا کہ مخالف سمت سے آنے والے آئل ٹینکر سے تصادم ہو رہا ہے۔ تصادم سے دو چار سیکنڈ پہلے ہی اکبر نے پھرتی سے دروازہ کھولتے ہوئے باہر چھلانگ لگادی پھر نشیب میں دور تک لڑھکتے ہوئے زوردار دھماکے کی آواز سنی۔ اس کے بعد اس کے سر میں بھی دھماکا سا ہوا لڑھکنے کے دوران اس کا سر ایک بڑے پتھر سے ٹکراگیا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے میں وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہوگیا۔

موت ہماری تمہاری تدبیر سے نہیں آتی۔ اس کی پلاننگ ہیرو میں بیٹھ کر نہیں ہوتی آسمانوں میں ہوتی ہے۔ قدرت بڑی سبق آموز ہے۔ سانپ کے منہ میں زہر بھر کر ہمیں سبق سکھاتی ہے کہ یہ جسے چاہے گا اسے ڈس نہیں پائے گا ڈسنے سے پہلے اپنے مقدر کی موت مرجائے گا۔ چودھری قاسم علی اپنے چار عدد پہنچے ہوئے بزرگوں سمیت ایک پل میں فنا ہوگیا۔

اکبر کی آنکھ کھلی تو سب سے پہلے فیروزہ نظر آئی۔ وہ مسکرا رہی تھی زخمی کو حوصلہ دینے کے لیے ضرور مسکرانا چاہیے لیکن اکبر کو وہ زہر لگ رہی تھی۔ اس لڑکی نے تمام داؤ پیچ ناکام بنادیے تھے۔ جاگیردارانہ مزاج کے خلاف ان کے ذہنوں پر مسلط ہو رہی تھی۔ ان کے حواس پر چھا رہی تھی۔ اس منحوس کی وجہ سے اس کے باپ کو ایک زبردست حادثہ...

اس نے چونک کر پوچھا "بابا جانی خیریت سے ہیں؟"

فیروزہ نے سر جھکا کر نفی میں سرہلایا۔ اس نے پوچھا "اسی اسپتال میں ہیں؟"

اس نے پھر نفی میں سرہلایا وہ گرج کر بولا "کچھ منہ سے پھوٹو۔"

وہ بدستور سر جھکائے دھیمی آواز میں بولی "صبر کرو۔ ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو۔"

اس پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ یقین نہیں آرہا تھا۔ بے ہوشی سے پہلے اپنے باپ کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا اور یہ ابھی کی بات لگ رہی تھی وہ موت کی پلاننگ کرنے والا ابھی زندہ تھا اور ابھی مرگیا اور وہ بچہ زندہ ہے۔

وہ فیروزہ کے پیٹ کو گھورنے لگا۔ آدمی نصیحت کے اسباب کو توجہ سے دیکھے تو نصیحت حاصل ہوتی ہے اور گھور کر دیکھے تو صرف غصہ ہی دماغ پر حاوی ہوتا ہے۔ اس نے غصے سے اسپتال کے کمرے کو دیکھا پھر بستر سے اٹھتے ہوئے بولا "گھر میں بابا جانی کی میت رکھی ہوگی اور تم مجھے یہاں لے آئی ہو۔"

"مجھے رعب نہ دکھاؤ۔ تمہارے رشتے دار تمہیں یہاں لائے ہیں۔ میں تو خدمت کرنے اور اپنا فرض ادا کرنے آئی ہوں۔"

وہ کوئی جواب دیے بغیر اپنے باپ کی آخری رسومات ادا کرنے چلا گیا۔ اس خاندان کا

سربراہ سب سے بڑا جاگیردار اور چار بزرگ حادثے میں مرگئے تھے۔ جب اس کوٹھی میں بیک وقت پانچ لاشیں آئیں تو کہرام مچ گیا۔ عورتیں چھاتی پیٹنے لگیں۔ مرد سر پٹخنے لگے۔ حادثہ کیسے ہوا؟ یہ اکبر بھی آہ و زاری کے دوران نہ بتاسکا۔ سارا خاندان صرف اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ مرنے والے دلہن بیاہ کر لانے گئے تھے۔ ڈولی کی جگہ اپنے جنازے لے آئے تھے۔

جاہل عورتوں نے کہا "فیروزہ منحوس ہے۔ اس نے کچھ ایسا جادو ٹونہ کیا ہے کہ جس کے نتیجے میں اپنے ہونے والے مرد کو زندہ رکھا اور اس کے تمام بزرگوں کو مار ڈالا تاکہ سسرال میں اکیلی راج کرے۔"

جو جادو ٹونے کو نہیں مانتے تھے وہ بھی فیروزہ کے خلاف سوچ رہے تھے اور اکبر کے خیال میں تو وہ جونک بن گئی تھی اور رفتہ رفتہ اس کا اور اس کے خاندان والوں کا خون چوستی جارہی تھی۔

فیروزہ نے دوسرے دن اسے فون پر مخاطب کیا پھر کہا "دیکھو فون بند نہ کرنا کل تم نے اسپتال میں مجھے تعزیت کا موقع نہیں دیا تھا اس لیے..."

"یو شٹ اپ" اس نے فون بند کردیا۔

فیروزہ نے ہیلو ہیلو کہہ کر آوازیں دیں۔ پھر گونگے ریسیور کو دیکھ کر کریڈل پر ہاتھ رکھا۔ اس کے بعد دوسری بار رابطہ کیا۔ اکبر نے پوچھا "ہیلو کون ہے؟"

وہ بولی "آڈیو کیسٹ ہوں۔ تم دیکھ چکے ہو کیسٹ کیا گل کھلاتے ہیں۔"

"ہاں دیکھ چکا ہوں' پتا نہیں تم نے یہ ریکارڈنگ والی چالاکی کہاں سے سیکھ لی تھی۔ اب اس کے ذریعے جونک کی طرح چمٹ گئی ہو۔"

"میں نے جونک بننا تم سے سیکھا ہے۔ گریبان میں جھانک کر دیکھو' تم محبت کے نام پر میرا خون چوستے رہے۔ میں تمہیں عاشق سمجھتی رہی اور تم جونک بنتے رہے مجھے اپنا عادی بناتے رہے۔ میں تمہاری عادی ہوگئی تو مجھے باندی بنائے رکھنے کے لیے شادی کا معاملہ ٹالنے لگے۔"

"ہاں میں تمہاری جوانی کا لہو چوس رہا تھا۔ اب تم میری مردانگی اور برتری کا لہو نچوڑ رہی ہو۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ میرا وقت پھر آئے گا تو میں تم سے نمٹ لوں گا۔"

وہ مسکرا کر بولی "ایک راز کی بات بتاؤں اکبر! میرے اس فون کے ساتھ ٹیپ منسلک ہے پھر تمہارا ایک کیسٹ تیار ہو رہا ہے۔"

وہ پریشان ہوکر بولا "یہ ... یہ کیا کہہ رہی ہو؟ مم..... میں تو کچھ نہیں کہہ رہا ہوں میں معاہدے کے مطابق تم سے شادی کروں گا۔ تمہارے تمام حقوق ادا کرتا رہوں گا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"محبت کرتے نہیں ہو' یہ تو میں کر رہی ہوں۔"

"جو بھی ہو' محبت تو ہو رہی ہے۔"

"یہ کسی بھی وفا کرنے والی کے لیے دکھ کی بات ہے کہ کوئی اسے کسی خوف کے یا لالچ کے تحت چاہے۔ ویسے ابھی میں نے جھوٹ کہا تھا میرے فون سے ٹیپ منسلک نہیں ہے۔ تمہاری آواز ریکارڈ نہیں ہو رہی ہے۔"

وہ بے یقینی سے بولا "مجھے بنانے کی کوشش نہ کرو' اب میں ایسی کوئی بات زبان پر نہیں لاؤں گا' جو معاہدے کے خلاف ہو۔"

فیروزہ نے ہنستے ہوئے رابطہ ختم کردیا۔ اکبر نے اپنے ریسیور کو گھور کر دیکھا۔ پھر اسے رکھ کر دانت پیستے ہوئے فیصلہ کیا کہ بابا جانی نے اپنی موت سے پہلے جو منصوبے بنائے تھے وہ ان پر عمل کرے گا اور اس بلائے جان کو دودھ کی مکھی کی طرح اپنی زندگی سے نکال پھینکے گا۔

اس نے دوسرے دن جہلم شہر چھوڑ دیا۔ فیروزہ نے فون کے ذریعے رابطہ کیا تو اسے بتایا گیا کہ وہ پنڈ دادن خان اور ملک وال کی زمینوں پر گیا ہے۔ وہ اس کے جانے پر اعتراض نہیں کرسکتی تھی۔ کیونکہ ابھی اپنے مرد کو روکنے ٹوکنے والا رشتہ قائم نہیں ہوا تھا۔ پھر زمینوں کی دیکھ بھال اور ان کا حساب کتاب رکھنے والا وہی ایک وارث رہ گیا تھا۔ اس لیے وہ صبر سے اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

اس نے ڈھیلا لباس پہننا شروع کردیا تاکہ پیٹ معلوم نہ ہو۔ باہر کسی کام سے جاتی تو اپنے بدن کو چادر میں چھپا لیتی تھی لیکن ابھرنے والا آفتاب ہو یا پیٹ وہ بدلی میں نہیں چھپتا اور عورتوں سے تو کبھی نہیں چھپتا۔ وہ جس گلی سے گزرتی وہاں دو چار عورتیں ضرور کچھ بولتی تھیں۔ کوئی کسی سے کہتی "اے بہن! ذرا دیکھو کیسے اعلانیہ پرچم لہراتی جارہی ہے۔"

کوئی کہتی "سوہنی گھڑا لے کر چناب میں گئی تھی۔ یہ جہلم میں جائے گی۔"

ایسی باتوں پر ہنسنے کی آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے گزر جاتی تھی سوچتی تھی آئندہ باہر نکلنے سے پرہیز کرے گی لیکن کھانے پینے کا سامان خریدنے کے لیے نکلنا پڑتا تھا۔ بھائی اور بھابی اسے کوٹھی میں تنہا چھوڑ گئے تھے۔ بھابی زچگی کے لیے میکے چلی گئی تھیں۔ بھائی شرم سے منہ چھپانے کے لیے بیوی کے ساتھ سسرال میں رہنے لگا تھا۔ وہ اپنی جگہ درست تھا محلے سے گزرتا تھا یا دوست احباب میں رہتا تھا تو کسی نہ کسی حوالے سے بہن کا ذکر چھڑ جاتا تھا۔ یا وہی باتیں اشارے کنائے میں ہونے لگتی تھیں۔

وہ کچھ جھنجلانے لگی تھی۔ کوئی یہ سمجھنا نہیں چاہتا تھا کہ عورت اپنی عزت ہارنے کے بعد اپنے حقوق بھی ہارتی رہے گی اور مرد سے اپنے مطالبات پورے نہیں کرائے گی تو فریب کھاکر قیامت تک کنواری ماں اور داشتہ بنتی رہے گی۔

گناہگار بن کر خود بدنام ہونا اور اپنے خاندان کو بدنام کرنا دانشمندی نہیں ہے اور کوئی شریف زادی جان بوجھ کر رسوائی مول نہیں لیتی۔ مرد کا فریب اس پر رسوائی تھوپ دیتا

ہے۔ ایسے میں آبروباختہ کہلاتے رہنے سے بہتر ہے کہ اسی مرد سے جونک بن کر چمٹ جائے ایک معصوم کو پیٹ کے اندھیرے میں قتل کرنے سے گناہ نہیں چھپتا انسانیت مرتی ہے اور کمزور غیرت والے ہمیشہ بچے کے نام پر انسانیت کو مارتے ہیں۔

ایک روز وہ ایڈووکیٹ بشریٰ ربانی سے ملنے گئی۔ باہر گلی میں کوئی گاڑی نہیں ملی وہ گلی پار کرکے سڑک پر آئی۔پیچھے سے کسی کی آواز سنائی دی "ہائے کیا حسن ہے۔کیا شباب ہے مگر یہ غبارہ گڑ بڑ کر رہا ہے۔"

وہ تلملا گئی۔ تیزی سے آگے جانے لگی۔ سڑک پر لوگوں کی آمدورفت تھی۔ دو آوارہ ٹائپ جوان اس کے دائیں بائیں چلنے لگے۔ ایک نے کہا "کیسی مجبوری ہے۔ ہمارے خلاف شور مچاؤ گی تو یاران شہر کو جواب دینا ہوگا۔ چادر ہٹا کر بتانا پڑے گا کہ کس کی گٹھری اٹھائے پھر رہی ہو۔"

دوسرے جوان نے بھی ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا "ہم بہت گناہگار ہیں۔ ہمارے بھی گناہوں کا بوجھ اٹھالو تو نیکی ہوگی۔"

وہ شرم سے سرخ ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا ان کے منہ پر تھوک دے' گالیاں دے' ان سے لڑ پڑے لیکن ان میں سے ایک نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ شور مچائے گی تو اسے پیٹ کا حساب دینا ہوگا۔

کمبخت کوئی رکشہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی ان سے نظریں چراتی ہوئی بولی "مسلمان ہو تو میری قسم کا اعتبار کرو۔ میں خدا کی قسم کھاکر کہتی ہوں اس بچے کا باپ ہے۔ وہ چند ماہ بعد آئے گا اور بچے کو گود میں لے کر پورے شہر کو میری محبت شرافت اور بے گناہی کا یقین دلائے گا۔"

ایک نے ہنستے ہوئے کہا "جو بچے شادی سے پہلے پیدا ہوتے ہیں' ان کے باپ کبھی دیکھنے میں نہیں آتے۔"

اس نے سوال کیا "تم کیسے جانتے ہو کہ میری شادی نہیں ہوئی ہے؟"

"ہم بہت پہنچے ہوئے ہیں۔ دور کی کوڑی لاتے ہیں اور دو کوڑی کی عورتوں کو پہچان لیتے ہیں۔"

ایک رکشہ قریب آکر رک گیا۔ حالانکہ اس نے خالی رکشہ پر دھیان نہیں دیا تھا۔ نہ ہی ہاتھ کے اشارے سے رکنے کو کہا تھا۔ ویسے اس کے رکنے سے بہت بڑا سہارا مل گیا تھا۔ وہ اس میں بیٹھتی ہوئی بولی "کچہری روڈ جہلم کورٹ چلو۔"

رکشہ آگے چل پڑا دونوں لفنگے پیچھے رہ گئے۔ اس نے اطمینان کی سانس لی لیکن تھوڑی دیر بعد اطمینان ختم ہوگیا۔ رکشہ شاندار چوک کے موڑ پر رک گیا۔ ڈرائیور نے انجن بند کردیا فیروزہ نے پوچھا "کیا ہوا؟"

وہ پلٹ کر اس کے پیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "میرا رکشہ زیادہ لوڈ برداشت نہیں

کرتا ہے۔"

فیروزہ کو جیسے پتھر آکر لگا۔ چشم زدن میں یہ واضح ہوگیا کہ یہ رکشے والا کسی اشارے کے بغیر کیوں اس کے پاس آکر رکا تھا۔ یعنی وہ بھی جانتا تھا کہ اس ماں بننے والی کو بے خوف و خطر اذیت پہنچائی جاسکتی ہے۔

ڈرائیور مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا "کسی قریبی زچہ خانے میں چلی جاؤ لوڈ کم کرکے آؤ۔ میں آگے لے چلوں گا۔"

وہ اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کرتی ہوئی بولی "تم درست کہتے ہو۔ یہ بچہ بہت وزنی ہے۔ اسے ماں کے سوا کوئی برداشت نہیں کرسکے گا۔"

پھر وہ اچانک اسے انگلی دکھاتی ہوئی تیزی سے بولی "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ بچہ ناجائز ہے؟"

وہ اپنی ران پر ہاتھ مار کر بولا "ارے وہ منشی را..."

وہ بولتے بولتے ایک دم سے رک گیا۔ بے خودی سے اچانک سنبھل گیا پھر بولا "ارے مجھے کون بتائے گا۔ میں دس برس سے رکشہ چلا رہا ہوں۔ بھانت بھانت کی عورتوں کو ادھر سے ادھر پہنچاتا ہوں۔ تمہاری چال سے پتا چل رہا تھا کہ ٹیکسی ہو۔"

وہ دانت پیس کر بولی "کتے کے بچے! تیری ماں نے بھی نو ماہ تک تیرا لوڈ اٹھا کر تجھے انلوڈ کیا تھا۔ اسے بھی ٹیکسی بول۔"

"اے خبردار! میری ماں تک پہنچے گی تو ابھی لوگوں کو جمع کرکے تیرے گناہوں کا بھانڈا پھوڑ دوں گا۔"

"تیرا باپ بھی میرا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ تیرے منہ سے منشی رحیم الدین کا آدھا نام سن کر ساری حقیقت معلوم ہوگئی ہے۔"

"کیا معلوم ہوگئی؟ کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"یہی کہ اچانک شہر کے غنڈوں اور رکشہ ڈرائیوروں کو یہ کیسے معلوم ہوگیا کہ میری شادی نہیں ہوئی ہے اور میں گناہوں کا بوجھ اٹھائے پھر رہی ہوں۔ یہ چودھری اکبر علی کا منشی رحیم الدین تم جیسے لوگوں کو خاصی رقم دے رہا ہے تاکہ پورے شہر میں مجھے اس قدر ٹارچر کیا جائے کہ میں دماغی مریضہ بن جاؤں یا گھبرا کر خودکشی کرلوں۔"

"پتا نہیں تم کیا کہہ رہی ہو؟ میں کسی منشی کو نہیں جانتا میرے رکشے سے اترجاؤ۔"

"اگر میں چودھری اکبر علی سے یہ کہہ دوں کہ تم نے اور منشی نے مجھے چودھری کی سازش کے متعلق بہت کچھ بتادیا ہے تو چودھری کے غنڈے تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

وہ پریشان ہوکر سوچنے لگا۔ فیروزہ نے کہا "چودھری نے حکم دیا ہوگا کہ مجھے دماغی تکالیف پہنچانے کے لیے چھیڑا جائے۔ لیکن لوگوں میں مجھے بدنام نہ کیا جائے۔میری گناہ گاری کو

پولیس اور تھانے تک نہ پہنچنے دیا جائے۔ ایسا ہوگا تو چودھری بھی میرے ساتھ پکڑا جائے گا۔"

وہ عاجزی سے بولا "میں اندر کی بات نہیں جانتا ہوں مگر مجھے یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہیں چھیڑوں لیکن لوگوں کی بھیڑ نہ لگنے دوں اور اس سلسلے میں چودھری یا منشی کا نام آئے گا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔ تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی مگر ایک شرط ہے۔ تمہیں بتانا ہوگا کہ آج کل چودھری اکبر علی کہاں ہے؟"

"بی بی جی! بتاؤں گا مرجاؤں گا۔"

"نہیں مروگے ہاں نہیں بتاؤگے تو مروگے۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا "میں رکشہ ڈرائیور نہیں ہوں' چودھری صاحب کا ملازم ہوں۔ منشی نے کہا تھا میں تھوڑی دیر کے لیے رکشہ لے جاکر آپ کو پریشان کروں پھر واپس آجاؤں۔"

اس کا مزید بیان سن کر پتا چلا کہ جو غنڈے بدمعاش راستے میں ملتے رہے' وہ سب اکبر کے زرخرید تھے۔ اور وہ آج کل اسی شہر کے شمال مغرب میں جادہ نامی بستی میں رہتا تھا وہاں اس کا ایک بنگلا تھا۔

چودھری کے ملازم نے فیروزہ کو رکشے میں بشریٰ ربانی کے دفتر تک پہنچایا' وہ بولی "میں جب تک نہ کہوں' یہاں سے نہیں جاؤگے۔ میرا انتظار کروگے۔ میری باتوں پر عمل کرتے رہوگے تو چودھری تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

اس نے رکشے والے کو دھمکی بھی دی اور تحفظ کا یقین بھی دلایا۔ پھر ایڈووکیٹ بشریٰ ربانی کے پاس آئی۔ بشریٰ ربانی نے بڑے پیار سے اس کا استقبال کیا۔ اسے بیٹھنے کے لیے کہا پھر خیریت پوچھی۔ فیروزہ اسے تمام روداد سنانے کے بعد بولی "اکبر جادہ کے ایک بنگلے میں ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میں ادھر کبھی نہیں جاتی ہوں اس لیے وہاں چھپ کر مجھے ٹارچر دے رہا ہے۔ میرے علاقے میں بھی اس نے چند کرائے کی عورتیں چھوڑی ہوں گی۔ ان عورتوں کی شہ پر میرے محلے پڑوس کی عورتیں مجھے طعنے دینے لگی ہیں۔"

بشریٰ ربانی نے کہا "اس میں شبہ نہیں کہ چودھری اکبر علی تمہیں تنہا بدنام کرنے کے کامیاب ہتھکنڈے آزما رہا ہے اور اپنے خلاف کوئی ثبوت نہیں چھوڑ رہا ہے۔ تمہیں خودکشی یا پاگل پن کے مقام تک پہنچانا چاہتا ہے۔ کیا اب بھی اس سے وفا کی امید رکھوگی؟"

"اس سے وفا کی امید بہت پہلے ہی دم توڑ چکی ہے۔ اب تو بچے کی خاطر اسے جبراً وفادار بناکر رکھنا ہے۔ کیا آپ ابھی ایک قانونی نوٹس جاری کرسکتی ہیں کہ وہ ایک گھنٹے کے اندر یہاں آپ کے پاس حاضر ہوجائے۔ حاضر نہ ہونے کی صورت میں میں اسے عدالت

میں بلاؤں گی۔"

"اچھی بات ہے۔ وہ جس بنگلے میں روپوش ہے اس کا پتا لکھ دو۔ میرا سیکیورٹی گارڈ نوٹس لے کر جائے گا اور اسے ساتھ لے کر آئے گا۔"

"باہر اکبر کا ایک ملازم رکشہ ڈرائیور بنا ہوا ہے۔ وہ آپ کے گارڈ کو دور سے بنگلا دکھائے گا۔"

"ٹھیک ہے تم ویٹنگ روم میں بیٹھو۔"

وہ وہاں سے دوسرے کمرے میں آگئی۔ وہاں دو خواتین بیٹھی ہوئی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ فیروزہ بھی ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ سندھ میں سیلاب نے جو تباہی مچائی تھی اس کی دستاویزی فلم دکھائی جارہی تھی۔ سکھر سے کوٹری تک پندرہ ہزار سے زیادہ دیہات پانی میں ڈوب گئے تھے۔ اندازاً" دو لاکھ افراد بے گھر ہوچکے تھے۔ گوٹھ ماہی' سونو خان' بھٹی ماچن' جو گوٹھ' بانو رن گوٹھ' اور گوٹھ صالیا پور میں پانی نے تباہی مچائی تھی اور ٹمیاری سے سعید آباد کے درمیان نو میل طویل علاقہ سیلاب کی زد میں تھا۔ کئی مقامات پر ریلوے کا نظام معطل ہوگیا تھا۔ سیکڑوں میل لمبی سڑکیں اور درجنوں پل ٹوٹ گئے تھے۔

یہ وہ وقت تھا' جب سندھ میں سیلاب کا غصہ دھیما پڑتا جارہا تھا اور پنجاب میں طوفانی بارش تہلکہ مچا رہی تھی۔ ابھی سیلاب کا خطرہ معمولی تھا۔ یہ سوچا نہیں جاسکتا تھا کہ خطرہ غیر معمولی اور اعصاب شکن ہوجائے گا۔ جہلم کے شہری اپنے گھروں میں بیٹھے سندھ میں ہونے والی تباہ کاریاں دیکھ رہے تھے اور کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ ان پر کیسی قیامت ٹوٹنے والی ہے۔

کوئی ایک گھنٹے بعد بشریٰ ربانی نے فیروزہ کو بلایا "وہ ویٹنگ روم سے اٹھ کر چیمبر میں داخل ہوئی تو وہاں ایک کرسی پر اکبر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی بولا "فیروزہ! نوٹس بھیجنے کی کیا ضرورت تھی تم آواز دیتیں تو میں چلا آتا۔"

وہ بولی "میں نے جہلم کے کنارے کھڑے ہو کر صدا لگائی تھی میری آواز کبھی "وچلے بیلے" تک گئی کبھی پنڈ دادن خان پہنچی پھر تمہاری تمام جاگیر میں بھٹک کر واپس آگئی۔ تب بازگشت نے چغلی کھائی کہ تم جادہ والے بنگلے میں ہو۔"

"ہاں...وہ میں کل رات ہی یہاں آیا تھا۔ آج تم سے ملنا..."

وہ بات کاٹ کر بولی "کل رات نہیں پچھلے پندرہ دن سے یہاں ہو اور اس تین ماہ کے عرصہ میں کئی بار آچکے ہو۔"

وہ ذرا لاجواب ہوا پھر بولا "دراصل معاہدے میں یہ درج نہیں ہے کہ شادی سے پہلے مجھے تمہارے پاس حاضری دیتے رہنا چاہیے۔"

"کوئی بات نہیں۔ نیا معاہدہ ہوجائے گا۔ ہمارے ہونے والے بچے کے خلاف شہر میں ایک وبا پھیل رہی ہے۔ غنڈوں' بدمعاشوں' رکشہ اور ٹیکسی ڈرائیوروں کو فکر لاحق ہوگئی

ہے کہ میری شادی نہیں ہوئی ہے اور بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ کیا تمہیں خبر ہے کہ کوئی دشمن مجھے خودکشی کرنے یا دماغی مریضہ بننے کی راہ پر لگا رہا ہے؟"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو' میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

"زیادہ سمجھنے کی ضرورت کیا ہے۔ میں شہر میں بدنام ہو رہی ہوں' تم مجھے ذلتوں سے بچاؤ۔"

"کیسے بچاؤں؟"

"تم میرے ساتھ شہر کی سڑکوں پر چلوگے تو لوگوں کی زبانیں بند ہوتی جائیں گی۔ یہاں سے میرے گھر تک کوئی مجھ سے شادی اور بچے کی بات نہیں پوچھے گا تم میرے اچھے اور برے کردار کا لیبل بن کر رہوگے۔"

"لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔ تمہارے لیے نامحرم ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ راستہ چلتے وقت کتنے ہی نامحرم ہمارے شانہ بشانہ رہتے ہیں۔ بسوں اور ٹرینوں میں سینما گھروں میں اور محفلوں میں محرم اور نامحرم کا فرق مٹادیا جاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے چلو میں تمہیں گھر تک چھوڑ آؤں گا۔"

"مجھے گھر میں تنہا چھوڑ کر جاؤ گے تو کرائے کی عورتیں اور غنڈے پھر چھیڑنے آجائیں گے۔"

"کوئی چھیڑنے نہیں آئے گا۔"

"کیا تم انہیں منع کردوگے؟"

"ہاں منع..." وہ کہتے کہتے رک گیا پھر بولا "وہ میرے کوئی رشتے دار یا زرخرید تو نہیں ہیں کہ میرے منع کرنے سے مان جائیں گے۔"

"اسی لیے تو کہتی ہوں مجھے کوٹھی میں تنہا چھوڑ کر نہ جانا' چونکہ نامحرم ہوں اس لیے انیکسی میں تمہاری رہائش کا انتظام کردوں گی۔"

وہ بڑی مجبوری اور بے بسی سے کبھی فیروزہ کو اور کبھی ایڈووکیٹ بشریٰ ربانی کو دیکھنے لگا۔ بشریٰ ربانی نے کہا "مسٹر اکبر! میرا وقت برباد نہ کرو۔ تم نے شہر میں جو بدنامی کی فصل بوئی ہے اسے کاٹو۔ فیروزہ کو نارمل رہنا اور بچے کو سلامتی سے پیدا ہونا ہے اور اب یہ تمہارے سائے میں ہی ممکن ہے۔"

وہ ایک ٹوٹے ہوئے شخص کی طرح آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے آج تک بڑی آسانی سے مچھلیاں پکڑی تھیں۔ ہوس کے دریا میں کانٹا ڈالتا تھا اور اپنی پسند کی مچھلی پھانس لیتا تھا۔ یہ کہاوت بھول گیا تھا کہ کانٹا ڈال کر مچھلیاں پکڑنے والوں کے حلق میں بھی مچھلی کا کانٹا پھنس جاتا ہے۔

وہ دفتر سے باہر آتے ہوئے بولا "مجھے میری برداشت سے زیادہ جھکانا چاہوگی تو میں ٹوٹ جاؤں گا۔ میں تناور درخت ہوں' ٹوٹ کر تمہارے ہی اوپر گروں گا۔ پھر تم بھی

سلامت نہیں رہوگی۔"

وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولی "یہ ابھی تک تمہاری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں زندہ سلامت رہنا نہیں چاہتی۔ تمہارے ساتھ اپنے گناہوں کی سزا پانا چاہتی ہوں۔ یہ تم ہو کہ سزائے موت سے ڈر رہے ہو اور مجھ سے سمجھوتے کرتے جارہے ہو۔"

"ہاں میں ڈرتا ہوں حرام موت مرنا نہیں چاہتا۔"

"تو پھر زندہ رہنے کے لیے یہ حساب نہ کرو کہ میں تمہیں کس حد تک جھکا رہی ہوں۔ خداگواہ ہے کہ تمہیں مجبور اور بے اختیار بناکر اپنے کسی جذبے کی تسکین نہیں کر رہی ہوں۔ نہ انتقام لے رہی ہوں۔ میں نے متاع آبرو دی ہے اس کے صلے میں اپنے لیے کچھ نہیں چاہتی۔ تمہارے ہی بچے کی جائز سماجی حیثیت اور اس کے حقوق چاہتی ہوں۔ وہ اور ہوں گی جو تمہارے بے حساب بچے کیڑوں مکوڑوں کی طرح پیدا کرتی رہی ہوں گی۔ میں انسان کا بچہ پیدا کر رہی ہوں۔"

وہ عمارت سے باہر آئے۔ اس نے اپنی کار کے پاس پہنچ کر کہا۔ "میں اپنے ڈرائیور کو چھٹی دے رہا ہوں۔ ہم اس کی موجودگی میں باتیں نہیں کرسکیں گے۔"

فیروزہ نے چادر اوڑھنے کا انداز بدل دیا۔ اُسے یوں اپنے بدن پر رکھا کہ پیٹ صاف طور سے نظر آنے لگا پھر اس نے کہا "میں کہہ چکی ہوں تمہارے ساتھ پیدل چلوں گی۔"

"تھک جاؤگی۔ تمہاری کوٹھی یہاں سے تقریباً چار میل کے فاصلے پر ہے۔"

"ڈرائیور سے کہو گاڑی لے کر پیچھے آتا رہے۔ تھکن ہوگی تو بیٹھ جاؤں گی۔"

"فیروزہ! آسمان کی حالت دیکھو۔ بارشیں ہورہی ہیں ابھی کسی وقت بھی پھر ہوسکتی ہے۔"

"ہونے دو میں نمک نہیں ہوں اور تمہیں زکام نہیں ہوتا ہے۔ تم اکثر طوفانی بارشوں میں بھیگ کر میری خواب گاہ میں آتے رہے ہو۔"

اس نے جو کرم کیے تھے ان کی مناسبت سے فیروزہ کے پاس ہر بات کا جواب تھا۔ اس نے ڈرائیور سے کہا "ہم پیدل جارہے ہیں۔ ہمارے پیچھے گاڑی لے کر آتے رہو۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ وہ پیچھے آتے ہوئے بولی "آدمی اپنے برے اعمال پیچھے چھوڑ کر آگے جاتا ہے۔"

وہ رفتار سست کرکے اس کے برابر ہوگیا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا "چادر درست کرو خدا کے لیے پیٹ چھپاؤ۔"

"خود نہیں چھپ رہا تو کوئی کیوں کر چھپائے؟"

"پھر بھی اسے اشتہار بنانا اچھی بات نہیں ہے۔"

"میں پہلے چھپانا چاہتی تھی ڈھیلے کپڑے پہنتی تھی۔ چادر میں چھپتی تھی پھر کرائے کی عورتوں اور غنڈوں نے مجھے مشتہر کردیا۔ کئی ماہ سے اپنے محلے میں عورتوں کے طعنے اور

نفرتیں برداشت کرتی آرہی ہوں۔ آج تو سرراہ تمہارے غنڈوں نے حد کردی۔"

"وہ میرے بندے نہیں تھے غلط نہ سمجھو۔"

وہ تڑخ کر بولی "بکواس مت کرو۔ میں نے تمہارے جیسا کم ظرف انسان کہیں نہیں دیکھا ہے۔"

وہ پریشان ہو کر آس پاس دیکھتے ہوئے بولا "آہستہ بولو۔ لوگ دیکھ رہے ہیں' کتنے ہی رک گئے ہیں۔"

"تم اسی طرح سمجھوگے کہ میں گھر سے یہاں تک کتنی ذلتیں برداشت کرتی آئی ہوں۔"

اسی وقت بارش ہونے لگی۔ جو لوگ رک کر انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے وہ پانی سے بچنے کے لیے مختلف عمارتوں کی طرف جانے لگے۔ اکبر نے کہا "بھیگنا مناسب نہیں ہے گاڑی میں چلو۔"

"یونہی چلتے رہو تمہارے ساتھ کبھی کھلی فضا میں بھیگنے کا موقع نہیں ملا۔ موسم کو انجوائے کرو۔ مجھے اس وقت ہیرو ہیروئن کے بھیگنے والے کتنے ہی فلمی سین یاد آرہے ہیں۔"

وہ بڑے صبر سے بڑے جبر سے بھیگتا جارہا تھا۔ فیروزہ کا لباس بدن سے چپک گیا تھا۔ پیٹ اور نمایاں ہوگیا تھا۔ وہ عاجزی سے بولا۔ "میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا پلیز اسے چھپالو۔"

"میں قسم کھاچکی ہوں اسے نہیں چھپاؤں گی۔ یہ پورے شہر میں ڈنکے کی طرح بجتا ہوا تمہارے ساتھ چلے گا۔"

"فیروزہ! خدا کے لیے کوئی ایسا سمجھوتا کرو کہ مجھے اس عذاب سے نجات ملے۔"

"میں نے تمہارے باپ اور بزرگوں کی موجودگی میں ایک دانش مندانہ معاہدہ کیا۔ اس کے مطابق آئندہ ہماری شادی ہونے تک تم سکون سے رہ سکتے تھے لیکن تم نے اپنی کم ظرفی ثابت کردی ہے۔ تم ہتھیلی پر آگ رکھ کر بھی اپنی محبت اور شرافت کا یقین دلانا چاہوگے تو میں دھوکا نہیں کھاؤں گی۔ تم سے کسی معاملے میں رعایت نہیں کروں گی۔"

وہ چپ رہا۔ دل ہی دل میں گالیاں دینے لگا۔ سوچنے لگا ایسی ہی موسلا دھار بارش میں اس کی ماں کو میں نے مٹی میں ملایا تھا لیکن اس کمبخت سے نجات حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں نکل رہی ہے۔ اتنی بارشیں ہورہی ہیں۔ بادل گرج رہے ہیں۔ بجلیاں کڑک رہی ہیں۔ ایک بجلی اس کمبخت پر نہیں گر رہی ہے۔

اس نے فیروزہ کو کوٹھی میں پہنچایا پھر کہا "میں جارہا ہوں۔ ایک گھنٹے تک اپنا لباس اور ضروری سامان لے آؤں گا۔"

"خیری جاؤ خیری آؤ۔"

وہ اپنی کار میں اپنے گھر آیا۔ بڑی دیر تک بارش میں بھیگنے کے بعد دماغ ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ بلکہ روشن ہولیا تھا اور وہ روشن خیالی سے سوچ رہا تھا۔ اسے فیروزہ کے ساتھ رہنا چاہیے۔ غصے کے دوران یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ دشمن کے قریب رہنے سے اس کی کوئی کمزوری ضرور ہاتھ آتی ہے۔ تقدیر کسی لمحے میں بھی مہربان ہوکر اس سے نجات حاصل کرنے کا موقع فراہم کرسکتی ہے۔

اب تو تقدیر ہی پر تکیہ تھا۔ کسی تدبیر سے اسے قتل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ہوسکتا تھا زچگی کا وقت قریب آتے آتے وہ کمزور اور بیمار ہوجاتی۔ ایسے وقت علاج کے دوران اس کی دواؤں میں گڑ بڑ کی جاسکتی تھی۔ لیکن وہ ہمیشہ کی طرح صحت مند اور تگڑی دکھائی دیتی تھی جبکہ ساتواں مہینہ تھا۔ اس کے خلاف نہ تقدیر کوئی کرشمہ دکھا رہی تھی نہ تدبیر کام رہی تھی اور نہ ہی بددعائیں اس پر اثرانداز ہورہی تھیں۔

بارش کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا' وہ جیسے رکنا نہیں چاہتا تھا ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے معلوم ہو رہا تھا کہ ایبٹ آباد' کالا باغ اور نیلم کی وادیوں میں غضبناک بارش ہو رہی ہے۔ پچاس سے زیادہ افراد ہلاک ہوچکے ہیں اور کشمیر کے پہاڑوں سے اترنے والی بارش راولپنڈی اور ضلع جہلم وغیرہ کو بھی اپنے نرغے میں لے رہی ہے۔

جہلم کے شہری بارش کا یہ منظر دیکھ رہے تھے اور اندازہ کر رہے تھے کہ دریا میں زوردار سیلاب آئے گا۔ لوگ اسی حد تک سوچ رہے تھے' جس حد تک ماضی کے چھوٹے بڑے سیلابوں کا منظر دیکھ چکے تھے۔ چونکہ قیامت کسی نے نہیں دیکھی ہے اس لیے کوئی بھی قیامت خیز سیلاب کی توقع کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اکبر نے فیروزہ سے کہا۔ "بارش تھم گئی ہے باہر موسم قابل دید ہوگا۔ کیا خیال ہے تھوڑی آؤٹنگ ہوجائے؟"

وہ بولی "خیال اچھا ہے۔ مجھے باہر کی تازہ ہوا ملے گی میں لباس بدل کر آتی ہوں۔"

وہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی اس نے ریسیور اٹھا کر کہا "ہیلو!"

دوسری طرف سے جواد کی آواز آئی "ہیلو اکبر! کیا تم بول رہے ہو؟"

"جی ہاں۔ آپا کہاں ہیں؟"

"میں نے [illegible] کو اور تمہارے تمام گھر والوں کو پنڈی بھیج دیا ہے۔ گھر کے گراؤنڈ فلور میں جتنا قیمتی سامان تھا وہ سب اوپر پہنچا دیا ہے۔ میں اس وقت منگلا آفس سے بول رہا ہوں۔"

"گھر والوں کو پنڈی کیوں بھیج دیا؟ بات کیا ہے؟"

"سیلاب کا خطرہ ہے۔ ہمیں خفیہ طور سے خصوصی اطلاع ملی ہے کہ زبردست سیلاب آئے گا۔ [illegible] سرکاری طور پر اعلان نہیں کیا جارہا ہے کیونکہ اعلان ہوتے ہی شہر میں خوف و ہراس پھیل جائے گا۔"

"لیکن جواد بھائی! شہریوں کو احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے لیے کہا جاسکتا ہے- یوں قیمتی جانیں اور مال و متاع محفوظ رہے گا-"

"اکثر محکمہ موسمیات کی پیش گوئیاں غلط ہوتی ہیں- اگر سیلاب نہ آیا تو خواہ مخواہ شہر میں سراسیمگی پھیلی رہے گی اور شہر ضلع انتظامیہ کو گالیاں دیتے رہیں گے- ضلع انتظامیہ کے افسران کہتے ہیں پہلے پکی خبر دیں پھر شہریوں کو خبردار کیا جائے گا- اور تم بھی کیا بحث لے بیٹھے ہو- میں نے اس لیے فون کیا ہے کہ تم فیروزہ کے ساتھ جتنی جلدی ہوسکے وہاں سے نکل جاؤ- اگلے چوبیس گھنٹوں میں کچھ بھی ہوسکتا ہے- وہاں سے نکل رہے ہو نا؟"

"ٹھیک ہے- ہم یہ شہر چھوڑ دیں گے-"

رابطہ ختم ہوگیا- اکبر ریسیور رکھ کر اٹھ گیا فیروزہ کے کمرے کی طرف جانے لگا تاکہ اسے صورت حال سے آگاہ کرے- پھر وہ چلتے چلتے رک گیا ایک دم سے ذہن میں شیطانی سوال پیدا ہوا- اگر یہ سیلاب میں ڈوب جائے گی' بہہ جائے گی' مرجائے گی' تو سارے مصائب ختم ہوجائیں گے-

اس کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی- رگوں میں لہو گرم ہونے لگا فیروزہ نے اپنی ایڈووکیٹ صاحب کو یہ لکھ کر دیا تھا کہ اگر اس کا قتل ہویا حادثاتی موت ہو تو اس کا ذمے دار چودھری اکبر علی ہوگا- لیکن سیلاب تو موت کا قدرتی ذریعہ ہے- اس میں ڈوبنے والوں کی موت کی تفتیش نہیں ہوتی کہ انہیں کس نے ڈبویا؟

لاہور واپڈا' فلڈ وارننگ سسٹم کی نااہلی یا ناکامی نے ڈبویا؟

عوام کو خبردار کیے بغیر منگلا ڈیم کا گیٹ کھولنے والوں نے ڈبویا؟

ضلعی انتظامیہ کی غفلت اور غیرذمے داریوں نے ڈبویا؟

یا چودھری اکبر علی نے اپنی گناہوں کی گٹھری ڈبو دی؟

تقدیر مہربان ہوتی دکھائی دے رہی تھی- اب وہ اس پہلو سے سوچنے لگا کہ سیلاب سے خود اسے کیا نقصان پہنچے گا؟

اسے جواد کے ذریعے خطرے کا علم ہوگیا تھا' وہ بچاؤ کی تدبیر کرسکتا تھا- فیروزہ لاعلم تھی- اکبر نے طے کرلیا کہ اسے بے خبر رکھے گا- ایک بات اور اس کے حق میں تھی کہ وہ تیرنا جانتا تھا- فیروزہ نہیں جانتی تھی-

وہ خیالات سے چونک گیا- فیروزہ لباس بدل کر آگئی تھی اور پوچھ رہی تھی "کن خیالوں میں گم ہو؟ کہاں پہنچے ہوئے ہو؟"

وہ مسکرا کر بولا "اپنی غلطیوں پر غور کر رہا تھا- تمہارے قریب رہ کر تمہاری قدر و قیمت معلوم ہو رہی ہے- شاید اس لیے کہ قریب رہنے سے محبت بڑھتی ہے-"

وہ مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ باہر آئی پھر دروازے کو مقفل کرتی ہوئی بولی "کہاں چلنے کا ارادہ ہے؟"

"دریا کے کنارے چلیں- ذرا دیکھیں پانی کتنا ہے؟"

"پھر تو پیدل چلیں گے- یہاں سے کوئی ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ ہے-"

وہ کوٹھی کے احاطے سے باہر آئے پھر کشادہ گلی سے گزرنے لگے- محلے کی کچھ عورتیں اپنے دروازوں اور چھتوں پر کھڑی ہوئی تھیں- فیروزہ کچھ اور تن کر چلنے لگی- وہ مغرور نہیں تھی- صرف اپنے مرد کے ساتھ چلنے پر فخر کر رہی تھی- اپنے بچے کو اس کے باپ کا نام دیتی جارہی تھی-

وہ عورتیں جو کچھ نہ کچھ بولتی تھیں' اب اس کے خلاف زہر نہیں اگل رہی تھیں- فیروزہ نے کہا "تم مرد بھی کیا ہوتے ہو؟ ہماری بدنامی بھی ہوتے ہو اور ہماری نیک نامی بھی- اب دنیا والوں کی زبانیں بند ہوگئی ہیں-"

وہ بولا "یہ میں نہیں تمہاری دیوانہ وار محبت تمہیں نیک نامی دے رہی ہے-"

اکبر! اب عقل آئی ہے کہ لڑکیوں کو پیار میں حد سے نہیں بڑھنا چاہیے- دراصل میں نے فیروزہ اور شیرو کی رومانی داستان بچپن میں سنی تھی- وہ اس لیے میرے ذہن میں نقش ہوگئی کہ میرا نام بھی فیروزہ ہے- اس کی طرح مجھے بھی شعر و شاعری سے دلچسپی ہے- پتا ہے اس فیروزہ نے اپنے شیرو کی محبت میں گیارہ منظوم کتابیں لکھی تھیں-"

"ہاں- جانتا ہوں جہلم کی وادی میں دونوں کی محبت کے افسانے آج بھی دہرائے جاتے ہیں- رقیبوں نے شیرو کو شب عروسی میں قتل کردیا تھا-"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی "پتا نہیں محبت کی انتہا کو پہنچنے والے بے موت کیوں مرتے ہیں؟"

وہ بولا "تم نے بھی محبوب کو پالینے کا ایک نیا انداز اپنایا ہے- محبت میں انتہا کر رہی ہو-"

"سچی محبت سولی پر چڑھتی ہے یا چناب میں ڈوبتی ہے- خدا جانے میرا انجام کیا ہوگا؟"

وہ دریا کے کنارے پہنچ گئے- شہر کے بہت سے لوگ آرہے تھے- بند کی اونچائی پر خاصی رونق لگی ہوئی تھی- دریا کی لہریں شور مچا رہی تھیں- سب ہی حالات کا جائزہ لینے آئے تھے- اگرچہ دریا سیلابی کیفیت میں تھا- کچھ دھمکیاں سی دے رہا تھا- لیکن یہ دیکھ کر اطمینان ہو رہا تھا کہ پانی خطرے کے نشان سے نیچے ہے-

انسان لاعلمی سے فریب کھاتا ہے اور لاعلمی کے باعث مرتا ہے- نظارہ کرنے والوں کو معلوم نہیں تھا کہ ابھی تین لاکھ کیوسک پانی گزر رہا ہے- اگر منگلا ڈیم کے ذمے دار افسران کی غیرذمے دارانہ حکمت عملی سے اچانک تمام اسپل ویز کھول دیے جائیں گے تو نو لاکھ کیوسک سے زیادہ پانی فی سیکنڈ گزرے گا-

اور تب ڈیم کے انجینیرز اور افسران لاہور واپڈا کے فلڈ کنٹرول سیل کو الزام دیں گے- پھر واپڈا والے محکمہ موسمیات اور محکمہ آبپاشی اور فلڈ وارننگ سسٹم وغیرہ پر الزامات

عائد کریں گے یوں پاکستان کی تاریخ میں اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کرنے والے بڑے صاحبان کی نشاندہی کبھی نہیں ہوگی۔

وہ دریا کے کنارے سے واپس آنے لگے۔ شام کے ساڑھے سات بجے تھے' علاقے کے ایک کونسلر کی گاڑی اعلان کرتی پھر رہی تھی "سیلاب آسکتا ہے' آپ حضرات گھر کا سامان اونچی جگہ یا چھت پر لے جائیں۔ عورتوں اور بچوں کو محفوظ مقام پر پہنچائیں۔"

یہ غیر سرکاری اعلان تھا وہ کونسلر اپنا انسانی فرض سمجھ کر لوگوں کو احتیاطی تدابیر پر عمل کرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ ضلعی انتظامیہ خاموش تھی۔ کونسلر کے اعلان کی سرکاری طور پر تصدیق نہیں ہو رہی تھی۔ سرکاری ذرائع لاعلمی کے اندھیروں میں بھٹک رہے تھے۔ جبکہ اس ملک میں لاعلمی دور کرنے کے کئی قدیم اور جدید ذرائع ہیں۔

چاروں صوبوں میں محکمہ موسمیات کی جائزہ گاہیں ہیں اور ہر ایک گھنٹے میں رپورٹ حاصل کرنے کے اسٹیشن ہیں۔

رپورٹیں حاصل کرنے کے لیے ٹیلی کمیونی کیشن کا نیٹ ورک قائم ہے۔

ٹرانس میٹر اور ٹیلیگرام کے ذریعے بھی رپورٹیں ارسال کی جاتی ہیں۔

سیلاب کے بارے میں پیش گوئی کرنے والا ماحولیاتی مرکز لاہور میں ہے۔ یہ مرکز مکمل طور پر کمپیوٹرائزڈ ہے اور تمام جائزہ گاہوں سے رپورٹیں وصول کرتا ہے۔

مدار کے گرد چکر لگانے والے سیٹلائٹ گھنٹوں میں دو بار پاکستان پر سے گزرتے ہیں اور یہاں کی موسمی رپورٹ کی تصاویر متعلقہ اداروں کو بھیجتے رہتے ہیں۔

مملکت خداداد میں جدید ترین راڈار ہیں جو بتاتے ہیں کہ بارش کتنے انچ فی گھنٹے کے حساب سے ہو رہی ہے اور اس حساب سے دریا میں سیلاب کی صورت حال کیا ہو سکتی ہے۔

ایسے جدید ترین اور ٹھوس معلومات کے ذرائع کی موجودگی میں یہی خیال قائم ہوتا ہے کہ ان شعبوں میں نااہل افسران اور بودے فنی ماہرین ہیں۔

ان کی نا اہلی ناتجربہ کاری اور غیر ذمے داری کی سب سے زیادہ سزا جہلم کے شہریوں کو ملنے والی تھی۔ فیروزہ کوٹھی میں آکر کچن کی طرف گئی تاکہ سالن گرم کرے۔ واپسی میں وہ تندور سے روٹیاں لے آئے تھے۔ اکبر فون کے پاس آکر بیٹھ گیا ڈی سی صاحب سے اس کے بابا جانی مرحوم کی اچھی دوستی تھی۔ اس حوالے سے اس نے فون پر رابطہ کیا پھر ملازم کی آواز سن کر پوچھا "صاحب موجود ہیں؟"

"نہیں جناب وہ بیوی بچوں کو اسلام آباد پہنچانے گئے ہیں۔ واپس آنے ہی والے ہوں گے۔ آپ کون ہیں؟"

اس نے جواب نہیں دیا۔ ریسیور رکھ دیا۔ وہ ڈی سی سے سیلاب کے متعلق کچھ معلوم نا چاہتا تھا۔ اندر سے بے چینی تھی کہ سیلاب نہ آیا تو فیروزہ نہیں ڈوبے گی۔ وہ صدق۔۔

دل سے دعا مانگ رہا تھا۔ یا اللہ سیلاب آجائے۔ ابھی آجائے۔

ہر بندہ اپنا فائدہ دیکھ کر دعا مانگتا ہے یا بد دعا دیتا ہے۔

اگر شہر میں کسی مرض کی وبا پھیل جائے تو یہ شہریوں کے لیے قیامت اور ڈاکٹروں کے لیے رحمت بن جاتی ہے۔

بیرونی ممالک سے ملنے والی لاکھوں ڈالرز کی امداد سے کوٹھیاں اور پلازے بن جاتے ہیں اور متاثرین کے سیلاب زدہ شکستہ مکانات مرمت طلب رہ جاتے ہیں۔ اس لیے سیلاب مخصوص افراد کے لیے باعث رحمت ہے۔

اکبر سیلاب کی دعا مانگ رہا تھا' کوئی نئی کمینگی نہیں کر رہا تھا۔

پھر رات کے دس بجے گھروں میں پانی داخل ہوگیا۔ یہ مرکزی بازار' باغ محلہ' شمالی محلہ اور سول لائن کے مکانات تھے۔ یہ پانی پہلے ٹخنوں تک تھا۔ چند منٹوں میں کمر تک آگیا۔ نو دس لاکھ کیوسک پانی کی رفتار گویا بجلی کی رفتار ہوتی ہے۔ ایسی بلائے ناگہانی کے لمحات میں بجلی تو جاتی ہی تھی۔ عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار سے یوں لگ رہا تھا جیسے ساری کائنات اندھیرے میں ماتم کر رہی ہے۔

یہ پانی پہلے ساحلی آبادیوں میں آیا تھا اور اچانک آیا تھا۔ جن لوگوں نے شام کو اعلان سن کر احتیاطی تدابیر پر عمل کیا تھا انہوں نے اپنے گھر کا قیمتی سامان اور اپنی جانیں بچالی تھیں۔ جن کے مکانات چھوٹے اور کچے تھے انہوں نے درختوں کی بلندیوں پر چارپائیاں باندھ کر وہاں عورتوں اور بچوں کو پہنچا دیا تھا۔

ساحلی علاقے کے بیشتر افراد کے پاس کشتیاں تھیں' وہ کشتیاں زندگی کی علامت بن گئی تھیں۔ ہر کشتی نوح کی کشتی تھی۔ اس پر جسے جگہ مل جاتی وہ موت کے اندھیرے اور سیلاب کے پانی سے نکل کر اونچے خشک مقام تک پہنچ جاتا لیکن کشتی کا کرایہ بڑھ گیا تھا' فی سواری دو سو روپے۔

جس کے پاس دو سو ہیں وہ زندہ رہے ورنہ ڈوب مرے یا درختوں سے لٹکا رہے یا چھتوں پر پانی اترنے کا انتظار کرتا رہے۔ پانی دس سے بارہ فٹ تک تھا۔ کئی مکانوں کی چھتوں پر سے گزر رہا تھا اور دلوں میں یہ دہشت تھی کہ پانی اور بڑھے گا تو اونچی چھتوں پر چڑھے ہوئے لوگ بھی تنکے کی طرح بہہ جائیں گے۔ اس لیے سب ہی کشتی کے ضرورت مند تھے۔

طلب بڑھتی ہے تو ریٹ بھی بڑھتے ہیں۔ پھر دو سو سے زیادہ ادا کرنے والوں کو کشتی میں جگہ ملنے لگی۔ ایسے پانی کے بیچ جہاں دن کا اجالا ہوتا تب بھی دور تک زمین نظر نہ آتی۔ وہاں کاروبار ہو رہا تھا۔ کاروبار کرنے والے بھی مقدر کی خرابی سے ڈوب سکتے تھے۔ لیکن جب تک سلامت تھے نوٹ کما رہے تھے۔

جس علاقے میں چار فٹ پانی تھا وہاں کے ایک بینک میں ڈاکہ پڑا۔ ڈاکوؤں نے اہل

شہر پر احسان کیا ورنہ بچت اسکیم کے لاکھوں روپے پانی میں بہہ جاتے۔

عورتیں قیمتی سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیتی ہیں لیکن زیورات کہیں منتقل نہیں کرتیں۔ کسی کو امانت کے طور پر رکھنے نہیں دیتیں۔ بیٹیوں کو جہیز میں دینے والے زیورات کے سلسلے میں بیٹوں پر بھی بھروسا نہیں کرتیں۔ ایسی عورتوں نے تمام زیورات خود پہن لیے تھے تاکہ وہ اپنی جان کے ساتھ رہیں۔

زیورات سے لدی ہوئی ایک عورت پانی میں بہتی ہوئی ایک درخت کی شاخوں میں آکر پھنس گئی تھی۔ اسی درخت پر پناہ لینے والوں نے اسے دیکھا وہ بیٹی کے جہیز کو بچاتے بچاتے مرگئی تھی۔ کسی مردے کے بدن پر سونے کا بوجھ نہیں رکھا جاتا۔ پناہ لینے والوں نے اس بیچاری کی موت پر افسوس کیا۔ اس کے گلے میں تین عدد نیکلس تھے وہ انہوں نے اتار لیے دس انگلیوں میں دس انگوٹھیاں اور کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں اور کنگن تھے انہیں اتارا نہیں جاسکتا تھا کیونکہ لاش پھول گئی تھی۔ یہ چیزیں جس طرح پہنی گئی تھیں اسی طرح اتاری نہیں جاسکتی تھیں۔ اس لیے انگلیوں کو اور کلائیوں کو چاقو سے کاٹ کر زیورات سے بے چاری کو نجات دلائی گئی پھر اس کی لاش کو آگے بہا دیا گیا۔

ایسے غیر انسانی تماشوں کے برعکس ایمان افروز مناظر بھی دیکھنے میں آتے رہے۔ دلیر اور غیرت مند نوجوان سیلابی ریلے سے لڑتے ہوئے جوان لڑکیوں اور بچوں بوڑھوں کو محفوظ مقامات تک پہنچا رہے تھے کتنے ہی جوان ٹرکوں اور بسوں کے پہیے کھول کر لے آئے تھے اور ان کی ٹیوب کے ذریعے امداد کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ رہے تھے۔

باہر بہت کچھ ہو رہا تھا۔ کوٹھیوں کے اندر فرشی منزل پانی میں ڈوب گئی تھی۔ پناہ لینے کے لیے پہلی منزل اور چھت رہ گئی تھی۔ اکبر نے کہا "پہلی منزل میں بھی خطرہ ہے چھت پر چلو۔"

فیروزہ سہمی ہوئی سی بڑھتے ہوئے پانی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ موت سے نہیں ڈرتی تھی۔ لیکن زندگی سے بھی پیار کرتی تھی۔ اس نے کبھی ایسا سیلاب فلموں میں بھی نہیں دیکھا تھا جو تمام کمروں میں تقریباً" دس فٹ کی اونچائی تک لبالب بھرا ہوا ہو۔ یہ سب کچھ ایک موم بتی کی روشنی میں دکھائی دے رہا تھا۔ دن کا وقت ہوتا تو اور دور تک دیکھنے سے اور اوسان خطا ہوتے۔

وہ خود بھی چھت پر جانے کے لیے سوچ رہی تھی۔ لیکن اکبر کے ساتھ جاتے ہوئے عجیب سی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ موم بتی کی روشنی میں اس کے چہرے کا کچھ حصہ نظر آرہا تھا۔ باقی تاریکی میں چھپا ہوا تھا۔ آدمی پوری طرح نمایاں نہ ہو تو پراسرار اور بھیانک لگتا ہے۔

وہ موم بتی ہاتھ میں لیے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی چھت پر آئی اکبر اس کے پیچھے تھا۔ چھت پر خاصی ہوا چل رہی تھی' وہاں پہنچتے ہی موم بتی بجھ گئی۔ تاریکی میں اکبر کی آواز

ابھری "حیات انسانی کا بھی کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ یہ بھی ہوا کی ایک پھونک سے بجھ جاتی ہے۔"

لہجے میں سفاکی تھی۔ فیروزہ نے پیچھے گھوم کر دیکھا۔ وہ مٹا مٹا سا دکھائی دے رہا تھا۔ اگرچہ ہر سو تاریکی تھی تاہم کھلے آسمان کے نیچے قریب کی چیزیں تھوڑی سی جھلکتی ہیں۔

وہ ذرا پیچھے ہوگئی۔ وہ آگے بڑھ کر بولا "بڑی دیر سے کہہ رہا تھا چھت پر چلو مگر نخرے کر رہی تھی۔ کیا میرے ارادوں کو بھانپ رہی تھیں؟"

وہ سخت لہجے میں بولی "کیسے ارادے؟"

اس نے ہنستے ہوئے کہا "میں چاہتا تو کوٹھی کے اندر ہی بھرے ہوئے پانی میں تجھے دھکا دے دیتا۔ مگر وہاں تیرے بچ نکلنے کا اندیشہ تھا۔ اگر تو بھاگ کر کسی کمرے میں چھپ جاتی اندر سے دروازہ بند کرلیتی تو تجھے باہر نکالنے اور قتل کرنے میں بڑی دشواری ہوتی۔"

"قتل؟" وہ پیچھے ہٹ کر بولی "تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔ کیا پھر اپنی کمینگی پر آرہے ہو؟"

"کمینی تو تم ہو تم نے مجھے جیتے جی مار ڈالا ہے۔ مجھے ایک زندہ لاش بنا دیا ہے۔ اپنے داؤ پیچ کے ذریعہ مجھے عورتوں سے بدتر بنادیا ہے۔"

وہ ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "بھاگ کہاں بھاگے گی؟ کہاں ہیں وہ تیرے قانونی کاغذات جن پر تو نے لکھا تھا کہ اگر قتل ہوگی یا حادثاتی موت مرے گی تو اس کا ذمہ دار چودھری اکبر علی ہوگا۔"

وہ کترا کر بھاگنا چاہتی تھی۔ نیچے کسی کمرے میں پناہ مل سکتی تھی۔ لیکن زینے کی طرف دوڑنے سے پہلی ہی اکبر نے ہاتھ پکڑ کر کھینچا پھر اس کے منہ پر ایک ہاتھ مارا وہ پیچھے جاکر چھت کی پختہ زمین پر گر پڑی۔

اس نے کہا "تیری ایڈووکیٹ کا دفتر فرشی منزل میں ہے وہاں بھی پانی گیا ہوگا اور اپنے ساتھ تیرے قانونی کاغذات بہاکر لے گیا ہوگا اور وہ دس کیسٹیں جس لاکر میں ہوں گے وہاں بھی پانی گھس گیا ہوگا۔"

وہ قہقہہ لگا کر بولا "دیکھ اسے مقدر کا تماشا کہتے ہیں میرے گناہ کے تمام ثبوت قدرت نے مٹا دیے۔ مجھ پر قدرت کی یہ مہربانی ظاہر کر رہی ہے کہ وہ بھی مرد کا ساتھ دیتی ہے۔ عورت ذلت کے لیے زمین پر اتاری گئی ہے اس لیے ہمیشہ ذلیل ہوتی رہے گی۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا "ہمارے پنجاب میں ایک پرانی کہاوت ہے تو نے بھی سنی ہوگی۔ جتی تے رن دی اک مثال آئی۔ آئی تے پائی نہیں تے دور ہٹائی" (جوتی اور عورت کی ایک مثال ہوئی کہ پاؤں میں پوری آئی تو پہن لی ورنہ پھینک دی۔)

وہ زمین پر سے اٹھ رہی تھی۔ اس نے کہا "میں اس بھروسے پر تجھے زندہ نہیں

چھوڑوں گا کہ میرے خلاف تمام ثبوت ضائع ہو چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ محفوظ ہوں اس لیے تجھے اور بچے کو مرنا چاہیے۔"

یہ کہتے ہی اس نے ایک لات ماری اگر وہ فوراً ہی نہ گھومتی تو لات پیٹ پر پڑتی۔ پھر اس سے پہلے بچہ مرتا لیکن ممتا کی بے اختیاری نے اسے بچالیا لات کولہے پر پڑی۔ وہ لڑکھڑاتی اور چیختی ہوئی منڈیر پر آکر گری۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ وہاں سے اٹھتی یار دشمن نے پیچھے سے اس کی ٹانگیں پکڑ کر اسے چھت کے کنارے سے دوسری طرف الٹا دیا۔

اس کی چیخ دور تک گونجی۔ پھر گہرے پانی میں چھپاکا سا ہوا۔ پانی کے اڑتے ہوئے چھینٹے اکبر کے اوپر بھی آئے۔ "بچاؤ' بچاؤ!" اس کی آواز ابھر رہی تھی اور ڈوب رہی تھی۔ اکبر منڈیر پر سے جھک کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ وہ اندھیرے میں نظر نہیں آرہی تھی۔ صرف پانی میں ہاتھ پاؤں مارنے اور مدد کے لیے پکارنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

وہ بولا۔ "چلاتی رہو۔ میں حد سماعت تک ایسے کتنے ہی چیخنے پکارنے والوں کی آوازیں سن چکا ہوں۔ ان حالات میں کون سمجھے گا کہ قتل ہو رہا ہے۔"

وہ وہاں سے پلٹ گیا۔ چھت پر گری ہوئی موم بتی تلاش کرنے لگا۔ چھت کے نیچے کوٹھی کے باہر وہ کبھی ڈوب رہی تھی اور کبھی ابھر رہی تھی۔ اسے تیرنا نہیں آتا تھا۔ یونہی ہاتھ پاؤں مار رہی تھی اور یہ سمجھ رہی تھی کہ ڈوبنا مقدر بن گیا ہے۔

لیکن مقدر کے بدلتے ہوئے مزاج کو کون سمجھا ہے جو سمجھے گا۔ اچانک کسی نے اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ وہ خوف سے اور تکلیف سے چیخ پڑی۔ پھر گہری سانسیں لینے لگی۔ وہ گہرے پانی کی سطح پر تھی اور ڈوب نہیں رہی تھی۔ کوئی اس کا سر پانی سے اوپر اٹھائے ہوئے اسے کھینچتا ہوا لے جارہا تھا اور اسے پور طرح سانس لینے کا موقع دے رہا تھا۔

کوٹھی کے پچھلے حصے میں ایک زینہ تھا جو پہلی منزل تک گیا تھا۔ کسی نے کہا "زینے کی ریلنگ پکڑو اور اوپر چڑھو۔"

وہ فرشتے کی مدد سے زینے پر چڑھ کر اوپر آئی پھر پچھلا دروازہ کھول کر ایک راہداری میں آئی۔ اچانک روشنی ہوگئی۔ اسے بچانے والے نے ٹارچ روشن کی تھی۔ وہ ٹرک کے ایک پہیئے والے ٹیوب کو فرش پر رکھ رہا تھا۔ اس نے اسی ٹیوب کے ذریعے تیر کر اس کی جان بچائی تھی۔ وہ کوئی سترہ اٹھارہ برس کا نوجوان تھا۔ چہرہ معصوم مگر پرعزم تھا۔ اس نے پوچھا "باجی! آپ کیسے گر پڑی تھیں؟"

فیروزہ نے سر اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا۔ پھر دونوں بانہیں پھیلا کر آگے بڑھ کر نوجوان کو آغوش میں لیا۔ اسے سینے سے لگا کر بولی "میرے ویر! تیرے جیسے جوانوں سے ابھی بہنوں کے دوپٹے سلامت ہیں۔ تو نہیں جانتا کہ تونے مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ لیکن اب اتنی زندگی نہیں رہی کہ تیرا احسان یاد رکھ سکوں۔"

"باجی! آپ کیا کہہ رہی ہیں' کیا آپ بیمار ہیں؟"

"نہیں میرے بھولے ویر! ایک احسان اور کر' یہ ٹارچ مجھے دے دے۔"

"آپ لے لیں میرے پاس ایک اور ٹارچ ہے۔"

وہ اسے دروازے کی طرف لے جاتے ہوئے بولی "اب تو یہاں سے جا مجھے بڑا کام پڑا ہے۔"

وہ ٹرک کا ٹیوب اٹھا کر دروازے سے باہر گیا۔ فیروزہ نے دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ ٹارچ بجھادی۔ ابھی روشنی کی ضرورت نہیں تھی۔ اس بڑے سائز کی ٹارچ سے بہت تیز روشنی خارج ہوتی تھی۔ اس پر آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی اکبر نیچے آتے ہوئے روشنی کو دیکھ کر بدک سکتا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ دشمن کو اس کی ناکامی کا علم ہو۔

اس کوٹھی کا ہر حصہ جانا پہچانا تھا۔ وہ تاریکی میں راستہ ٹٹول کر اس حصے کی طرف جانے لگی جدھر چھت پر جانے والا زینہ تھا۔ وہ اکلوتی موم بتی جو چھت پر کہیں گر پڑی تھی اکبر کو نہیں ملی۔ وہ چھت پر گھٹنے ٹیک کر دونوں ہاتھوں سے اسے ڈھونڈتا رہا پھر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ نیچے نہیں جانا چاہیے۔ پانی کسی وقت بھی پہلی منزل میں آسکتا ہے۔ اندھیرے میں بھاگ کر پھر چھت پر آنا چاہے گا تو پتا نہیں کہاں ٹکریں کھاتا پھرے گا بہتر ہے چھت پر ہی رہے۔

اچانک ہی چھت پر روشنی ہوگئی۔ وہ ایک دم سے اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ روشنی میں آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ اس نے منہ پھیر کر پوچھا "کون ہے؟"

"جونک!" فیروزہ کی زہریلی آواز سنائی دی۔

وہ دہشت اور حیرانی سے چیخ پڑا "تم... تم زندہ ہو؟"

وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا فیروزہ نے ٹارچ کی روشنی میں اپنا دوسرا ہاتھ دکھایا۔ اس ہاتھ میں ایک لانبا چاقو تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ رک گیا۔ اپنی آنکھوں کے سامنے ہاتھ کا پردہ کرتے ہوئے کہا۔ "ٹارچ ہٹاؤ۔ مجھے دیکھنے دو۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گی۔ پھر ایک بار مرنے آئی ہو۔"

وہ پیچھے ہٹنے لگا تاکہ روشنی سے دور ہوسکے۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی "ہاں میں مرنے ہی آئی ہوں۔ جب اچھی طرح یقین ہوچکا ہے کہ تم مجھے مرتے دم تک عزت و آبرو سے نہیں اپناؤ گے اور میرا بچہ حرام کی اولاد کہلائے گا تو پھر مجھے اور بچے کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ تمہارے ساتھ مرجانا چاہیے۔"

وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بالکل منڈیر سے لگ گیا وہ بولی "میں چاقو پھینک رہی ہوں اسے پکڑو اور مجھے مار ڈالو۔"

یہ کہتے ہی اس نے چاقو کو اس کی طرف سر سے اوپر اچھالا ٹارچ کی روشنی میں چاقو ادھر گیا وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر اسے کیچ کرنے ہی والا تھا کہ فیروزہ نے ایک چیخ مار کر ٹارچ کو

پھینکتے ہوئے اس پر چھلانگ لگائی اس کے سینے سے لپٹ گئی۔ ایسے میں وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ اس کے حلق سے بھی چیخ نکلی پھر گہرے پانی میں زوردار چھپاکا سا ہوا اس کے چھینٹے بلندی تک اڑ کر واپس آگئے۔

وہ دونوں ایک جان دو قالب ہو کر پانی کی گہرائی میں چلے گئے۔ اکبر نے تیر کر سطح پر آنے کے لیے فیروزہ کو اپنے جسم سے الگ کرنا چاہا لیکن وہ یوں لپٹی ہوئی تھی کہ دونوں ہاتھ اس کی پشت پر لے گئی تھی پھر دس انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا لیا تھا اور اس کی ایک ٹانگ کو اپنی دونوں ٹانگوں میں جکڑ لیا تھا۔

تیرنے کے لیے دونوں ہاتھ پاؤں کا آزاد رہنا لازمی ہے۔ وہ صرف دونوں ہاتھ پانی میں چلا رہا تھا لیکن فیروزہ کے بوجھ سمیت سطح پر ابھر نہیں سکتا تھا۔ دم گھٹ رہا تھا سانس روکنے کی صلاحیت جواب دے رہی تھی۔ اگر وہ پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر کرتا تو شاید وہ معاف کردیتا مگر جونک چمٹ جاتی ہے تو پھر معافی کی گنجائش نہیں چھوڑتی۔

سوہنی رے سوہنی! جہلم میں بھی تجھے کچا ہی گھڑا ملا۔

———— ————

کزن

کزن ایک رشتہ ہے۔ ایک پردہ ہے۔
کسی حسینہ کے ساتھ سرعام پکڑے جاؤ
تو کہہ دو، میری کزن ہے۔
لوگ مطمئن ہو جائیں گے اور
قانون معاف کردے گا۔
لیکن ایک باحیا اور عزت دار لڑکی
کزن کے رشتے کو گناہ نہیں بناتی
سزا بنا دیتی ہے۔

ایسی ہی ایک کزن نے اپنے بدنیت کزن کو
ایسی سزا دی جو قانون کی کتاب میں نہیں ہے۔
عورت کے حجاب میں ہے یا پھر یوم حساب میں ہے۔

میرے گھر والے مجھے اللہ میاں کی گائے کہتے تھے۔ جب میں نے میٹرک کا امتحان اپنے ضلع سے پاس کر لیا تو میری یہی سادگی اور معصومیت مزید تعلیم کے لئے مسئلہ بن گئی۔ گھر میں ہر وقت یہ بحث رہتی کہ میں شہر جا کر کیسے تعلیم حاصل کروں۔ خاص طور پر اماں میری جدائی گوارا نہیں کر سکتی تھیں مگر ابا مجھے ضلع کا ڈی سی دیکھنا چاہتے تھے۔ شہر میں میرے چاچا رہتے تھے۔ اماں کو ان پر بھروسا نہیں تھا۔ کہتی تھی' لاکھ سگے سہی مگر والدین کی طرح خیال نہیں رکھیں گے۔ انہیں دراصل یہ ڈر تھا کہ میں شہر ہی کا ہو کر نہ رہ جاؤں۔ میری سادگی اور احمقانہ شرافت کو شہر کی مکاریاں کھا نہ جائیں۔

ہر ماں یہی چاہتی ہے کہ اس کا بیٹا شادی کے بعد بھی پلو سے بندھا رہے۔ اس کے بیٹے پر بہو کا بھی بھرپور سایہ نہ پڑے لیکن بہو تو ابھی کوسوں دور تھی۔ مسئلہ تعلیم کا تھا۔ ابا مجھے زیادہ سے زیادہ تعلیم دلا کر اعلیٰ سرکاری افسر بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ ان کے انہی بلند حوصلوں نے مجھے شہر کی رنگینیوں میں پہنچا دیا۔

چاچا امام بخش ریلوے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ ہمارے خاندان میں صرف انہوں نے بی اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ دوسرا میں تھا جو کالج میں داخل ہونے شہر آیا تھا۔ چاچی نے ہمیں دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا "بھائی جان' ہمارے گھر میں ایک بیٹے کی کمی تھی' وہ آپ نے پوری کردی۔ میں اسے اتنا پیار دوں گی کہ ہمیں اماں ابا سمجھ کر آپ کو بھول جائے گا۔"

ابا نے ہنستے ہوئے کہا "یہ بات اس کی ماں کے سامنے نہ کہنا۔ ورنہ بواپسی ڈاک سے بیٹے کو بلا لے گی۔"

سب ہنسنے لگے۔ ان کا اپنا بیٹا نہیں تھا۔ صرف ایک بیٹی شاہدہ تھی جو مجھ سے پانچ برس چھوٹی تھی۔ اس لیے میری اہمیت پہلے ہی روز سے اس گھر میں وی آئی پی جیسی ہو گئی تھی۔ ابا مجھے چھوڑ کر اسی شام گاؤں واپس چلے گئے۔

میں نے اپنے ضلع میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کئے تھے اس لئے شہر کے اچھے کالج میں داخلے کے لئے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ پندرہ بیس دن میں ہی میری نئی زندگی کا سفر

شروع ہو گیا۔ میں نے خود کو انہی اصولوں کا پابند رکھا' جو گاؤں میں تھے۔ کسی اہم وجہ کے بغیر چھٹی کا سوال ہی نہیں تھا اور نہ ہی بعض طلبہ کی طرح آوارگی کی مجھے عادت تھی۔

چاچا اور چاچی دونوں ہی مجھ سے خوش تھے۔ کیونکہ میں شہری ماحول میں پرورش پانے والے لڑکوں سے بہت مختلف تھا۔ صوم و صلواہ کا پابند۔ میں جب سے ان کے گھر آیا تھا' فجر کی ایک بھی نماز قضا نہیں ہوئی تھی۔ باجماعت نماز کے بعد قرآن کی تلاوت اس کے بعد صبح کی سیر میرے معمولات میں شامل تھے۔ میں اپنی صحت کا خاص خیال رکھتا تھا۔ چاچی ہمیشہ میری اچھی خوراک پر توجہ دیتی تھیں۔ وہ میرے صحت مندانہ طور طریقوں پر قربان ہوتی رہتی تھیں۔ آتے جاتے میری بلائیں لیتی تھیں اور چاچا بھی تعریفی نظروں سے دیکھتے رہتے تھے۔ اگر اپنے منہ میاں مٹھو بننے والی بات نہ ہو تو میں ان کے دعوے کے مطابق لاکھوں میں ایک تھا۔

وہ مجھے کیوں اتنا چاہتے تھے' مجھ پر کیوں قربان ہوتے رہتے تھے میں نہیں جانتا تھا۔ مجھ میں ان دنوں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ کسی کو نظروں سے یا باتوں سے پہچان پاتا۔ ہمیشہ نگاہیں نیچے کئے اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ شاہدہ کے ساتھ ایک ہی چھت کے سائے میں رہنے کے باوجود وہ میرے لئے نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ کبھی سوچتا ہی نہیں تھا کہ وہ ایک جوان لڑکی ہے۔ بچپن سے جو ذہنی پرورش پائی تھی اس کے مطابق وہ صرف چچا زاد بہن نظر آتی تھی۔ وہ بچپن سے شہر میں زندگی گزار رہی تھی لیکن گھر کا ماحول گاؤں جیسا تھا اور زندگی کی شوخیاں اس میں رچی بسی تھیں۔ وہ مجھے تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ میری سادگی اس کے لئے ایسی تھی جیسے میں جنگل سے آیا ہوں۔ وہ کھیل ہی کھیل میں میرا تماشا بنا دیتی تھی۔ ایک شام چاچا صحن میں بیٹھے ہوئے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ چاچی کھلے کچن میں روٹیاں پکا رہی تھیں اور وہ بھینس کا دودھ دوہ رہی تھی۔ میں نیم کے سائے میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس نے مجھے آواز دی "کزن! ذرا دوسرا ڈول پکڑانا' یہ بالٹی بھر گئی ہے۔"

چاچی نے وہیں سے چلا کر کہا "نی شادہ! اسے تنگ نہ کر۔ خود ہاتھ بڑھا کے پکڑ لے۔ ڈول کون سا دور ہے؟"

میں ڈول لے کر اس کے پاس آگیا۔ اس نے ترچھی نظروں سے دیکھا' مسکرائی پھر ڈول پکڑتے ہوئے بولی "کھڑے کیا ہو۔ جھک کر بالٹی ہٹاؤ۔ پھر میں یہ خالی ڈول رکھوں گی۔"

اس نے دوپٹے کو سر کے چاروں طرف یوں باندھ رکھا تھا جیسی سر میں درد ہو۔ کھلے گریبان کا کرتا پہنے ہوئے تھی۔ میں اس کے کہنے پر ذرا سا جھک گیا۔ جھکتے ہی مجھے کچھ نظر آیا۔ نظر آنا اور بات ہے سمجھ میں آنا اور بات ہے میرا ذہن اتنا معصوم تھا کہ میری آنکھیں فوراً ہی زاویہ بدل کر بھینس کے تھن کو دیکھنے لگیں۔ اسی وقت شاہدہ نے تھن سے نکلنے والی دودھ کی دھار میرے منہ کی طرف کر دی۔ میں بوکھلا گیا۔ فوراً ہی پیچھے

ہٹ سکا- کچھ دودھ آنکھوں میں گیا کچھ میرے کھلے ہوئے منہ میں- باقی چہرہ دودھیا گیا- وہ زور زور سے ہنسنے لگی- چاچا بھی اس کی چھیڑ خانی پر مسکرانے لگے- چاچی نے غصے سے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "تو میرے پتر کا مذاق اڑاتی ہے-"

وہ ہنستے ہوئے بولی "امی! کبھی اس کی ماں نے دعائیں دی ہوں گی دودھوں نہاؤ اور پوتوں پھلو- آج میں نے آدھی دعا پوری کر دی ہے-"

اس بات پر سب ہنسنے لگے- چاچا نے مجھ سے کہا "پتر! بھائی جان اور بھابی جان نے تجھے مٹی کا مادھو بنا کر رکھا ہے- ارے گھر میں مذاق کا جواب مذاق نے نہیں دیتا' کالج میں کیا کرتا ہو گا؟ لڑکے تیرا مذاق اڑاتے ہوں گے-"

"یہ بات نہیں ہے چاچا! میں اینٹ کا جواب پتھر سے دینا جانتا ہوں- یہ تو اپنے گھر کی بات ہے- یہ مذاق کر کے خوش ہو جاتی ہے- میں اس کا دل رکھ لیتا ہوں-"

چاچی نے کہا "ہرگز نہیں' یہ ایک کہے تو دس سنایا کر- یہ مذاق کرے تو تو بھی منہ توڑ جواب دیا کر-"

میں نے کہا "چاچی! آپ اجازت دیتی ہیں تو یہ لیجئے-"

یہ کہتے ہوئے میں نے شاہدہ کے سر سے بندھا ہوا دوپٹہ ایک جھٹکے سے کھینچا- وہ گرتے گرتے بچی- پھر میں نے اس کے دوپٹے سے اپنے چہرے کے سارے دودھ کو پونچھا- وہ مسکرا کر دیکھ رہی تھی- میں نے اپنی چپل میں سے ایک پیر نکال کر اس پیر کو بھی دوپٹے سے پونچھا- وہ ایسے غصے سے دیکھ رہی تھی جس میں ہلکی سی مسکراہٹ بھی تھی- پھر میں نے اس دوپٹے کو اس کی گود میں پھینک دیا- چپل پہن کر چاچی سے بولا "کیوں چاچی! کیسی رہی؟"

"اچھی رہی- اسے ڈھیل دے گا تو یہ ناک میں دم کرتی رہے گی- اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا کر-"

کچھ باتیں کچھ گھاتیں سمجھنے کے لئے ہوتی ہیں- استاد آ کر نہیں سمجھاتا ہے لیکن میں تو پنڈ سے لے کر یہاں تک استادوں کے ذریعے ہی ہر بات سمجھتا آیا تھا- اس لئے یہ جان نہ پایا کہ چاچا اور چاچی ہم دونوں کو یونہی گھلتے ملتے دیکھنا چاہتے تھے-

گرمی کے دن تھے- دن کے وقت لو چلتی تھی- رات کو حبس ہوتا تھا- ہم سب چھت پر سویا کرتے تھے لیکن شام ہی سے اچانک بارش ہونے لگی- چاچا نے جو بڑی سی کوٹھی بنوائی تھی اس میں ایک ڈرائنگ روم اور چار بیڈ روم تھے- ہم سب کے لئے ایک ایک کمرا وقف تھا- راہداری کے ایک طرف میرا کمرا تھا اور دوسری طرف شاہدہ کا- یوں ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے رہتے تھے- وہ کوئی سستے خیالات اور جذبات والی لڑکی نہیں تھی- بہت ریزرو رہتی تھی- شاید بچپن سے اپنے والدین کی زبانی سنتی آئی ہو گی کہ اس کا رشتہ مجھ سے ہو جائے گا' چودھرائن بن کر لاکھوں کروڑوں میں کھیلے گی پھر آپس میں سب

دیکھے بھالے ہیں یہ اندیشہ نہیں رہے گا کہ سسرال جا کر بیٹی کی قسمت پھوٹنے والی ہے- ماں باپ اپنی بیٹی کی بھلائی چاہتے ہیں- چاچا اور چاچی بھی تہذیب کے دائرے میں رہ کر ہمیں ایک حد تک آزادی دیتے تھے اور ہم پر کڑی نظر بھی رکھتے تھے- پھر یہ کہ انہیں اپنی بیٹی پر پورا اعتماد تھا اور میری معصومیت اور شرافت کے تو وہ معتقد ہو چکے تھے- بہرحال میں کہہ رہا تھا کہ شاہدہ نے مجھ میں یہ خوبیاں دیکھی تھیں- مجھے پسند کیا تھا- اسی لئے میری طرف مائل ہوتی جا رہی تھی- اس رات میں اپنے کمرے میں میز کے پاس بیٹھا پڑھ رہا تھا راہداری کی دوسری طرف اس کے کمرے کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا- وہ کبھی ادھر کبھی ادھر آتی جاتی رہتی تھی- کبھی کوئی چیز گرا کر مجھے اپنے کمرے کی طرف دیکھنے پر مجبور کرتی تھی-

ایک بار میں نے ادھر دیکھا- وہ ایک چھوٹا سا آئینہ پکڑے اپنے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا رہی تھی- میں پھر کتاب پر جھک گیا سوچنے لگا یہ اتنی رات کو سرخی کیوں لگا رہی ہے؟

پھر میں نے سوچا یہ دن کو سرخی لگائے یا رات کو میری' بلا سے' مجھے پڑھنے میں دل لگانا چاہئے- میں پڑھنے لگا مگر حروف آپس میں گڈمڈ ہونے لگے- کتاب کے صفحے پر وہ آئینہ دیکھ کر سرخی لگاتی ہوئی دکھائی دی- میں نے جھنجلا کر پھر اس کمرے کی طرف دیکھا اب اس کے ہاتھ میں آئینہ نہیں تھا- ململ کا سفید دوپٹہ تھا- وہ اس دوپٹے کو اپنی کھلی ہوئی ہتھیلیوں پر رکھ کر اس پر جھک رہی تھی- اسے چومنے والی تھی- میں نے تجسس سے دیکھا وہ آخر کیا کر رہی ہے؟

اس نے اپنے سرخ ہونٹ اس ململ کے دوپٹے پر رکھ دیئے- میں میز کے پاس سے اٹھ کر دروازے پر آیا- پھر دھیمی آواز میں بولا "اے! یہ کیا حماقت ہے- دوپٹے پر دھبا کیوں لگا رہی ہو؟"

وہ پیر پٹختی ہوئی اپنے کمرے سے نکل کر میرے دروازے پر آئی- پھر میرے ہاتھ میں اپنا دوپٹہ رکھتے ہوئے بولی "دھبا تو تم نے لگایا ہے- اپنے پاؤں کی مٹی پونچھی تھی- وہ مٹی ابھی تک لگی ہوئی ہے-"

تب مجھے یاد آیا کہ یہ وہی دوپٹہ ہے جس سے میں نے پہلے چہرے کو پھر پاؤں کو پونچھا تھا- میرے پاؤں کی مٹی ابھی تک اس دوپٹے پر لگی ہوئی تھی لیکن جہاں مٹی لگی تھی وہیں ہونٹوں کے سرخ نشان پڑے ہوئے تھے- کوئی یقین نہیں کرے گا کہ میں اتنا بھولا تھا کہ اب بھی کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا- میں نے اس سے کہا- "یہ کون سی عقل مندی ہے' میں نے تھوڑی سی مٹی لگائی تو تم نے سرخ دھبا لگا دیا- توبہ توبہ' تمہارے ہونٹوں پر بھی مٹی لگی ہو گی- تم بہت گندی ہو-"

اس نے بڑے دکھ سے مجھے دیکھا- اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ میں اس کے لبوں کی سرخی کو دھبا کہہ رہا ہوں- کوئی عقیدت سے محبوب کے نقش پا پر چلتا ہے- اس نے محبت سے میرے خاک پا پر ہونٹ رکھ دیئے تھے اور میں اسے غلیظ کہہ رہا تھا- حسن

غلاظت کا خیال کرتا تو کیچڑ میں نہ کھلتا۔ یہ باتیں اب سمجھ رہا ہوں۔ ان دنوں ان معاملات میں عقل سے پیدل تھا۔

وہ بولی "میں کچھ نہیں جانتی۔ تم نے دھبا لگایا ہے۔ اسے ابھی مجھے دھو کر دو۔"

میں نے کہا "ابھی ضروری نہیں ہے۔ کل صبح دھو کر دوں گا۔"

"کیا امی اور ابا سے مار کھلاؤ گے۔ وہ سو رہے ہیں اس لئے ابھی جاؤ اور اسے دھو کر لاؤ۔"

"ایک تو تم نے پہلے شرارت کی۔ شرارت کا جواب میں نے دیا تو یہ دوپٹہ دھلوانا چاہتی ہو۔ کوئی بات نہیں' یہاں ٹھہرو ابھی دھو کر لاتا ہوں۔"

میں پلٹ کر اپنے کمرے کے اٹیچ باتھ روم میں جانا چاہتا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے دوپٹے کو چھین لیا پھر مسکرا کر کہا "خدا کی قسم' اتنا دھلا ہوا صاف اور شفاف ذہن شاید ہی کہیں دیکھنے میں آتا ہو۔"

یہ کہتے ہی وہ اپنا دوپٹہ لے کر کمرے میں گئی۔ پھر دروازے کو بند کر لیا میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تعلیم حاصل کرنے شہر آؤں گا تو کالج کے علاوہ بھی کئی نادیدہ درس گاہیں ملیں گی جہاں ایسے سبق پڑھائے جائیں گے جو ابتداء میں میری سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ پھر نا سمجھی میں رفتہ رفتہ سمجھتا چلا جاؤں گا۔

جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کالج میں کچھ اوباش قسم کے لڑکے بھی ہوتے ہیں۔ یہ اکثر امیر گھرانوں سے آتے ہیں۔ انہیں تعلیم سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ یہ سیاست کے لئے آتے ہیں یا لڑکیوں کی صحت دیکھنے کے لئے۔ انہیں حسن کی دھوپ میں آنکھیں سینکنے کا مزہ آتا ہے یہ ایسے ہی مزے کے لئے کالج آتے جاتے ہیں۔

میرے کالج میں قاسم' ریاض' اسلم اور محمود ایسے طلبا تھے' جن کی شرارتوں پر کبھی ہنسی آتی تھی اور کبھی غصہ۔ جب وہ کسی لڑکی پر فقرہ کستے تھے' کسی کے قریب سے ستا سا شعر سنا کر گزرتے تو مجھے غصہ آتا تھا۔ جو طالبہ سیدھی ہوتی تھی' وہ تلملا کر رہ جاتی تھی' جو ٹیڑھی ہوتی تھی' اسے وہ چاروں یاد رکھتے تھے اور اس سے کترا کر گزر جاتے تھے۔

انہوں نے ابتداء میں مجھے نظر انداز کیا۔ پھر انہیں معلوم ہوا کہ میں بہت بڑے زمیندار کا بیٹا ہوں اور ان کی طرح اونچے طبقے سے تعلق رکھتا ہوں' تو وہ مجھ سے باتیں کرنے اور بے تکلف ہونے لگے۔ کلاس میں میرے آس پاس آکر بیٹھنے لگے۔ تب میں نے کہا "پروفیسر کے لیکچر کے وقت باتیں نہ کیا کرو۔ میں یہاں صرف پڑھنے آتا ہوں۔ دوستی کرنی ہوگی تو کالج کے باہر دنیا پڑی ہے۔"

ایک روز میں سائنس کے پریکٹیکل کے لئے لیبارٹری جا رہا تھا۔ وہ چاروں نظر آئے۔ لیبارٹری کے دروازے پر قاسم نے راستہ روک لیا۔ میں نے پوچھا "یہ کیا حرکت ہے؟"

اس نے کہا "یار! تم ہم سے دوستی نہیں کرتے' نہ سہی۔ کوئی زبردستی نہیں ہے لیکن

کسی اور کا تو دل نہ توڑو۔"

"میں کس کا دل توڑ رہا ہوں؟"

محمود نے قریب آکر کہا "کمال ہے۔ کسی پر قیامت گزر رہی ہے اور تمہیں خبر نہیں ہے۔"

"کس پر قیامت گزر رہی ہے؟ بات صاف صاف کرو"

"وہ صاف صاف نظروں سے تمہیں دیکھتی رہتی ہے اور تم نظریں چرا کر گزر جاتے ہو۔"

"میں کسی سے نظریں نہیں چراتا۔ مجھ سے ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ کسی لڑکی کو بدنام کرنا اچھی بات نہیں ہے۔"

"بدنامی تو اس وقت ہوتی ہے جب کسی کی مرضی کے خلاف اس کا نام اپنے نام کے ساتھ لگایا جائے۔ یہاں بدنامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ لڑکی خود ہی تم سے راضی ہے۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا "تم کس کی باتیں کر رہے ہو؟"

"بھئی شاہدہ کی بات کر رہا ہوں۔ وہ تو گھر سے پڑھنے نہیں تمہیں دیکھنے آتی ہے۔"

میرا دماغ ایک دم سے گرم ہو گیا۔ میں نے یکبارگی اس کا گریبان پکڑا۔ اسے جھنجھوڑا پھر اسے رگیدتا ہوا ایک دیوار سے جا کر لگا دیا۔ اس کا گلا دبوچ کر بولا "تم میری بہن کو بدنام کر رہے ہو۔ اتنے کمینے ہو کہ مجھے اس کے ساتھ بدنام کر رہے ہو۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

اس کے تینوں ساتھیوں نے مجھے تین طرف سے پکڑ کر پوری قوت سے الگ کرتے ہوئے کہا "بھائی معاف کرو۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ وہ تمہاری بہن ہے۔"

قاسم نے کہا "نہ تم کبھی شاہدہ کے ساتھ آئے نہ شاہدہ نے بتایا کہ تم اس کے بھائی ہو۔"

ریاض نے کہا "یار! میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کا کوئی بھائی کا نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ہم سگے نہیں ہیں۔ وہ میرے چاچا کی بیٹی ہے۔"

وہ چاروں ہنسنے لگے۔ ایک نے کہا "تو یوں کہو نا کہ وہ تمہاری کزن ہے۔ یار تم نے تو ڈرا ہی دیا۔ اسے بہن کہہ کر ہم پر چڑھ دوڑے۔"

میں نے چونک کر کہا "لیکن شاہدہ تو کالج میں نہیں پڑھتی ہے۔ اس نے میٹرک کے بعد تعلیم چھوڑ دی ہے۔ اب گھر میں رہا کرتی ہے۔ تم لوگ کس شاہدہ کی بات کر رہے ہو؟"

چاروں نے مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ پھر سب کے سب ہنسنے لگے۔ ریاض نے میرے شانے پر ہاتھ مار کر کہا "واہ رے بھولے بادشاہ! اتنی دیر سے ہمیں بھی چکر میں ڈال

رکھا تھا۔"

اسلم نے کہا "چلو یہ بات صاف ہو گئی کہ ہمارے کالج والی شاہدہ تمہاری بہن وہن کزن وزن نہیں ہے۔"

محمود نے میرے کسرتی بدن پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "کیا قد ہے اور کیا باڈی ہے۔ سپرمین لگتے ہو۔ اسی لئے لڑکیاں تم پر مرتی ہیں ......"

میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے آگے کچھ کہنے سے روکتے ہوئے کہا "پلیز! ابھی میں نے جو زیادتی تم سے کی ہے اس کی معافی چاہتا ہوں اور التجا کرتا ہوں کہ میرے سامنے لڑکیوں کا ذکر نہ کیا کرو۔ مجھے ایسی باتوں سے دلچسپی نہیں ہے؟"

"سچ کہہ رہا ہوں۔ میری محبت علم سے ہے۔ میری محبوبہ کتابیں ہیں۔ شاید میں نے یہاں کسی شاہدہ کو دیکھا ہو لیکن اسے نہیں پہچانتا ہوں اور نہ ہی پہچاننا چاہتا ہوں۔"

"لیکن اس بے چاری کا کیا بنے گا؟"

"اس سے تمہاری باتیں ہوتی ہوں تو سمجھا دینا۔ مجھے تعلیمی ادارے میں بدنام نہ کرے۔"

ایک نے ہنستے ہوئے کہا "کسی لڑکی سے لڑکا بدنام ہوتا ہے' یہ آج سنا ہے۔"

میں نے کہا "میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ اسے یہ بھی سمجھا دینا' وہ میری بدنامی کا باعث بنے گی تو میں پرنسپل صاحب سے شکایت کر دوں گا۔"

"پرنسپل صاحب سے؟" وہ چاروں ہنسنے لگے "بھئی کمال ہو گیا۔ پرنسپل صاحب سے ایک لڑکی کی شکایت کرو گے؟ بھئی مزہ آ گیا۔"

وہ چاروں ہنستے ہنستے گھاس پر گر کر لوٹنے لگے' ایک نے کہا۔ "اوہ گاڈ! یہ تو نے کیا نمونہ بھیجا ہے۔ ہم نے اب تک یہی دکھا ہے کہ لڑکیاں پرنسپل کے پاس جا کر لڑکوں کی شکایت کرتی ہیں۔"

دوسرے نے کہا "فلموں میں بھی یہی دیکھتے ہیں مگر یہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہے۔ ایک لڑکی کے خلاف دہائی دینے پرنسپل کے پاس جائے گا۔"

یہ ہنسنے کی بات نہیں تھی' سمجھنے کی بات تھی مگر وہ اپنے مزاج کے مطابق میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ میرے پاس ان سے بحث کرنے یا الجھنے کا وقت نہیں تھا۔ پریکٹیکل کا وقت ہو گیا تھا۔ میں لیبارٹری میں چلا گیا۔

دوسرے دن کالج کے احاطے میں داخل ہوا تو ایک دیوار کی طرف دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ ایک بڑا سا کاغذ دیوار پر چپکا ہوا تھا۔ اس پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔ "اے لڑکی! تجھے چھیڑتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ تیرا کوئی باپ بھائی نہیں ہے۔"

میں نے اسے پڑھ کر زیر لب کہا "کیا بے ہودہ مذاق ہے۔"

میں آگے بڑھ گیا۔ یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ تحریر مجھ سے ہی تعلق رکھتی ہے۔

آگے جا کر ایک اور دیوار پر ویسا ہی کاغذ چپکا ہوا تھا جس پر لکھا ہوا تھا "اے خبردار! مجھے چھیڑو گی تو پرنسپل سے شکایت کردوں گا۔"

یہ پڑھتے ہی میں سٹپٹایا۔ بات سمجھ میں آ گئی۔ ان چاروں نے پچھلے دن پرنسپل کے حوالے سے میرا مذاق اڑایا تھا۔ میرے جی میں آیا کہ پھر ان میں سے ہر ایک کا گریبان پکڑوں اور ان کی خوب پٹائی کروں لیکن عقل نے سمجھایا۔ میں یہ ثابت نہیں کر سکوں گا کہ وہ سب میرے ہی خلاف لکھا گیا ہے۔

کمبختوں نے ہر جگہ دیواروں پر کچھ نہ کچھ لکھ رکھا تھا۔ لڑکیاں پڑھ پڑھ کر ہنس رہی تھیں۔ کالج کے برآمدے میں ایک طالب علم نے مجھے روک کر پوچھا "یہ سب کس نے لکھا ہے؟ کس کے لئے لکھا ہے؟"

میں نے ناگواری سے جواب دیا "میں نہیں جانتا۔ جس نے لکھا ہے اس سے پوچھو۔"

میں تیزی سے چلتا ہوا کلاس روم میں آیا۔ وہاں بھی دو تین لڑکوں نے یہ سوال کیا "آخر وہ کون ہے جس سے یہ تحریریں منسوب کی گئی ہیں؟"

میں نے جھنجلا کر کہا "تم لوگ مجھ سے ہی کیوں پوچھ رہے ہو؟" کیا لکھنے والوں نے مجھے بتا کر لکھا ہے؟"

وہ مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ میں تیزی سے چلتا ہوا اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا میرے ڈیسک پر ایک تہ کیا ہوا کاغذ رکھا تھا۔ میں نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا پھر اٹھا کر کھولا' اس میں لکھا تھا۔

سوال "چچا کی بیٹی کو کیا کہا جاتا ہے؟"

جواب "چچا کی بیٹی بچپن میں بہن اور جوانی میں کزن ہوتی ہے۔"

سوال "کیا کزن سے شادی ہوتی ہے؟"

جواب "صرف شادی نہیں ہوتی' عشق بھی ہوتا ہے؟"

سوال "عاشق کو دوسرے کا گریبان پکڑنا چاہئے یا دیوانگی میں اپنا گریبان چاک کرنا چاہئے؟"

جواب "جو کزن کے لئے اپنا گریبان چاک نہیں کرتا' وہ نہ تو عاشق ہے' نہ دیوانہ۔ وہ صرف اور صرف گدھا ہے۔"

میں نے غصے سے اس کاغذ کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ پروفیسر صاحب کلاس میں آئے تو میں نے ان کے پاس جا کر وہ تحریر دکھائی اور کہا "اس قسم کی باتیں دیواروں پر بھی لکھ کر مجھے پریشان کیا جا رہا ہے۔"

انہوں نے اس کاغذ کی تحریر پڑھی۔ اسے تہ کرتے ہوئے مجھے دیکھا پھر اسے میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے پوچھا "اس میں کہاں لکھا ہوا ہے کہ تم اسے پڑھ کر پریشان ہو جاؤ اور یہ بھی نہیں لکھا ہے کہ یہ تمہارے لئے ہے۔"

"سر! کسی نے اسے میرے ڈیسک پر رکھا تھا۔"

"تم دوسرے کے ڈیسک پر رکھ دو۔ دوسرا کسی تیسرے کے ڈیسک پر رکھ دے گا۔ درس گاہ میں بیٹھ کر اسے علم سمجھو تو یہ تم سب کے لئے ہے۔ پوری کتاب ہو یا ایک صفحے کی تحریر ہو' وہ آگہی کے لئے ہوتی ہے۔ کسی بھی تحریر کو ہر شخص اپنے نقطہ نظر سے پڑھتا اور سمجھتا ہے۔ تم اس کی اچھی باتوں کو یاد رکھو اور جو گراں گزرتی ہیں اسے چھوڑ دو۔"

"سر! اس میں اچھی باتیں کیا ہیں"

"اچھی باتیں سمجھنے کی سمجھ رکھو۔ اس میں چچا کی بیٹی کے متعلق لکھا ہے۔ ہمارے دین میں کہا گیا ہے کہ پہلے آپس میں رشتے داری کرو۔ خاندان میں ماموں زاد' خالہ زاد' پھوپی زاد اور چچا زاد ہو تو ان میں سے کسی سے رشتہ کرو۔ کیونکہ یہ رشتے زیادہ قریب اور جانے پہچانے ہوتے ہیں۔"

"سر! آپ نے بات کو کہاں سے کہاں گھما دیا ہے۔"

"علم بہت گھوم پھر کر حاصل ہوتا ہے۔ جستجو کے بغیر معنی و مفہوم کی دنیا سامنے نہیں آتی۔ اسے پڑھ کر فراخ دلی سے مسکراؤ گے تو لکھنے والا شرمندہ ہو جائے گا۔ تم ایک کم ظرف سے ملتے رہو اور اس کی تمام بری عادتیں چھوڑتے رہو تو تم میں اعلیٰ ظرفی پیدا ہوتی رہے گی۔ ایک کم ظرف بھی استاد ہوتا ہے اگر اس سے کچھ سیکھنا چاہو۔"

"شکریہ سر! آپ نے مجھے سوچنے سمجھنے کا ایک نیا انداز دیا ہے۔"

میں اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت قاسم' اسلم' ریاض اور محمود نے کلاس کے دروازے پر آ کر پوچھا "سر! کیا ہم آ سکتے ہیں؟"

میں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ان پر غصہ نہیں آیا۔ اتنی فراخ دلی بھی نہیں آئی تھی کہ مسکرا دیتا۔ ویسے صبر کرنا آ گیا تھا۔ پروفیسر نے ان سے کہا "آ جاؤ۔ تم چاروں ایک ساتھ آتے ہو' ایک ساتھ لیٹ ہوتے ہو اور یہ تم لوگوں کے لئے فخر کی بات ہے کہ کسی بھی معاملے میں ایک ساتھ بدنام ہوتے ہو۔"

وہ میرے آس پاس کی خالی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ قاسم نے میرے قریب جھکتے ہوئے آہستگی سے کہا "راستے میں کار کا ایک پہیہ پنکچر ہو گیا تھا۔ اسے بدلنے میں دیر ہو گئی۔"

میں خاموش رہا۔ لیکچر سنتا رہا لیکن یہ سوچتا رہا کہ یہ چاروں ابھی کالج میں آئے ہیں۔ پر وہ نوشتہ دیوار اور کاغذ کی یہ تحریر کس کی شرارت ہے؟

شرارت کسی کی بھی ہو۔ وہ لیٹ آ کر الزام سے بری ہو گئے تھے۔ انہیں غصہ دکھانا' ہوا کو پتھر مارنے کے مترادف تھا۔

میں موٹر سائیکل پر گھر سے کالج آتا جاتا تھا۔ ابا اور چاچا نے کئی بار کہا کہ میں ایک چھوٹی سی کار خرید لوں لیکن دوسرے نوجوانوں کو موٹر سائیکل تیزی اور اسٹائل سے چلاتے دیکھ کر شوق پیدا ہوا کہ میں بھی اسی طرح کالج آتا جاتا رہوں۔ اس روز کالج سے گھر پہنچا تو

موٹر سائیکل سے اترتے وقت خیال آیا۔ ڈیسک پر ملنے والا تہ کیا ہوا کاغذ میری جیب میں اب تک ہے۔ میں نے سوچا تھا۔ کالج سے نکلتے ہی اس کے پرزے پرزے کر کے ہوا میں منتشر کر دوں گا لیکن بھول گیا تھا۔

میں نے شاہدہ کو کبھی کسی اور نظر سے نہیں دیکھا تھا لیکن جیب میں رکھا ہوا کاغذ بہن اور کزن کا فرق سمجھا رہا تھا۔ کوئی موہوم سی ترغیب دے رہا تھا۔ ایک چور سا خیال تھا کہ اسے شاہدہ نے پڑھ لیا تو کیا سوچے گی؟ اور سوچے گی تو کہاں تک پہنچے گی؟ چاچا چاچی میرے متعلق کیا رائے قائم کریں گے؟

جب سوچ کا یہ سلسلہ شروع ہو کہ اب کیا ہوگا؟ کوئی کیا سوچے گا؟ دنیا کیا کہے گی؟ تو اسی اسرار اور تجسس کے تحت بندہ معصومیت کے خول سے نکلنے لگتا ہے۔ ایسی آگہی کے دروازے کھلنے لگتے ہیں جو نامعلوم ہوتی ہے اور معلوم ہوتی جاتی ہے۔

فی الحال یہ سمجھ میں آیا کہ جیب میں رکھی ہوئی تحریر کو فوراً" جلا دوں۔ اس پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ ایسا چور سوچتے ہیں کہ ہم پر کسی کی نظر نہ پڑے جبکہ میں نے چوری نہیں کی تھی۔ وہ بہن اور کزن والی بات میں نے نہیں لکھی تھی۔ لیکن شاہدہ کے حوالے سے یہی سمجھا جاتا کہ میں نے اس کی عاشقی اور دیوانگی میں وہ باتیں لکھی ہیں۔

میں تیزی سے چلتا ہوا اندر آیا۔ کاریڈور سے گزر کر اپنے کمرے میں پہنچا۔ وہاں کتابیں رکھیں' جوتے اور جرابیں اتاریں پھر چپل پہن کر کچن میں آیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے کوٹ کی جیب سے تہ کیا ہوا کاغذ نکالا۔ سوچا کہ اسے کھول کر پھر ایک بار پڑھوں لیکن پڑھنے کے خیال سے ایسا لگا جیسے میں شاہدہ کو پڑھنے جا رہا ہوں۔ میں نے فوراً ہی دیا سلائی کی ڈبیا اٹھائی۔ ایک تیلی نکالی پھر اسے سلگا کر اس کاغذ کو آگ لگا دی۔

کاغذ جلنے لگا میں نے اسے ایک چٹکی میں پکڑا ہوا تھا۔ اسے پورا کا پورا جلا دینا چاہتا تھا۔ اس کی آنچ میری انگلیوں اور ہتھیلی تک پہنچ رہی تھی لیکن وہ تحریر نہیں جل سکتی تھی کیونکہ جلانے سے پہلے ہی اس کی آنچ میرے چور ارادوں تک پہنچ گئی تھی۔

جب وہ برائے نام رہ گیا تو اسے چٹکی سے چھوڑ دیا۔ فرش پر گر کر آخری حصہ تک جل گیا۔ جل کر راکھ ہو گیا۔ یہ رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ راکھ کے پیچھے چوری چھپ جاتی ہے' آدمی کی نیت نہیں چھپتی۔

میں نے کمرے میں آ کر کوٹ اتار کر ایک طرف ڈال دیا پھر پلنگ پر ہاتھ پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔ عموماً" خود کو آرام پہنچانے کے لئے اسی طرح پھیل کر لیٹا جاتا ہے لیکن میں نے اپنے اندر اسے پھیلتے دیکھا جسے کبھی نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ میرے تصور میں وہ منظر فلم کی طرح چلنے لگا جب شاہدہ بھینس کا دودھ دوہ رہی تھی۔ اس نے کھلے گریبان کا کرتا پہنا ہوا تھا۔ میں اس کے کہنے پر دودھ سے بھرا ڈول اٹھانے کے لئے جھکا تو جھکتے ہی کچھ نظر آیا۔ نظر آنا اور بات ہے' سمجھ میں آنا اور بات ہے۔ وہ مہینوں پہلے کی بات آج سمجھ میں

آ رہی تھی اور دل کو دیوانہ وار دھڑکا رہی تھی۔

میں چاچی کی آواز سن کر اٹھ بیٹھا۔ وہ کمرے میں آکر پوچھ رہی تھیں "اپنے ابا کو جو خط لکھا تھا' وہ پوسٹ کر دیا؟"

میں نے چونک کر چاچی کو دیکھا پھر کہا "اوہ چاچی۔ بالکل بھول گیا۔"

"پتر! تو نے ہی کہا تھا کہ راستے میں پوسٹ آفس پڑتا ہے۔ لفافہ خرید کر اسے پوسٹ کر دے گا۔ مجھے دے دیتا تو صبح ہی لیٹر بکس میں ڈال آتی۔"

"میں نے پھر چاروں شانے چت ہو کر کہا "کوئی بات نہیں۔ کل پوسٹ کردوں گا۔"

"کل بھی تو نے کل کہا تھا۔ لا خط مجھے دے۔ شاہدہ بازار جا رہی ہے۔ وہیں پوسٹ آفس سے لفافہ لے کر پتا لکھ کر روانہ کر دے گی" انہوں نے شاہدہ کو آواز دی "شادہ! کہاں ہے؟ ادھر آ۔"

دور سے اس کی آواز گنگناتی آئی "آ رہی ہوں"

مجھے ایسے لگا جیسے وہ میرے پاس آنے کے لئے "آ رہی ہوں" کہتی آ رہی ہے۔ میں نے کروٹ بدل کر دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ فی الوقت یہ حالت تھی کہ نظر نہ آنے کے باوجود اپنی فلم دکھا رہی تھی۔ حواس پر چھاپا مار رہی تھی۔ پھر ایک نئی ڈگمگاتی ہوئی نیت سے دیکھنے پر کیا قیامت ڈھائے گی؟ اس لئے میں نے منہ پھیر لیا تھا۔

میرے کمرے کی طرف آتے وقت قدموں کی دھمک سنائی دی پھر اس کی آواز سنائی دی "جی امی!"

چاچی نے پوچھا "تو بازار جا رہی ہے؟"

"کیا آپ بازار جانے پر اعتراض کریں گی۔ یہ صاحب جو منہ پھیر کر لیٹے ہوئے ہیں انہوں نے اعتراض فرمایا ہوگا۔"

"اری یہ بات نہیں ہے۔ بازار جا رہی ہے تو اس کا خط لیتی جا۔ پوسٹ آفس سے لفافہ لے کر پتا لکھ کر پوسٹ کر دینا۔"

اس نے پوچھا "کہاں ہے خط؟"

چاچی نے مجھ سے پوچھا "بتا دو کہاں ہے؟"

"کوٹ کی جیب میں ہے۔"

میں ادھر نہیں دیکھ رہا تھا۔ ماں بیٹی کی آوازیں سن رہا تھا۔ چاچی یہ کہتی ہوئی وہاں سے جانے لگیں "جیب سے خط نکال لے اور یہاں کھڑی رہ کر بک بک نہ کرنا۔ یہ کالج سے تھکا ہوا آیا ہے اسے آرام کرنے دے۔"

ان کی آواز دور ہوتی گئی۔ وہ جا چکی تھیں۔ میں بستر پر اوندھا ہو گیا۔ دونوں بازوؤں میں منہ چھپا کر چوری سے اسے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ گردن سے نیچے دکھائی دے رہی تھی۔ اگر چہرہ دیکھنے کے لئے اپنا بازو اوپر اٹھاتا تو وہ مجھے دیکھتے ہوئے دیکھ لیتی۔ ہمارے

درمیان کبھی پردہ نہیں رہا۔ میں اب بھی آزادی سے دیکھ سکتا تھا لیکن میری نظروں کی معصومیت میں فرق آ گیا تھا۔ معصومیت مشکوک ہونے کے باوجود میرے دل میں کوئی بدمعاشی نہیں تھی۔ میری نظریں شکاری نہیں بھکاری تھیں۔ بھیک میں پوری روٹی نہیں ملتی۔ پوری دولت نہیں ملتی۔ میری نگاہوں کو اس کے بدن کی خیرات کہیں کہیں سے مل رہی تھی۔ کبھی ادھر سے نظر آ رہی تھی۔ اس نے کوٹ اٹھا کر ہینگر میں لگایا پھر الماری کے پاس جا کر اسے کھولا اور وہاں میرا کوٹ لٹکانے کے بعد الماری بند کر دی .... اس کے بعد کمرے سے جانے لگی۔ میں جس طرح بازوؤں میں منہ چھپائے ہوئے تھا اس زاویے سے اپنے کمرے کا دروازہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ میری محدود نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے اسی رفتار سے چلتی ہوئی دروازے سے گزرتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی ہوگی۔ کمرہ اس سے خالی ہو گیا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر انتظار کیا۔ اس کی آہٹ نہیں ملی تو سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ دروازے پر کھڑی دونوں ہاتھ کمر پر رکھے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میں نے جلدی سے بازوؤں میں منہ چھپا لیا۔ اس کی ہنسی دور ہوتی جا رہی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ مجھ سے زیادہ سمجھ دار تھی۔ بڑی دیر سے میری چور نگاہی کو سمجھتی رہی تھی۔

میں چاروں شانے چت ہو گیا۔ اس کی وہ تمام شرارتیں جو کرتی رہی تھی' مجھے یاد آ رہی تھیں۔ میں اناڑی اسے محض چچا کی بیٹی سمجھتا رہا۔ آج اس راکھ ہونے والی تحریر نے سمجھا دیا تھا کہ وہ جوانی میں کزن ہوتی ہے۔ یہی بات شاہدہ کو کسی نے نہیں سمجھائی تھی۔ اس کے باوجود وہ اکثر مجھے کزن کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔

"کزن! ذرا وہ ڈول اٹھا کر دو۔"

"کزن! صبح نماز کے لئے اٹھو تو مجھے جگا دینا"

"کزن! بین الاقوامی میں کتنے الف ہوتے ہیں۔"

اور میں کہتا تھا "دس جماعتیں پاس کر چکی ہو اور تمہیں بین الاقوامی کے ہجے نہیں آتے۔ شرم کرو۔"

اب مجھے شرم آ رہی تھی۔ میں خواہ مخواہ کزن کے سہولت بھرے رشتے کو شیطان کی آنت کی طرح پیچیدہ سمجھ رہا تھا۔ میں نے کروٹ لے کر دروازے کو دیکھا جہاں سے وہ ہنستی ہوئی گئی تھی اور اپنی ہنسی میری اندر چھوڑ گئی تھی۔ وہ ابھی تک مجھے سنائی دے رہی تھی۔ مجھے یاد آیا وہ نہانے کے بعد کیسے پیارے انداز میں بدن کو خم دے کر گیلے بالوں کو جھٹکتی تھی۔ میں نیم کے سائے میں پڑھتا رہتا تھا۔ بھیگی زلفوں کے چھینٹے مجھ تک آتے تھے۔ یہ سب دور دور کی حکایتیں تھیں۔ میں نے کبھی اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ ایک بار اس کے دوپٹے کو پکڑا تھا۔ آج وہ میرے دونوں ہاتھوں میں پکڑی ہوئی سی لگ رہی تھی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پتا نہیں میری کون سی رگ چھیڑ دی گئی تھی کہ نہ لیٹنے سے آرام

آ رہا تھا نہ بیٹھنے سے قرار مل رہا تھا۔ میں بستر سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ جب تک اپنے اندر کی خوشی کا اظہار کھل کر نہ کیا جائے' بے چینی نہیں جاتی۔ میں شاہدہ کو نہیں بتا سکتا تھا کہ میں کیوں خوش ہوں؟ ابھی مجھ میں جرات اظہار کی کمی تھی۔ میں کمرے سے باہر آ گیا۔ راہداری سے گزرتا ہوا چاچی کے کمرے میں آیا۔ وہ پلنگ کے سرے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ چاچا کرسی پر تھے۔ حقہ گرم کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کہا "آؤ بیٹے تمہاری چاچی کہہ رہی تھیں تم سو رہے ہو۔"

میں پلنگ پر آ کر بیٹھ گیا۔ پھر لیٹتے ہوئے اپنا سر چاچی کے زانو پر رکھ دیا۔ میرا بچپن اسی گود میں گزرا تھا۔ میں انہی زانوؤں پر لوریاں سنتے سنتے سو جایا کرتا تھا۔ آج ایک مدت کے بعد پھر ان کے زانو پر سر رکھا تو وہ ممتا سے بھر گئیں۔ بڑے پیار سے میرے سر کو سہلاتے ہوئے بولیں' "کیا بات ہے' آج میرے بیٹے کو بڑا پیار آ رہا ہے۔"

"چاچی! میں بولوں گا تو آپ یقین نہیں کریں گی۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے آج ہی میں نے آپ کو دیکھا ہے۔ آج ہی پیار آ رہا ہے۔ آج سے پہلے آپ کہاں تھیں؟"

وہ دونوں ہنسنے لگے۔ پھر چاچا نے پوچھا "کچھ تو معلوم ہو کہ اپنی چاچی پر اتنا پیار کیوں آ رہا ہے؟"

میں نے کہا "پیار تو ہمیشہ اپنے رشتوں پر قائم رہتا ہے۔ ہم ہی مصروفیات کے باعث ادھر ادھر گم رہتے ہیں۔ ہمارے خون کا' ہمارے دودھ کا اور ہماری کسی نئی محبت کا رشتہ سامنے ہوتا ہے اور ہمیں اپنی الجھنوں میں اس کے وجود کا پتا نہیں چلتا۔ جب اچانک پتا چلتا ہے تو اس پر اتنا پیار آتا ہے' اتنا پیار آتا ہے کہ ...."

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ انہیں دونوں بازوؤں میں لے کر بولا۔ "آپ مجھے بچپن میں کیسے پیار کرتی تھیں؟"

میں نے پیار مانگنے کے لئے اپنا ایک گال ان کی طرف کیا۔ انہوں نے ہنستے ہوئے ایک بوسہ لیا۔ میں نے بھی پلٹ کر انہیں پیار کیا تو وہ ہنستے ہنستے بولیں "یہ لڑکا آج دیوانہ ہو گیا ہے۔"

میں اچھل کر پلنگ سے فرش پر آیا پھر بولا "آپ کو بیسن کے لڈو بہت پسند ہیں۔ میں ابھی موٹر سائیکل پر فراٹے بھرتے ہوئے جاؤں گا اور ابھی لے کر آ جاؤں گا۔ پھر اپنے ہاتھ سے آپ کو لڈو کھلاؤں گا۔"

میں سپاہی کی طرح اٹینشن ہو گیا۔ چاچی کو سیلوٹ کیا تو دونوں ہنسنے لگے۔ میں اباؤٹ ٹرن ہو کر لیفٹ رائٹ' لیفٹ رائٹ کہتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔ وہ اتنے خوش تھے کہ باہر تک ان کی ہنسی سنائی دے رہی تھی۔ انہیں جیسے دو جہان کی خوشیاں مل رہی تھیں۔ یہی میں محسوس کر رہا تھا کہ محبت کا جو اظہار کرنا چاہئے تھا' وہ میں نے کھل کر کیا تھا۔ بڑی بے باکی سے کیا تھا۔ انہیں دو جہاں ملے تھے' مجھے پوری کائنات ملی تھی۔ میں نے آج مادر

کائنات کو چوم لیا تھا۔

میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی پھر بازار کیطرف چل پڑا۔ میں جو بھی حرکتیں کر رہا تھا وہ غیر شعوری طور پر کر رہا تھا۔ خدا جانتا ہے کہ میں نے چاچی سے اتنا پیار کیوں کیا؟ یہ بعد میں علم نفسیات نے سمجھایا اور یہ بھی سمجھایا کہ بازار میں صرف بیسن کا لڈو نہیں ملے گا' شاہدہ بھی دیکھنی کو ملے گی۔ لیکن وہ نظر نہیں آئی۔ میں مٹھائی خریدنے کے بعد یونہی سڑکوں پر موٹر سائیکل دوڑاتا رہا۔ کئی بار پوسٹ آفس کے سامنے سے گزرا تو دل نے کہا۔ میری نگاہیں اسے ڈھونڈ رہی ہیں۔

جسے ڈھونڈ رہے تھے گلی گلی۔ وہ دلبر جانی گھر میں ملی۔ میں واپس آیا تو وہ کوٹھی کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے موٹر سائیکل اس کے قریب لا کر روک دی۔ اس نے مجھے دیکھا پھر دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولی "اچھا تو میرا پیچھا کیا جا رہا ہے۔"

میں نے موٹر سائیکل ایک طرف کی پھر کہا "مجھے کیا ضرورت ہے پیچھا کرنے کی؟ میں ایسی چیز خرید کر لایا ہوں جو تم ماں بیٹی کو بہت پسند ہے مگر تمہیں نہیں دوں گا۔"

وہ کوٹھی کے اندر گئی۔ میں اس کے پیچھے چلتا ہوا چاچا' چاچی کے کمرے میں آیا۔ چاچی نے کہا "میں سوچ ہی رہی تھی دونوں ساتھ واپس آئیں گے۔"

وہ بولی "آپ غلط سوچ رہی تھیں۔ مجھے تو موٹر سائیکل سے وحشت ہوتی ہے۔ ویسے میں نے خط پوسٹ کر دیا ہے اور یہ ہے آپ کے لئے بیسن کے لڈو۔"

وہ اپنے تھیلے سے مٹھائی کا ڈبا نکال رہی تھی۔ میں نے بھی شاپنگ بیگ سے مٹھائی کا ڈبا نکالتے ہوئے کہا "یہ تو میں لایا ہوں اپنی چاچی کے لئے۔"

چاچا نے کہا "تعجب ہے' تم دونوں الگ گئے تھے مگر ایک ہی چیز لائے ہو اور وہ بھی اپنی امی چاچی کے لئے۔ میں بے چارہ تو کسی کھاتے میں نہیں ہوں۔"

"چاچا! آپ کھاتے میں بھی ہیں اور پیتے میں بھی لیکن یہ کھاتی پیتی لڑکی بھینس کی طرح موٹی ہو رہی ہے۔ اسے دبلا کرنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ وہاں امی اور ابا کے پاس بھیج دیں۔ کھیتوں میں ہل چلائے گی' فصل کاٹے گی تو ٹھیک ٹھاک رہے گی۔"

چاچا اور چاچی نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا پھر چاچی بولیں "بیٹے! تم جب کہو گے یہ تمہاری امی کے پاس چلی جائے گی۔"

شاہدہ شرماتے ہوئے زیر لب مسکراتے ہوئے کمرے سے جانے لگی۔ تب مجھے عقل آئی کہ میں نے چھیڑنے کے لئے روانی میں کیا کہہ دیا ہے اور اس کا مطلب کیا نکل آیا ہے۔ حالانکہ جو مطلب نکلا وہ حسب حال تھا۔ مجھے تو یہ دیکھ کر حال آ گیا کہ وہ کس ادا سے مسکراتی گئی تھی۔

رات کا کھانا ہم ایک ساتھ بیٹھ کر کھایا کرتے تھے۔ اس رات کھانے کے بعد بارش ہونے لگی۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

چاچی کی آواز آ رہی تھی۔ وہ بیٹی سے کہہ رہی تھیں .... "نی شاہدہ! صحن میں کپڑے پڑے ہیں۔ جلدی اٹھا لے۔ ڈربے پر ترپال ڈال دے' نہیں تو مرغیاں بھیگ جائیں گی۔"

میں اس کھڑکی کے پاس آیا' جو صحن میں کھلتی تھی ۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ پورے صحن میں بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے آکر روشنی اور بارش میں نہانے لگی۔ بارش خاصی تیز تھی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے تربتر ہو گئی تھی۔ الگنی سے کپڑے اتار کر دوڑتی ہوئی جاتی تھی پھر واپس آکر الگنی سے دوسرے کپڑے سمیٹنے لگتی تھی۔ اتنی دیر میں اس کا لباس بھیگ بھیگ کر ٹرانسپیرنٹ بن گیا تھا۔ بدن سے ایسے چپک گیا تھا جیسے نظریں شیشے کے آر پار نظاروں سے چپک جاتی ہیں۔ میں تو پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا۔

اس نے ایک الگنی کا کپڑا سمیٹتے ہوئے مجھے گھور کر دیکھا۔ گویا وہ دیر سے سمجھ رہی تھی کہ بڑی دیر سے دیکھی جا رہی ہے۔ اس نے ایک ادائے ناز سے گردن گھمائی پھر منہ پھیر کر صحن سے کوٹھی کے اندر آنے کے لئے بڑھی۔ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ابھی صحن میں بہت کام پڑا تھا۔ وہ پھر آنے والی تھی۔ میں وہیں کھڑا رہ گیا۔ اس نے مجھے تصویر حیرت بنا کر کھڑکی کے فریم سے چپکا کر رکھ دیا تھا۔

وہ تھوڑی دیر بعد صحن میں آئی۔ اب وہ جلدی میں نہیں تھی لیکن چاچی کو جلدی تھی۔ وہ راہداری میں کھڑی پوچھ رہی تھیں "یہ تو بار بار بارش میں بھیگنے کیوں جا رہی ہے؟"

اس نے چور نظروں سے میری طرف دیکھا۔ پھر اونچی آواز میں کہا "مرغیوں کو بھیگنے سے بچا رہی ہوں۔ کسی کے لئے تو بھیگنا ہی پڑتا ہے۔"

وہ ڈربے کے پاس گئی۔ اندر مرغیاں شور مچا رہی تھیں۔ وہ ڈربے پر ترپال ڈالنے لگی۔ ایسے اطمینان سے دھیرے دھیرے کام کر رہی تھی جیسے کسی فلم کی ہیروئن سلوموشن میں بھیگتی ہوئی دیکھنے والوں کو جذبات میں بھگو رہی ہو۔ میں گہری گہری سانسیں لے رہا تھا جیسے تاب نظارہ نہ ہو۔ دیکھتے رہنے کے باوجود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' کیا کیا دیکھوں؟ کہاں کہاں دیکھوں؟ دیکھنے کے لئے دو آنکھیں کم پڑ گئی تھیں۔

پھر وہ بھیگتی ہوئی میری کھڑکی کے سامنے آ گئی۔ گھور کر بولی "یہ اتنی دیر سے کیا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہو؟"

میں ذرا سٹپٹایا۔ ذرا ہچکچایا پھر بولا "وہ مم ...... میں' بات یہ ہے کہ یہاں سے ٹھنڈی ہوائیں آ رہی ہیں۔"

وہ دونوں ہاتھ اپنی کمر پر رکھتی ہوئی بولی "میں خوب سمجھتی ہوں' تمہیں کیسی ہوا لگ رہی ہے۔ امی سے جا کر بولوں؟"

میں ایک دم سے گھبرا گیا۔ دونوں ہاتھ انکار کے انداز میں ہلاتے ہوئے بولا "نن ...... نہیں' پلیز۔ میں اب کبھی نہیں دیکھوں گا۔"

یہ کہتے ہی میں نے کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر دیے۔ جلدی سے آکر اپنی میز کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے دروازہ بند رکھا تھا' اس لئے یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ صحن سے آکر اپنے کمرے میں گئی ہے یا ماں سے میری شکایت کرنے؟

میں رات کو دیر تک پڑھتا رہتا تھا۔ اس رات ایک لفظ بھی نہ پڑھا گیا۔ یہی فکر ستاتی رہی کہ میں چاچی اور چاچا کی نظروں سے گر جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے دھکے دے کر گھر سے نکال دیں یا میرے والدین کو یہاں بلا کر مجھے ذلیل کریں۔ اگرچہ بڑی حد تک امید تھی کہ وہ مجھے داماد بنانا چاہتے ہیں لیکن شریف گھرانوں میں شادی سے پہلے داماد کو کھلی چھٹی نہیں دی جاتی۔ یہ پورا یقین نہیں تھا کہ بات بن سکتی ہے۔ بات بگڑ بھی سکتی تھی۔

میں نے خود کو لعن طعن کیا۔ میں ایسا تو نہیں تھا۔ میں نظریں جھکا کر رہتا تھا۔ پھر میں نظریں گاڑ کر اسے کیوں دیکھتا رہا۔

اگلی صبح میں نے نماز پڑھ کر دعا مانگی' "یا اللہ! میری عزت رکھ لے۔ اگر شاہدہ نے ماں باپ سے شکایت نہیں کی ہوگی اور میری پہلی غلطی معاف کی ہوگی تو یہی آخری غلطی ہوگی۔ آج کے بعد میں اسے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھوں گا۔"

میں نے نماز کے بعد معمول کے مطابق کلام پاک کی تلاوت کی۔ مجھے بڑا سکون مل رہا تھا۔ یقین سا پیدا ہو رہا تھا کہ کچھ نہیں ہوگا۔ آخر وہ بھی شرم والی ہے۔ ماں باپ سے ایسی بات بتاتے ہوئے اسے شرم آئے گی۔ اس بار میری شرافت اور معصومیت کا بھرم رہ جائے تو پھر میں شاہدہ کے خیال سے ہی کان پکڑ لوں گا۔

ناشتے کی میز پر سب ہی کا موڈ اچھا تھا۔ ایک میں ہی گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے چور نظروں سے شاہدہ کو دیکھا تو وہ شرارت سے مسکرا رہی تھی۔ اس نے میری چور نظروں کو تاڑ کر اپنی آنکھوں کے اشارے سے دھمکی دی۔ دھمکی کے انداز میں آنکھوں نے پوچھا۔ "کیا بزرگوں سے وہی بات کہہ دوں۔"

میں گھبرا کر ناشتے پر سے اٹھ گیا۔ چاچا نے پوچھا "یہ کیا؟ تم نے ناشتہ کیوں چھوڑ دیا؟"

"جی۔ وہ بات یہ ہے کہ کچھ کھانے کو جی نہیں کر رہا ہے۔"

چاچی نے پوچھا "جی کیوں نہیں کر رہا۔ کیا کالج سے واپس آنے تک بھوکے رہو گے۔ بیٹے! بیٹھ جاؤ' جی نہ کرے تب بھی زبردستی کھاؤ۔"

"چاچی! مجھ سے جبراً" کھایا نہیں جائے گا۔ پلیز آپ فکر نہ کریں' میں بھوکا نہیں رہوں گا۔"

میں فوراً" وہاں سے جانا چاہتا تھا تاکہ شاہدہ سے سامنا نہ رہے۔ میں اس کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن یہ بے اختیاری سمجھ میں نہیں آتی' میں نے پتا نہیں کیسے بے اختیار ہو کر اسے دیکھا۔ اس نے آنکھوں کے اشاروں سے بیٹھنے اور کھانے کو کہا۔ میں

ایک دم سے بیٹھ گیا۔ اس کے اشاروں پر عمل نہ کرتا تو منہ چھپا کر گھر سے بھاگنا پڑتا۔ مجھے دوبارہ ناشتہ کرتے دیکھ کر چاچی اور چاچا حیران ہوئے۔ شاید ان کے تجربات میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ لڑکی کے ہاتھ میں کوئی کمزوری آ جائے تو لڑکا کٹھ پتلی بن جاتا ہے۔

ناشتے کا مرحلہ خیریت سے گزر گیا۔ جب موٹر سائیکل پر کالج کے لئے روانہ ہوا تو یقین ہو گیا کہ پچھلی رات والی بات بزرگوں تک نہیں پہنچی۔ یہ لڑکیاں بڑی "وہ" ہوتی ہیں۔ اس نے رات کا بھیگا بھیگا منظر بھی دکھایا اور آنکھیں بھی دکھائیں' مہربان بھی ہوئی اور سزا کے خوف میں بھی مبتلا رکھا۔ ساری رات ستایا جلایا تھا' صبح میرا پردہ رکھ لیا تھا۔ آنکھوں سے دھمکی دی تھی اور لبوں پر ہلکا سا تبسم بھی رہا تھا۔ یہی ادائیں اگلی چھیڑ خانی کا حوصلہ دیتی ہیں لیکن میں نے فجر کی نماز میں دعا مانگ کر اس کے خیال سے بھی توبہ کر لی تھی۔ کالج کے برآمدے میں اسلم سے ملاقات ہوئی۔ وہ اپنے تین ساتھیوں کے مقابلے میں بہت ہی دبلا سا لڑکا تھا۔ قد بھی چھوٹا سا تھا۔ سر کے بال گردن تک بڑھے ہوئے تھے۔ کبھی وہ ریشمی قمیض اور شلوار پہن کر آتا تو پیچھے سے بالکل لڑکی جیسا لگتا تھا۔ اس نے اپنے نازک ہاتھوں سے میرا ہاتھ تھام کر کہا "ہم چاروں تم سے بہت شرمندہ ہیں۔ ہم نے تمہارا مذاق اڑایا۔ اس کی ہمیں سزا مل رہی ہے۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا "کیسی سزا؟ کون سزا دے رہا ہے؟"

وہ ہائے کے انداز میں سانس چھوڑتے ہوئے بولا "ہاں۔ قدرت کسی کو معاف نہیں کرتی۔ قاسم کل رات سے قے کر رہا ہے۔ کل تمام رات اسے ایک سو پانچ ڈگری بخار رہا۔"

میں نے بے یقینی اور حیرانی سے کہا "ایک سو پانچ ڈگری؟ میں نے تو سنا ہے' آدمی ایک سو پانچ میں مرجاتا ہے۔"

"وہ تم سے معافی مانگنے کے لئے زندہ ہے۔"

"کیسی بات کرتے ہو۔ تم لوگوں سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ میں کسی سے ناراض نہیں ہوں تو معافی کس بات کی؟"

"یہ تمہارا بڑا پن ہے کہ تم ہم سے ناراض نہیں ہو لیکن قاسم کے دل پر بوجھ ہے۔ اگر تم اس کے پاس جا کر اسے معاف نہیں کرو گے تو اس کا ضمیر پھر اسے بیمار ڈال دے گا۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"اپنی کوٹھی میں ہے۔ ریاض اور محمود بھی وہیں ہیں۔ یار! بیمار کی عیادت کرو تو اس کی آدھی بیماری ختم ہو جاتی ہے۔"

اس سے گفتگو کے دوران یہ بات میرے دماغ میں گھوم رہی تھی کہ ان چاروں کی شرارت یا مہربانی سے ہی شاہدہ میری زندگی میں بہار بن کر آئی ہے۔ تب یہ خیال آیا کہ

میں شاہدہ کے حوالے سے قاسم کی عیادت کے لئے جا رہا ہوں۔ جب کہ میں اس سے توبہ کر چکا ہوں۔ اللہ میاں سے وعدہ کر چکا ہوں کہ پہلی غلطی معاف ہو جائے تو پھر کبھی آنکھ اٹھا کر اسے نہیں دیکھوں گا۔

انسان اکثر نادانی میں بچگانہ دعائیں مانگتا ہے' بھلا آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنے کی دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے جبکہ خدا نے آنکھیں دیکھنے کے لئے دی ہیں۔ دشمن کو نہ دیکھنا چاہو تو حالات اسے بھی دیکھنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ میں شاہدہ کو کسی ارادے سے نہ دیکھتا' کزن کے رشتے سے دیکھتا تب بھی اس کا بدن ہی نظر آتا تھا۔ اس کی دل نشین صورت' اس کی دل دھڑکانے والی مسکراہٹ اور اس کی خاموشی سے چھیڑنے والی ادائیں ایسی تھیں جن پر آنکھ اٹھتی ہی رہتی۔ اندھا ہونے کے بعد ہی آنکھ نہ اٹھنے کی دعا قبول ہو سکتی تھی۔

قاسم کی کوٹھی بہت بڑی بہت شاندار تھی۔ اس کا باپ کروڑ پتی سیاست دان تھا۔ اس نے وہ کوٹھی اپنے بیٹے قاسم کے لئے بنوائی تھی تاکہ وہ شہر میں رہ کر تعلیم حاصل کرے۔ اس کے والدین اپنی جاگیر میں رہا کرتے تھے اور اپنی رعایا کے ہزاروں ووٹوں سے اسمبلی میں پہنچا کرتے تھے۔ اسلم مجھے کوٹھی کے اندر لایا۔ قاسم ایک بیڈ روم میں بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔ محمود اور ریاض نے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔ قاسم نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "دوست! آج تم نے یہاں آ کر میری کوٹھی کی شان اور میری عزت بڑھا دی ہے۔"

میں نے کہا "شرمندہ نہ کرو۔ میں تو تمہاری بیماری کا حال سن کر آیا ہوں۔"

"کیسی بیماری؟ میں تو تمہیں دیکھتے ہی اچھا ہو گیا ہوں۔ وہ کیا بھلا سا شعر ہی کہ آپ کو دیکھنے سے بیمار کے چہرے پر رونق شونق آ جاتی ہے۔ بس ایسے ہی میں تندرست ہو گیا ہوں۔"

میں اس کی باتوں کے دوران اس کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ بستر پر تاش کے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ سرہانے کی میز پر کچھ پھل اور کچھ خشک میوے چاندی کی تھال میں رکھے ہوئے تھے۔ میز کے نچلے خانے میں بیئر کی بوتلیں تھیں۔ دیوار پر ایک بڑے سے فریم میں ایک نیم عریاں حسینہ انگڑائی کے لئے ہاتھ اٹھا کر جذبات کے آسمان کو چھو رہی تھی۔

ریاض نے کہا "تمہیں لڑکیوں سے دلچسپی نہیں ہے۔ کہو تو اس تصویر کو یہاں سے ہٹا دیا جائے۔"

میں چاہتا تھا وہ ہٹ جائے لیکن رسماً کہا "میرے لئے زحمت نہ کرو۔ میں ابھی چلا جاؤں گا۔"

"یار! کیسے جاؤ گے۔ کھڑکی کے باہر دیکھو بارش ہو رہی ہے۔"

محمود پلنگ پر چڑھ کر تصویر کے پاس گیا پھر اسے دیوار سے اتارتے ہوئے بولا "جب قاسم کے ابا یہاں آتے ہیں تو تصویر یوں بدل جاتی ہے۔"

اس نے انگڑائی لینے والی حسینہ کی بڑی سی تصویر کو پلٹ کر پھر دیوار سے لگا دیا۔ حسینہ دیوار میں چھپ گئی۔ تصویر کے دوسری رخ پر ایک مقدس مقام کی ایمان افروز تصویر تھی۔ میں دم بخود رہ گیا۔ اتنا بڑا فریب؟ ایمان اور تقدس کا مذاق اڑانے والی بات تھی' میں نے بھڑک کر کہا "یہ .... یہ بڑے شرم کی بات ہے۔ تم لوگوں کو خدا کا ذرا خوف نہیں ہے؟"

قاسم نے کہا "اس میں شرم یا خوف کی کیا بات ہے؟ جس طرح وہ حسینہ پیچھے چھپ گئی ہے کیا اسی طرح عبادت اور دعاؤں کے دوران کوئی عورت ہمارے اندر چھپی نہیں رہتی ہے۔"

یہ بات مجھے پتھر کی طرح لگی۔ کل سے میری یہی حالت تھی۔ میں نے مغرب اور عشاء کی نمازیں پڑھیں تو کئی بار شاہدہ کا خیال آیا اور میں نے اسے اپنی اندر چھپا لیا۔ صبح کی نماز میں خوفزدہ ہو کر اسے اندر سے نکالنے میں مصروف رہا۔ یہ پتا نہیں چلا کہ میں نے کس طرح نماز ادا کی تھی۔

محمود نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں۔ جو رخ بد نما ہوتا ہے اسے ہم چھپا سکتے ہیں لیکن اسے مٹا نہیں سکتے۔ فنا نہیں کر سکتے۔ برائی اس لئے فنا نہیں ہوتی کہ قدرت آدمی کو اس سے لڑنا اور اس پر غالب آنا سکھاتی ہے۔"

ریاض نے کہا "صرف اس تصویر کو نہ دیکھو کہ اس کے ایک طرف ایمان اور دوسری طرف بے ایمانی ہے۔ یہ دوغلا پن ہمیں اپنے ملکی قوانین اور مفاد پرست سنسر بورڈ سے ملتا ہے۔ جس سینما کے اسکرین پر روح پرور مناظر پیش کئے جاتے ہیں اسی اسکرین پر نیم عریاں حسینہ کا رقص دکھایا جاتا ہے۔"

اسلم نے کہا "ہمارے ملک کے ٹی وی اسکرین پر وزارت تجارت سگریٹ پینے کا ترغیبی اشتہار پیش کرتی اور ان ہی لمحات میں وزارت صحت سگریٹ کو مضر صحت کہتی ہے۔ ایک ہی اسکرین پر دو رخی باتیں اسی لئے ہوتی ہیں کہ تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں۔ انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ کاروبار میں حرام منافع سے اور جذبات میں گناہ کی لذت سے باز نہیں آتا۔"

اس بات پر سب قہقہے لگانے لگے۔ قاسم "یار! ہم لوگ تو من موجی ہیں۔ اپنی کھال میں مست رہتے ہیں۔ کوشش کرتے ہیں کہ ہم سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ اگر ہم سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچی ہے تو ہمیں ...."

محمود نے کہا "سننے والوں کے لئے قصہ ہو سکتا ہے مگر ہے حقیقت۔ میرے محلے میں ایک نوجوان شاہنواز رہتا تھا۔ برا نہ ماننا' تمہاری طرح آدم بیزار تھا۔ کسی سے دوستی نہیں کرتا تھا۔ محلے میں بھی شاید ہی کسی سے بات کرتا ہو۔ میں نے اس سے دوستی کی کوشش کی۔ اس نے نظر انداز کر دیا۔ بس یہی انسلٹ برداشت نہیں ہوئی۔ میں کوئی گرا پڑا بندہ

ہوں کہ وہ مجھے دوستی کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔"

قاسم نے ہاتھ اٹھا کر کہا "او یار! سیدھی سی بات ہے۔ جو محمود نے بتایا کہ وہ بندہ شاہنواز بڑا اوکھا ہے۔ کسی کے آگے گھاس نہیں ڈالتا ہے تو میں نے کہا ہم اس گدھے کے آگے گھاس ڈالیں گے۔ پھر جانتے ہو' میں نے کیا کیا؟"

میں نے تجسس سے پوچھا "کیا کیا؟"

اس نے کہا "بھئی محمود' تم ہی بتاؤ۔ میں کیا اپنے منہ سے بولوں؟"

محمود نے کہا "ہمیں پتا چلا کہ شاہنواز سانپوں سے بہت ڈرتا ہے۔ یہ معلوم ہوتے ہی قاسم نے ایک سپیرے کو پکڑا۔ وہ نشے کا عادی تھا۔ پانچ سو روپے کی عوض ایک سانپ لے آیا۔ ہماری ہدایت کے مطابق اسے ایک مٹھائی کے ڈبے میں رکھ کر اوپر سے رنگین کاغذ اور ربن کے ساتھ پیک کر دیا۔ ہم نے ایک تھیلے میں ایسے ہی چار مٹھائی کے ڈبے رکھے پھر شاہنواز کے دروازے پر آ کر دستک دی۔"

اس نے چاندی کی تھال سے کچھ بادام اٹھا کر منہ میں رکھے پھر انہیں چباتے ہوئے کہا "شاہنواز اکیلا تھا۔ ہم نے پہلے ہی معلوم کر لیا تھا کہ باقی گھر والے شیخوپورہ گئے ہیں۔ اس نے دستک سن کر دروازہ کھولا۔ میں نے کہا ہمارے دوست اسلم کی بہن کی بات پکی ہوئی ہے۔ اس خوشی میں یہ مٹھائی ہے۔ اس نے وہ ڈبا لے کر شکریہ ادا کیا۔ ہم دوسرے گھروں میں مٹھائی بانٹنے کے بہانے جلدی کھسک گئے۔ وہاں سے ذرا اور جا کر رک گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی شاہنواز کی چیخیں سنائی دیں۔ بچاؤ بچاؤ .... سانپ .... سانپ۔"

میں نے جلدی سے پوچھا "کیا سانپ نے اسے ڈس لیا؟"

قاسم نے میری پیٹھ پر ایک ہاتھ مارتے ہوئے کہا "یار بھولے بادشاہ! کیا جان بوجھ کر ہم نے زہریلا سانپ اسے دیا تھا؟ دراصل وہ سپیرا چرسی تھا۔ نشے کی طلب مار رہی تھی۔ وہ پانچ سو روپے کے لالچ میں اپنے جوگی مہاراج کا ایک پٹارا چرا لایا تھا۔ اس پٹارے میں زہریلا سانپ تھا۔"

محمود نے کہا "پڑوسیوں نے اسے اسپتال پہنچایا۔ وہ بچ گیا۔ ہم تو کئی ماہ تک اس کے سامنے نہیں گئے۔ ایک دن اسی نے میرا راستہ روک کر کہا۔ محمود بھائی' میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ آپ نہیں جانتے میں کینسر کا مریض تھا۔ خدا آپ کو اور نیکی دے' اس سانپ کے زہر سے کینسر کا مرض ختم ہو گیا ہے۔ آپ کبھی گھر آئیں میں میڈیکل رپورٹ دکھاؤں گا۔"

میں نے ہاں ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ واقعی میں نے ایک اخبار میں پڑھا تھا لیکن یقین نہیں آتا تھا۔ محمود اور قاسم وغیرہ چشم دید گواہ تھے۔ ایسا ہو چکا تھا۔ جوگی بابا نے اگلے روز ایک مریض کا علاج کرنے کے لئے کچھ پڑھ کر اس سانپ پر دم کیا تھا۔ چرسی سپیرا وہی سانپ چرا کر لے آیا تھا۔ یوں شاہنواز کو کینسر کے مرض سے نجات مل گئی تھی۔

میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ انہوں نے شاہنواز کے قتل کے ارادے سے ایسا کیا تھا۔ وہ تو سانپ کو بے ضرر سمجھ کر اس کو ڈرانا چاہتے تھے۔ قاسم نے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا "ہماری حرکتوں سے دوسروں کو یوں لگتا ہے جیسے ہم برا کر رہے ہیں جبکہ ہم ان کے حق میں بھلا کرتے ہیں۔ تم اپنی ہی بات لے لو۔ ہم شاہدہ کا نام لے کر تمہیں چھیڑ رہے تھے۔ جبکہ کالج میں شاہدہ نام کی کوئی طالبہ نہیں ہے۔"

اسلم نے ہنستے ہوئے کہا "اور ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ تمہاری کزن کا نام شاہدہ ہے۔"

میں حیرانی سے سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ واقعی دیکھا جائے تو انہوں نے شاہنواز کے ساتھ برا کیا مگر اسے نئی زندگی دی تھی۔ کسی شاہدہ کا نام لے کر کالج میں میرا مذاق اڑایا تھا لیکن ان کا یہ برا عمل میرے اور شاہدہ کے لئے بھلا ہو رہا تھا۔ قاسم نے کہا "مرد جب مرد بن کر پیدا ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ایک عورت ہونا چاہئے۔ دن کی اہمیت اس وقت تک اجاگر نہیں ہو سکتی جب تک اس کے ساتھ رات نہ ہو۔ اسی طرح مرد کسی عورت کے وجود کے بغیر مرد نہیں کہلاتا۔ ہم نے سوچا تھا کہ کسی فرضی شاہدہ کے پیار کی آگ تمہارے دل میں بھڑکائیں گے۔ تمہیں زندگی کے ایک نئے خوب صورت پہلو سے روشناس کرائیں گے لیکن تم ہمیں عاشق مزاج اور آوارہ اسٹوڈنٹس سمجھتے ہو۔"

میں کشمکش میں تھا کہ انہیں کیا سمجھوں؟ فرشتے نہیں مان سکتا تھا اور آوارہ بدمعاش بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ معجزاتی طور پر کینسر کی علامتیں ختم ہو گئی تھیں۔ ایسا نہ ہوتا تو شاہنواز سانپ کی صرف دہشت سے مر سکتا تھا۔

میرے معاملے میں بھی انہوں نے جان بوجھ کر مجھے ایک محبت بھری زندگی دینے کے لئے میری کزن کا نام استعمال نہیں کیا تھا۔ اتفاقاً ایسا ہوا تھا کہ ایک فرضی شاہدہ کے حوالے سے میری کزن میری محبت کا مرکز بن گئی تھی۔ قاسم نے کہا "بھئی ہم اپنے مہمان دوست کو بور کر رہے ہیں۔ اسلم! باہر زبردست بارش ہو رہی ہے۔ موسم کی مناسبت سے گیت مالا دکھاؤ۔ مزہ آئے گا۔"

اسلم ٹی وی سی آر کے پاس چلا گیا۔ محمود بیئر کی بوتل کھولتے ہوئے مجھ سے بولا "بڑی ظالم شے ہے۔ ایک گلاس پی کر دیکھو۔ موسم رنگین ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "مجھے تو معاف کرو۔ اسے منہ لگانا تو کیا ہاتھ لگانا بھی پسند نہیں کرتا۔"

"کوئی بات نہیں۔ میوے اور پھل تو کھاؤ۔ کب سے تمہارے سامنے پڑے ہیں۔"

میں ان کی بات رکھنے کے لئے تھوڑا تھوڑا کھانے لگا۔ وہ چاروں اپنے اپنے لئے گلاس بھر رہے تھے۔ ٹی وی اسکرین روشن ہو چکا تھا۔ انڈین فلموں کے وہ گانے جو بارش میں فلمائے گئے تھے، انہیں ساون کے گیت کے عنوان سے پیش کیا جا رہا تھا۔ پہلا گیت شروع ہوا تو ایک حسینہ بھری برسات میں رقص کرتی ہوئی دکھائی دی۔ مجھے فلموں سے

دلچسپی نہیں تھی مگر اچانک ہی دل لگ گیا۔ اسکرین پر شاہدہ بھیگتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

میں پچھلی رات کی طرف مڑ گیا تھا۔ وہی بارش تھی وہی بدن تھا اور وہی بھیگا لباس تھا جو اس کا انگ انگ تراش رہا تھا۔ مجھے کوئی فلمی ہیروئن اچھی نہیں لگتی تھی۔ اگر وہاں شاہدہ نہ دکھائی دیتی تو میں کبھی نہ دیکھتا اور اس لئے بھی کھل کر دیکھ رہا تھا کہ وہ آنکھیں نہیں دکھا رہی تھی۔ اپنی امی سے شکایت کرنے کی دھمکی نہیں دے چکی تھی۔

بارش تھم گئی تھی، پھر بھی میں بیٹھا رہا۔ ایک کے بعد دوسرا گیت اچھا لگا۔ دوسرے کے بعد تیسرے نے اور جذبہ شوق کو بڑھایا۔ اسے میری دیوانگی کہہ سکتے ہیں کہ اسکرین مجھے بدلتی ہوئی ہیروئنوں کے چہرے نہیں دکھائی دے رہے تھے۔ دکھائی تو وہ دے رہی تھی جسے میرا دل چاہتا تھا۔ جہاں تک چاہنے کا تعلق ہے ہم کسی بھی حسینہ کی چاہت کر سکتے ہیں مگر میرا دل صرف اسے مانگ رہا تھا۔ قاسم نے میرا بازو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا "کہاں کھو گئے؟ کیسے رہے ساون کے گیت؟"

میں نے قاسم کو دیکھا تو دھندلا سا نظر آیا۔ یوں کہنا چاہئے کہ وہ پوری طرح نظر نہیں آیا کیونکہ میری آنکھوں میں بارش کے کتنے ہی مناظر گھوم رہے تھے۔ وہ ایسی شعلہ بدن تھی کہ نہ بارش میں بجھ رہی تھی، نہ نگاہوں سے مٹ رہی تھی۔ میں نے خوابیدہ لہجے میں پوچھا "کیا اسے پھر دکھاؤ گے؟"

"او میرے یار! ایک نہیں ہزار بار دیکھو اور یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس سے بھی زبردست آئیٹم ہے۔ اسلم! وہ گیت مالا دکھاؤ، جس میں سری دیوی، راجیش کھنہ کی تپیا بھنگ کر دیتی ہے۔"

میں نے پوچھا "تپیا بھنگ کرنا کیا ہوا تھا؟"

"اس کا مطلب ہے عبادت کی لگن اور توجہ کو ختم کر دینا اس گیت میں دکھایا گیا ہے کہ ایک بہت ہی عبادت گزار بندہ ہوتا ہے۔ اسے ایک حسینہ اپنے حسن و شباب کے جلوے اور ادائیں دکھا دکھا کر دیوانہ کر دیتی ہے۔"

میں نے وہ گیت مالا بھی دیکھا۔ کیا بتاؤں کہ ان گیتوں اور مناظر میں کیسے طوفانی جذبے دکھائے گئے تھے۔ میں تو جوان تھا اگر کوئی بچہ ہوتا تو بیٹھے بیٹھے بالغ ہو جاتا۔ ہمارے ملک کی آبادی اس لئے بھی بڑھ رہی ہے کہ موجودہ نسل کے جوان کم سنی میں ایسے مناظر دیکھ کر بچوں کے باپ بن رہے ہیں۔

میں صبح گھر سے نکلا تھا۔ اس روز اتنی فلمیں دیکھیں کہ واپسی میں شام ہو گئی۔ وہ موٹر سائیکل کی آواز سن کر چھت پر آئی پھر مجھے دیکھتے ہی پلٹ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ بھاگ کر چھت پر آنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ہر موٹر سائیکل کی آواز پر اسی طرح دیوانہ وار آتی رہی ہے اور مایوس ہو کر جاتی رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر اس نے "اونہہ" کے انداز میں منہ پھیر لیا تھا اور چلی گئی تھی۔

بے قراری بھی تھی۔ ناراضگی بھی تھی۔ نہ آؤ تو انتظار تھا۔ آؤ تو انکار تھا۔ اس کی ہاں میں نہ تھی اور نہ میں ہاں تھی۔ یوں کہنا چاہئے کہ اس نے پیار کو پہیلی بنا دیا تھا۔ جہاں تک اسے بوجھو' وہاں سے پھر ایک نئی پہیلی بنتی جاتی تھی۔ عورت کو سمجھنا چاہو تو یہ اپنی ذات میں یونیورسٹی بن جاتی ہے اور نت نئے معنی اور مفہوم پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔

چاچی اور چاچا نے پریشان ہو کر پوچھا "کہاں رہ گئے تھے؟ صبح ٹھیک سے ناشتا بھی نہیں کیا اور اب اندھیرا ہونے کو ہے"

"اوہ چاچی! بادل چھائے ہوئے ہیں۔ اس لئے اندھیرا لگ رہا ہے۔ میں لائبریری میں بیٹھ کر پڑھ رہا تھا اس لئے دیر ہو گئی۔"

میں چاچا کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ شاہدہ کسی نہ کسی کام سے آ رہی تھی' جا رہی تھی یا پھر آتے جاتے رہنے کے لئے گھر کا کام بڑھا رہی تھی۔ مجھ سے ایسی بے نیاز تھی کہ ایک بار بھی چور نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ چاچی نے کہا بھی کہ چادر باہر لے جا کر کیوں جھاڑ رہی ہے۔ اس موسم میں گرد نہیں اڑتی مگر وہ خواہ مخواہ گرد جھاڑ رہی ہے۔ اس موسم میں گرد نہیں اڑتی مگر وہ خواہ مخواہ گرد جھاڑنے کے بعد چادر دوبارہ لا کر بستر پر بچھا رہی تھی۔ یہ بھی ایک انداز تھا کہ مجھے نہیں دیکھ رہی تھی مگر اپنے وجود کی رونق دکھاتی جا رہی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد میں ذرا ٹہلنے کے لئے جاتا تھا لیکن بارش ہونے لگی تھی۔ اس لئے معمول کے مطابق کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ کر میز کے پاس پڑھنے بیٹھ گیا۔ اس کا دروازہ بھی کھلا رہتا تھا۔ میں نے نظریں کھلی ہوئی کتاب پر رکھیں مگر دھیان اس کے کمرے کی طرف تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے آواز سنی۔ سر گھما کر دیکھا تو اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس نے مجھے اپنے کمرے سے باہر پھینک دیا ہے۔ مجھے بہت برا لگا مگر یہ بھی فکر ہوئی کہ صبح سے پہلے نظر نہیں آئے گی۔

یہ سراسر بدمعاشی تھی۔ ہر رات کم از کم گیارہ بجے تک دروازہ کھلا رکھتی تھی۔ مجھے اپنے کمرے سے نظر آتی رہتی تھی۔ آج شام کو بھی خوب نظر آئی لیکن رات کی تنہائی اور ویرانی میں دیکھنے کا موقع آیا تو اس نے دروازے کو بند کر لیا۔ یہ تو واضح طور پر ترسانے اور تڑپانے والی شرارت تھی۔ میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ میرے اندر ساون کے گیت بھرے ہوئے تھے۔ برسات میں تو جلتے ہوئے گھر بجھ جاتے ہیں لیکن یہ برسات میرے اندر شعلے بھڑکا رہی تھی اور وہ بند دروازہ جلتی پر تیل چھڑک رہا تھا۔

میں نے گیارہ بجے تک بے چینی سے انتظار کیا۔ لیکن وہ مقدر کا دروازہ بند رہا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ میرے اندر کیسا اشتعال پیدا ہو رہا تھا۔ دماغ میں دھواں سا بھر رہا تھا۔ کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی تھی۔ اگر وہ دروازہ نہ کھلتا تو میرا دماغ پھٹ جاتا۔ شکر ہے کہ وہ کھل گیا۔

دروازہ کھلتے ہی میں نے اسے اس نے مجھے دیکھا۔ نظریں چرا کر راہداری میں آئی۔ وہاں سے گھوم کر اپنی ماں کے کمرے کی طرف جانے لگی۔ میں نے اپنے کمرے سے نکل کر دیکھا۔ وہ ماں کے کمرے کی طرف نہیں گئی تھی۔ کچن کے سامنے رک کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر نظریں ملتے ہی وہ کچن میں چلی گئی۔ میری نظروں سے گم ہو گئی۔ کمبخت آنکھ مچولی کھیل کر میرا ستیاناس کر رہی تھی۔ دیکھا جائے تو اس کا یہ رومانی انداز صحت مندانہ تھا۔ محبوب کی ایسی اداؤں سے چاہت اور تڑپ بڑھتی ہے' صبر کی عادت پڑتی ہے اور ایک دوسرے کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے لیکن میں نے قاسم کی کوٹھی میں نو گھنٹے

تک ٹی وی اور وی سی آر کے سامنے رومانس کی شاعرانہ لطافت نہیں دیکھی تھی بلکہ خباثت دیکھی تھی۔ میرے اندر ایسے مناظر بھرے ہوئے تھے جن میں عورت کے حسن اور شرافت کی بوٹی بوٹی کی گئی تھی۔

ان لمحات میں میرے اندر شاعرانہ لطافت اور رومانس کی چاشنی نہیں تھی۔ صرف اور صرف برسات میں سلگتا ہوا بدن تھا۔ میں نے راہداری میں کھڑے ہو کر سوچا کیا کروں؟ کیا اس کے پیچھے کچن میں جاؤں؟

وہاں جانا مناسب نہیں تھا۔ چاچی کا کمرا کچن کے قریب تھا۔ ہمارے کچھ کہنے سننے کی آواز بزرگوں تک پہنچ سکتی تھی۔ اسی وقت برتن ٹکرانے کی آواز سنائی دی۔ کمرے سے چاچی نے پوچھا "نی شادہ! تو ہے؟"

"جی۔ میں ہوں' کچن کا دروازہ بند کر کے جا رہی ہوں۔"

میں نے سنا کہ وہ کچن سے نکلنے والی ہے تو میں لپک کر اس کے کمرے میں چلا آیا۔ دروازے کے پردے کے پیچھے چھپ گیا۔ چونکہ دروازہ کھلا ہوا تھا اس لئے میں راہداری کو اور اپنے کمرے کے کچھ حصے کو پردے کے پیچھے سے دیکھ سکتا تھا۔ شاہدہ کچن سے نکل کر راہداری میں چلتی ہوئی میرے دروازے کے سامنے رک گئی تھی۔ وہ دروازہ اس کی توقع کے خلاف بند تھا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ میں اسے دیکھنے کے لئے وہاں کھڑا رہوں گا لیکن اس کی خوش فہمی ختم ہو گئی تھی۔

اس نے صحن کی طرف دیکھا۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ یہ سوچ نہیں سکتی تھی کہ میں صحن میں بھیگنے جاؤں گا اس نے دبے قدموں میرے بند دروازے کے پاس آ کر کان لگا کر سنا اسے میرے پڑھنے کی آواز بھی نہیں سنائی دی۔ وہ دروازے پر ہاتھ لے گئی۔ جیسے کھول کر دیکھنا چاہتی ہو۔ پھر رک گئی۔ میں پردے کے پیچھے سے واضح طور پر اسے شرماتے دیکھ رہا تھا۔ حیا اجازت نہیں دے رہی تھی کہ دروازہ کھولے یا دستک دے۔

آخر وہ سر جھکا کر سوچتی ہوئی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی۔ وہاں سے پھر میرے بند دروازے کو دیکھا۔ میں سمجھتا تھا کہ میں ہی ایک ہاتھ سے تالی بجانے والی حماقت کر رہا ہوں مگر وہ بھی اپنے کمرے میں میری ہی طرح بے چین رہتی تھی۔ اس نے اپنا دوپٹہ اتار کر بستر پر پھینک دیا۔ اسی وقت میں نے پردے کے پیچھے سے نکل کر دروازے کو اندر سے بند کیا تو آواز سنتے ہی وہ چونک کر پلٹ گئی۔ مجھے دیکھتے ہی دونوں ہاتھوں سے اپنے منہ کو دبا لیا۔ اس دباؤ میں حیرت کی چیخ گھٹ کر رہ گئی۔

وہ اگلے ہی لمحے میں سنبھل گئی۔ تعجب سے بولی "کزن! یہ کیا حرکت ہے؟"

میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "اس حرکت میں محبت ہی محبت ہے۔"

اس نے پیچھے ہٹ کر کہا "وہیں رک جاؤ۔ میری آواز اونچی ہو گی تو بات بزرگوں تک پہنچ جائے گی۔"

میں رک گیا پھر بولا "بات بزرگوں تک نہ پہنچے اسی لئے میں نے دروازہ بند کیا ہے۔"

"تم دروازہ بند کر کے میری اور میرے والدین کی توہین کر رہے ہو۔ ہوش میں آؤ۔ امی اور ابا نے تم پر اعتماد کیا ہے۔ وہ تمہاری نیکی اور شرافت کی قسمیں کھاتے ہیں۔ فوراً دروازہ کھولو۔"

"تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے میں شیطان ہوں اور تم پارسا ہو۔ کل سے مجھے بھڑکا رہی ہو۔ بارش میں بھیگ بھیگ کر آگ لگا رہی ہو۔"

"تم مجھے الزام دے رہے ہو۔ میں کام کرتے وقت مجبوراً بھیگ رہی تھی۔ مجھے یہ سوچ کر شرم آ رہی ہے کہ تم مجھے تماشا سمجھ کر دیکھ رہے تھے۔ اگر میرے ذہن میں گندگی ہوتی تو تمہیں کل رات وارننگ نہ دیتی۔"

"دیکھو شاہدہ! جھوٹ نہ بولو۔ تم میرے لئے بے چین رہتی ہو۔ مجھے پانے کے لئے تڑپتی ہو۔ ابھی میں نے اپنے بند دروازے کے پاس تمہاری بے چینی دیکھی ہے۔"

وہ التجا آمیز لہجے میں بولی "کزن! مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں محبت سے شرارتیں کرتی ہوں۔ تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں۔ تمہیں نہیں دیکھتی ہوں تو بے چین ہو جاتی ہوں۔"

"میں یہی بے چینی دور کرنے آیا ہوں۔"

میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ وہ چھڑانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی "خدا کے لئے ہاتھ نہ لگاؤ۔ میں تمہاری امانت ہوں۔ اپنے بزرگوں سے کہو' مجھے مانگنے آئیں۔ مانگنے سے میرے میکے کی عزت بڑھے گی۔ ورنہ میں دو کوڑی کی ہو جاؤں گی۔"

میں نے ہاتھ کھینچ کر گرفتار کیا۔ یوں لگا میرے سینے سے آ کر آگ لپٹ گئی ہے۔ اس نے پوری قوت لگائی۔ بڑی جان دار تھی۔ میں جھٹکا کھا کر دو قدم پیچھے گیا۔ میرے اندر سے آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔ میں ہوش میں نہیں تھا۔ پھر اس کی طرف لپکا۔ قریب پہنچتے ہی اس کا ہاتھ چل گیا۔ میرے منہ پر ایک زور دار تھپڑ پڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دونوں ہاتھوں سے دھکا دیا۔ میں چونکہ جنون میں تھا اس لئے توازن قائم نہ رکھ سکا۔ دھکا کھا کر گرتے گرتے پلنگ کے پائے سے ٹکرا گیا۔ پیشانی پائے سے لگی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ میں نے فرش پر گرتے ہوئے اتنا ہی دیکھا کہ وہ دروازہ کھول کر راہداری میں پہنچ گئی تھی۔ پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

پتا نہیں میں کتنی دیر اپنی زندگی سے' اپنے وجود سے غافل رہا۔ شاہدہ کے لئے پرابلم بن گیا تھا۔ وہ مجھے میرے کمرے میں نہیں پہنچا سکتی تھی اور اپنے کمرے میں رات بھر نہیں رکھ سکتی تھی۔ وہ تو میرے قریب آنے سے بھی ڈر رہی تھی _ آخر وہ غسل خانے سے ایک چھوٹی بالٹی میں پانی بھر کے لے آئی۔ پھر کچھ فاصلے سے میرے منہ پر تمام پانی پھینکا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ بالٹی پھینک کر بھاگتی ہوئی پھر راہداری میں چلی گئی۔ وہاں سے

مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے سوچا "میں کہاں ہوں؟ کس حال میں ہوں؟ یہ شاہدہ راہداری میں کیوں کھڑی ہے؟"

پھر اچانک یاد آگیا کہ یہ شاہدہ کا کمرا ہے اور میں جوانی کی برسات میں نہیں، سامنے پڑی ہوئی بالٹی کے پانی سے بھیگا ہوا ہوں۔ میں نے غصے سے اسے دیکھا۔ مجھے طمانچہ یاد آ گیا تھا۔ اس نے، اس لڑکی نے مجھے مارا تھا! میں اس کا جبڑا پکڑ لوں تو منہ سے ماں کا دودھ نکل آئے گا۔ یہ کیا شے ہے میرے سامنے؟

میں طیش میں آکر کھڑا ہوا۔ وہ راہداری میں ایک قدم آگے بڑھا کر بھاگنے کے لئے تیار ہو گئی۔ میں پیشانی سے بہنے والے لہو کی گرمی اپنے چہرے پر پھیلتی ہوئی محسوس کر رہا تھا۔ میں اسے پکڑنے کے انداز میں ہاتھ بڑھاتے ہوئے دروازے پر آیا۔ وہ بھاگتی ہوئی اپنی ماں کے دروازے کے پاس جاکر کھڑی ہو گئی۔

میں نے راہداری میں آکر اسے غراتے ہوئے دیکھا۔ اس نے دروازے کے ہینڈل پر اس انداز سے ہاتھ رکھا جیسے خاموش دھمکی دے رہی ہو کہ میں اسے پکڑنے آؤں گا تو وہ دروازہ کھول کر ماں باپ کے پاس چلی جائے گی یا انہیں نیند سے جگا دے گی۔

میں دونوں مٹھیاں بھینچ کر اسے بے بسی سے دیکھا پھر گھوم کر اپنے دروازے پر آیا۔ اسے دیکھا، وہ بھی دیکھ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے بلایا اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ میں طمانچے کا جواب طمانچے سے نہیں دے سکتا تھا۔ کیا مجبوری تھی کہ اسے گالیاں بھی نہیں دے سکتا تھا لیکن نفرت ظاہر کئے بغیر آرام نہیں آسکتا تھا۔میں نے اس کی طرف تھوک دیا۔ تھوک وہاں تک نہیں پہنچا۔ میں نے کمرے میں پہنچ کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔

جذبات کی کتنی اونچی اڑان تھی اور کتنا نیچے آکر گرا تھا اس وقت یہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ مجھے غصہ کس بات پر آرہا ہے؟ ایک عورت سے طمانچہ کھانے پر؟ چہرہ لہولہان ہونے پر؟ یا ساون بھرے زرخیز بدن کو حاصل کرنے میں ناکام ہونے پر؟ یا مجموعی شکست پر تلملا رہا تھا؟

میں بڑی دیر تک میز کے پاس بیٹھا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ ساتھ ہی قسم بھی کھاتا رہا کہ اسے نہیں چھوڑوں گا۔ اپنی بے عزتی اور ناکامی کو نہیں بھولوں گا۔ آج رات کے ایک ایک لمحے کا حساب اس سے لوں گا۔

میں نے باتھ روم میں آکر لائٹ آن کی۔ آئینے میں پیشانی کے زخم کو دیکھا۔ چہرے سے خون صاف کیا۔ زخم سے اب تک لہو بہہ رہا تھا۔ میں نے رومال کے ایک حصے کو آفٹر شیونگ لوشن میں بھگو کر زخم پر لگایا۔ تکلیف کی شدت سے کراہنے لگا۔ تکلیف تو ہوئی لیکن لہو کا رسنا بند ہو گیا۔

میں نے غصے میں کئی بار سوچا کہ بے عزتی اٹھانے کے بعد اب اس گھر میں نہیں رہنا

چاہئے لیکن عقل بھی سمجھاتی رہی کہ ماں کی محبتیں دینے والی چاچی اور باپ کی کمی پوری کرنے والا چاچا کیا سوچے گا۔ جب تک اس گھر سے جانے کی معقول وجہ نہ ہو، نہیں جانا چاہئے۔ وہیں رہ کر شاہدہ کو منہ توڑ جواب دینے کا موقع تلاش کرنا چاہئے۔

اس رات بستر پر کانٹے چبھ رہے تھے۔ میں غصے سے کرسی پر بیٹھا رہا۔ رات کے تین بج گئے پھر صبح کے پانچ بجنے لگے۔ فجر کی اذان ہوئی تو میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے نماز کے لئے جانا تھا۔ اس وقت خیال آیا، میں پاک نہیں ہوں۔ میرے اندر وہ ناپاکی، وہ غلاظت ہے جسے صرف خدا جانتا ہے اور خدا صرف جسم کی طہارت کو قبول نہیں کرتا۔ اس کے ساتھ نیت کی پاکیزگی بھی لازمی ہے۔ بہت عرصے بعد میں نے فجر کی نماز چھوڑ دی۔ لباس تبدیل کیا۔ ایک کتاب، ایک کاپی اور ایک قلم لیا۔ دروازہ کھول کر راہداری میں آیا۔ شاہدہ اور چاچی کے کمروں کے دروازے بند تھے۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا باہر کا دروازہ کھول کر برآمدے میں آیا۔ وہاں میری موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ میں نے پیچھے کیریئر پر کتاب اور کاپی کو رکھنا چاہا تو وہاں ایک تہ کیا ہوا کاغذ رکھا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر کھولا۔ بڑے سائز کے کاغذ پر بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔ نیچے شاہدہ کا نام پڑھ کر میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ تمام کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ وہ نامہ لکھنے والی نظر نہیں آئی۔ میں نے اسے جیب میں رکھ لیا۔ موٹر سائیکل کو برآمدے سے اتار کر اسے کھینچتا ہوا احاطے کے گیٹ تک آیا تاکہ موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی آواز پر چاچا اور چاچی بیدار نہ ہو جائیں۔ باقی وہ خط بتا رہا تھا کہ شاہدہ شب بیداری کرتی رہی ہے۔

میں موٹر سائیکل ڈرائیو کرتا ہوا بازار آیا۔ ایک لسی کی دکان پر گاڑی روکی۔ پھر لسی کا آرڈر دے کر وہ خط پڑھنے لگا۔ اس نے لکھا تھا "کزن! تم ایسے تو نہ تھے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ پانچوں وقت اللہ تعالیٰ کے آگے جھکتے ہو، عبادت میں پاکیزگی کو سمجھتے ہو۔ پھر محبت میں پاکیزگی کو کیوں نہیں مانتے؟

"کزن! میں صرف تمہاری ہوں۔ مجھے عزت و آبرو سے اپنا لو۔ رسم و رواج کے مطابق اپنی دلہن بنا لو۔ اس سے پہلے مجھ پر حرف نہ لاؤ۔ مجھے میری ہی نظروں سے نہ گراؤ۔

"رات جو کچھ ہوا۔ اس پر میرا دل کڑھ رہا ہے۔ میرا ہاتھ بے اختیار تم پر اٹھ گیا تھا۔ میں اپنا یہ ہاتھ سنبھال کر رکھوں گی۔ شادی کے بعد اسے توڑ دینا۔ ابھی کچھ دنوں کی بات ہے، تم بہت بھولے تھے۔ میں دل ہی دل میں تمہاری شرافت پر قربان ہوتی رہتی تھی لیکن کالج کے ماحول نے تمہاری شرافت اور معصومیت کو مجروح کیا ہے۔ مجھے یہ بات اس وقت یقین سے معلوم ہوئی جب میں نے تمہارے کوٹ کی جیب سے وہ خط نکالا جسے تم اپنے ابا کے نام پوسٹ کرنے والے تھے۔ میں نے اسے کھول کر پڑھا تو حیران رہ گئی۔ وہ خط نہیں تھا۔ تمہارے خیالات تھے۔ اس میں لکھا ہوا تھا۔ چچا کی بیٹی کو کیا کہا جاتا ہے؟ پھر

اس کا جواب لکھا ہوا تھا۔ چچا کی بیٹی بچپن میں بہن اور جوانی میں کزن ہوتی ہے۔"

میں نے چونک کر سوچا' وہ بہن اور کزن والی تحریر تو میں نے جلا دی تھی۔ دکاندار نے لسی کا گلاس بڑھاتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ میں گلاس لے کر پینے لگا۔ خط کے سلسلے میں جو گڑبڑ ہوئی وہ سمجھ میں آ گئی۔ میں نے غلطی سے اپنے ابا کو لکھا ہوا خط جلا دیا تھا۔ وہ تحریر جوں کی توں کوٹ کی جیب میں رہ گئی تھی جو بعد میں شاہدہ کے ہاتھ لگ گئی۔

میں نے جلدی سے گلاس خالی کیا۔ لسی کی قیمت ادا کی پھر موٹر سائیکل پر بیٹھ کر شاہدہ کے خط کو آگے پڑھنے لگا۔ آگے لکھا ہوا تھا "کزن! وہ تحریر پڑھ کر معلوم ہو گیا کہ تمہاری معصومیت ختم ہو چکی ہے۔ تم کزن کے رشتے سے ملنے والی رعایت کے مطابق مجھ سے شادی بھی کر سکتے ہو اور کوئی جذباتی غلطی بھی۔

"اگرچہ وہ تمہارے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر نہیں تھی۔ میں تمہاری ہینڈ رائٹنگ پہچانتی ہوں لیکن اس تحریر کا تعلق تم سے اور چچا کی بیٹی سے یعنی مجھ سے تھا۔ میں نے سوچا کہ تم میں اتنی جرات نہیں ہوگی کہ اپنے ابا سے مجھے مانگ لینے کو کہہ سکو۔ اگر میں اس تحریر کے نیچے تمہارا نام لکھ کر اسے تمہارے ابا کے نام پوسٹ کردوں تو وہ میرے متعلق اپنے بیٹے کی پسند کو سمجھ لیں گے۔ وہ بھی مجھے بہو بنانا چاہیں گے تو پھر جلد ہی رشتے کی بات چل پڑے گی۔"

میں نے شاہدہ کے خط کو مٹھی میں بھینچ کر دل میں کہا "باپ رے۔ یہ شاہدہ نے ابا تک اسے پہنچا دیا ہے اب کیا ہوگا؟ آج کل میں اس کا جواب آتا ہی ہوگا۔"

میں جانتا تھا۔ میری پسند ابا کی پسند ہوگی لیکن جس انداز سے یہ بات وہاں تک پہنچنے والی تھی یا پہنچ گئی تھی اس سے شرم اور جھجک سی ہو رہی تھی کہ امی اور ابا کا سامنا کیسے کروں گا؟

یہ درست ہے کہ میں شاہدہ کو دلہن بنا کر لانے کا معاملہ مہینوں اور برسوں تک ٹال دیتا۔ اب یہ معاملہ ٹلنے والا نہیں تھا۔ اس سلسلے میں میری امی رکاوٹ بن سکتی تھیں کیونکہ وہ اپنی بہن کی بیٹی کو میری دلہن بنانا چاہتی تھی لیکن ڈاک کے ذریعے پہنچنے والی یہ تحریر ثابت کرے گی کہ میں بھی امی کے فیصلے کے خلاف چچا کی بیٹی کو پسند کرتا ہوں۔

ایک بات کھٹک رہی تھی۔ شاہدہ اپنی حرکتوں سے مجھ پر حاوی ہو رہی تھی۔ میں جو چاہتا تھا' وہ ہونے نہیں دیتی تھی۔ خود جو چاہتی تھی وہ کر گزرتی تھی۔ جس رات بارش میں بھیگ رہی تھی اس رات اس نے آنکھیں دکھائی تھیں جیسے میں اس سے ڈرتا ہوں مگر حالات سے مجبور ہو کر ڈر گیا تھا۔ وہ موقعے سے فائدہ اٹھانا جانتی تھی اور کسی نہ کسی طرح اپنا پلڑا بھاری رکھ کر مجھے اپنے دباؤ میں رکھتی تھی۔ پچھلی رات وہ ہار جاتی لیکن ہارنا نہیں جانتی تھی۔ ایسا وقت آنے سے پہلے اس نے مجھے زخمی کر دیا۔ میری شہ زوری کو کمزوری میں اور کامیابی کو ناکامی میں بدل دیا۔ یہ ان عورتوں میں سے تھی جو مرد پر حکومت کرتے

رہنے کے لئے شادی سے پہلے اس پر دباؤ ڈالنے لگتی ہیں۔

اس نے وہ تحریر ڈاک کے ذریعے ابا کے پاس بھیج کر بہت چالاکی دکھائی تھی۔ جس طرح اب تک ہر معاملے میں مجھ پر دباؤ ڈالتی رہی تھی' اس تحریر کے ذریعے بھی دباؤ ڈال کر دلہن کے روپ میں حکومت کرنے کا منصوبہ بنا چکی تھی اور اس پر عمل کر چکی تھی لیکن اس طرح اس نے مجھے بھی چالاکی سکھا دی تھی۔ میں اسے اپنے حواس پر اور اعصاب پر سوار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا کہ اسے شیرنی بن کر آنے نہیں دوں گا۔ شادی سے پہلے ہر طرح اپنے دباؤ میں رکھوں گا۔ پھر اسے شیرنی سے بکری بنا کر شادی کروں گا۔

میں نے ڈاکٹر سے پیشانی کے زخم کی مرہم پٹی کرائی۔ کالج جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ راستوں میں' بازاروں میں کوئی جوان لڑکی نظر آتی تو وہ شاہدہ لگتی تھی۔ یہ عجیب بات تھی کہ مجھے کسی دوسری لڑکی میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ میں کسی کے حسن و شباب کو دیکھ کر یونہی شغل کے طور پر اس کی طرف مائل ہونا چاہتا تھا تو دل کہتا تھا کہ یہ کزن کے مقابلہ میں خاک بھی نہیں ہے۔

شاہدہ کے معاملے میں بہت سے عوامل کارفرما تھے۔ ایک تو وہ رفتہ رفتہ حواس پر چھا گئی تھی۔ پھر میں نے جتنا قریب سے اس کے جلوے دیکھے تھے اتنا قریب کوئی دوسری نہیں آئی تھی۔ پھر وہ میری ضد بن گئی تھی۔ یہ بات میرے ذہن میں راسخ ہو گئی تھی کہ شادی سے پہلے اسے نہ توڑ سکا' اس کی برتری ختم نہ کر سکا تو پھر ہرگز شادی نہیں کروں گا۔

شام کو گھر آیا تو چاچی اور چاچا ناراض ہونے لگے۔ صبح میں ناشتا کئے بغیر چلا گیا تھا۔ وہ میرے لئے پریشان ہو رہے تھے۔ میری پیشانی پر کراس پٹی دیکھ کر اور پریشان ہو گئے۔ میں نے تسلی دی۔ جھوٹ کہہ دیا کہ موٹر سائیکل سے گر پڑا تھا لیکن معمولی چوٹ آئی ہے۔ شاہدہ دور ہی دور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے میرے چہرے پر اپنے خط کا جواب پڑھنا چاہتی ہو۔ میں نے اسے لگاوٹ سے نہیں دیکھا۔ اسے نظر انداز کرنے کی کوششیں کرتا رہا مگر وہ الو کی پٹھی نظروں سے گرتی بھی نہیں تھی۔ ایسی پیاری لگتی تھی کہ دل میں گھستی آتی تھی۔

عورت کی یہی کشش مرد کو اس کا مرید بناتی ہے۔ جو جلوہ ہائے حسن و شباب کی تابانی اور اداؤں کی دلربائی سے نکل آتا ہے' وہی مرد میدان ہوتا ہے۔ وہ اگلی صبح میرے کمرے میں ناشتا لے کر آئی۔ ٹرے میز پر رکھنے لگی۔ میں کھلے ہوئے دروازے کو دیکھا۔ راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے آہستگی سے کہا "تمہارے خط کا جواب دینا چاہتا ہوں۔"

وہ سر جھکا کر بولی "میں سن رہی ہوں۔"

"ابھی نہیں۔ رات کو جواب دوں گا۔"

اس نے ایک دم سے گھبرا کر دیکھا۔ پھر جلدی سے منہ پھیر کر بولی۔ "مم...... میں

رات کو نہیں آؤں گی۔"

"نہیں آؤ گی تو مختصر سا جواب سن لو۔ ابا تمہیں بہو بنانے آئیں گے لیکن میں شادی سے انکار کر دوں گا۔"

اس نے بڑے دکھ سے مجھے دیکھا۔ پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "کل رات کی غلطی کی اتنی بڑی سزا نہ دو۔ چاہو تو ابھی میرا ہاتھ توڑ دو۔"

"میں تم سے شادی کروں گا تمہارا ہاتھ نہیں توڑوں گا۔ تمہاری غلطی معاف کردوں گا۔ شرط یہی ہے کہ جب بلاؤں' تب چلی آؤ۔ اس کے آگے کچھ نہ بولو۔ بولو گی تو کچھ نہیں سنوں گا۔"

وہ مشکل میں پڑ گئی۔ سوچتی ہوئی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ میں ایک فاتح کی شان سے ناشتا کرنے اور چائے پینے بیٹھ گیا۔ میں پہلی بار اسے کمزور بنا کر ایک دوراہے پر لے آیا تھا اور یہی دانائی ہے' کسی کو بھی تابعدار بنانے کے لئے اسے پہلے سے کمزور بناتے رہنا ضروری ہے۔

تمام دن اضطراب میں گزرا۔ رات کو کھانا بھی اچھی طرح کھایا نہ گیا۔ جی چاہتا تھا کہ وقت جلدی گزرے۔ رات گہری ہو' بزرگ سو جائیں' سناٹا چھا جائے تو وہ چھم سے چلی آئے۔ میں نے کھانے کے دوران اسے دیکھا تھا۔ وہ چپ چپ سی تھی۔ وہ کشمکش میں ہو گی اسی لئے کسی سے نہیں بول رہی تھی۔ چاچا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں چلے گئے۔ چاچی کچن میں گئیں۔ اس نے جلدی سے میز پر ذرا جھک کر سرگوشی میں پوچھا "تمہاری یہی شرط ہے نا کہ میں رات کو آؤں؟"

میں نے لقمہ چباتے ہوئے کہا "ہاں آج رات کو۔"

"کیا تمہارے کمرے میں آؤں۔"

"اور نہیں تو کیا میدان میں ملو گی؟"

"میں آؤں گی تو تم شادی سے انکار نہیں کرو گے؟"

"تم میرا حکم مانتی رہو گی تو ضرور شادی کروں گا۔"

"اپنی امی اور ابا کی قسم کھا کر کہو۔ آج آؤں گی اور جب بلاؤ گے تب آؤں گی تو جلد سے جلد شادی کرو گے۔"

میں نے امی اور ابا کی قسم کھا کر یقین دلایا کہ جلد سے جلد اسے دلہن بنا کر لے جاؤں گا۔ وہ اٹھ کر ماں کے پاس کچن میں جانے لگی۔ میں نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ دل میں اعتراف کیا' وہ جاتی ہے تو سانس جاتی ہے' آتی ہے تو سانس آتی ہے۔ بڑی حیات پرور ہے' اسے ضرور شریک حیات بناؤں گا اور اس سے پہلے تابعدار بننے کی ٹریننگ دیتا رہوں گا۔

کھانے کے بعد میں کمرے میں آگیا۔ وہ ماں بیٹی کچن کی صفائی کر رہی تھیں۔ برتن دھو

رہی تھیں۔ معشوق نے ملنے کا وعدہ کیا ہو تو انتظار سب سے بڑی سزا بن جاتا ہے۔ میں دکھاوے کے لئے دروازہ کھول کر پڑھنے بیٹھ گیا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد گھر میں گہری اور پر اسرار خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس کمرے میں وہ فلم چلنے والی تھی' میں تصور میں اس کا نمونہ دیکھنے لگا۔ اس نمونے میں ساون کے گیتوں والی حسینائیں بھی جھلک رہی تھیں اور ہر حسینہ شاہدہ کا بدن چرا کر اپنے بدن پر سجا رہی تھی۔ اس دیوانگی کو کیا کہئے کہ ہر سو وہی ایک بدن انگڑائیاں سا لیتا تھا۔

بڑی دیر ہو گئی۔ میں نے دروازے پر آ کر دیکھا۔ پورا گھر خاموش تھا۔ راہداری ویران تھی۔ تمام کمروں کے دروازے بند تھے۔ ایسے میں اس دروازے کے پیچھے ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ آہٹ نے دل دھڑکا دیا۔ در پہ نظر گئی۔ وہ ذرا سا کھلا تھا۔ وہ ذرا سی جھلک رہی تھی۔ اس کا یوں آنا' ہائے کیا آنا تھا' صبر کو آزمانا تھا۔

دروازہ اور ذرا سا کھل گیا۔ اس کا گورا گورا گلابی چہرہ نگاہوں کے سامنے کھل گیا۔ اس نے سفید بے داغ لباس پہنا تھا۔ سفید دوپٹہ سر اور چہرے کے اطراف یوں بندھا ہوا تھا جیسے لڑکیاں نماز پڑھتے وقت باندھتی ہیں۔ پھر وہ دروازہ پوری طرح کھل گیا۔ پوری طرح اس سے آمنا سامنا ہو گیا۔ سامنا ہوتے ہی میں ایک دم سے گھبرا گیا۔ یہ مردانہ ارادہ تھا کہ آگے بڑھ کر اسے حاصل کروں گا لیکن پیچھے ہٹ گیا۔ وہاں کسی تیسرے کا خوف نہیں تھا۔ مجھے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ مجھے ایک فاتح کی شان سے آگے بڑھنا تھا لیکن پیچھے ہٹنے کے بعد ایک اور قدم پیچھے ہٹ گیا۔

میں الٹے پاؤں کمرے میں آیا۔ وہ سیدھے پاؤں میرے دروازے پر آئی۔ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "یہ ..... یہ کیا حرکت ہے؟ وا ..... واپس جاؤ۔ اسے اپنے کمرے میں رکھ کر آؤ۔"

اس کے سینے پر ایک چھوٹے سائز کا کلام پاک تھا جسے اس نے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ وہ نہایت ہی دھیمے اور ٹھنڈے لہجے میں بولی۔ "میں نے وعدہ کیا تھا۔ رات کو آؤں گی۔ تمہارے کمرے میں آؤں گی۔ سو آ گئی۔"

وہ آگے بڑھی۔ میں نے پیچھے ہٹ کر کہا "ہاں ..... مگر ..... مگر یہ ....."

"تم نے اگر مگر کی کوئی شرط نہیں رکھی تھی۔ صرف آنے کو کہا تھا۔"

"ہاں مگر تم چالاک ہو۔ تم میری نیت کو سمجھ کر آئی ہو۔"

"ہاں' سمجھ کر آئی ہوں اس لئے یہ کتاب لائی ہوں۔ تم کل تک اسے روز صبح پڑھتے تھے اور برسوں کی پڑھائی آج رات بھول گئے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم اس کا احترام کر رہے ہو اور خدا سے ڈر رہے ہو۔"

میں پیچھے جاتے جاتے الماری سے لگ گیا تھا۔ منہ پھیر کر بولا۔ "اسے لے جاؤ پھر آ کر میری بات سنو۔"

"شادی سے پہلے جب بھی آؤں گی اس کتاب کے ساتھ آؤں گی۔"

میں نے جھلا کر کہا "بکواس مت کرو۔ مجھے الو بناتی ہو اور شادی کا خواب دیکھتی ہو۔"

"کیا خواب؟ تم نے اپنی امی اور ابا کی قسم کھا کر وعدہ کیا تھا کہ میں رات کو تمہارے کمرے میں آؤں گی تو تم جلد سے جلد شادی کرو گے۔"

مجھے بھولی ہوئی قسم یاد آئی۔ میں نے اسے شدید حیرانی سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ "یہ لڑکی بہت خطرناک ہے۔ زبردست مکاری سے مجھے ماں باپ کی قسم کھلائی ہے۔ اب ایسے آئی ہے کہ میں اس کی آمد سے نہ انکار کر سکتا ہوں اور نہ اپنی قسم کو جھوٹی کہہ سکتا ہوں۔ جو لڑکی شادی سے پہلے اس طرح گھیر سکتی ہے وہ شادی کے بعد جانے کیسے کیسے نامعلوم شکنجوں میں کستی رہے گی۔

میں نے مٹھیاں بھینچ کر اور دانت پیس کر کہا "میرے اندر دھواں بھر گیا ہے۔ دماغ جل رہا ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے چلی جاؤ' ورنہ میں پھٹ پڑوں گا۔ پاگل ہو جاؤں گا۔ دیواروں سے سر ٹکرانے لگوں گا۔"

بولتے بولتے میری آواز تیز ہو رہی تھی۔ وہ اس خیال سے جانے لگی کہ میری آواز سن کر اس کے والدین نہ آ جائیں۔ میری یہ حالت تھی کہ میں ہوش سے بیگانہ ہو رہا تھا۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا وہ جا چکی تھی مگر برسات میں بھیگتا ہوا بدن میری آنکھوں کے سامنے آ آ کر ٹکریں مار رہا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیوار پر گھونسا مارتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن آنکھیں بند کرنے سے بلا نہیں ٹلتی۔ تصور میں اور زیادہ بھڑکتی ہے۔ میرے اندر شعلے بھڑک رہے تھے۔ وہ وہ دیکھو۔ وہ بارش میں پھسل رہی ہے۔ برسات میں بدن بول رہا ہے۔ بجلی کی طرح چمک رہا ہے۔ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح میرے ہاتھوں میں آ رہا ہے۔ آ رہا ہے یہ ...... یہ آ رہا ہے۔ مگر نہیں آیا۔ پتنگ واپس چلی گئی۔

میں ایک دم سے پھٹ پڑا بے اختیار حلق پھاڑ کر چیخنے لگا "نہیں' نہیں' ہا ہا ہا ہا ۔ ہا ہا ہا ہا ۔ دم دما دم برسات میں۔ ہاہاہاہا۔ دم دما دم برسات میں ......

مجھے کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا کہ میں اپنے اختیار میں نہیں ہوں۔ کبھی میز سے کبھی الماری سے اور کبھی دیواروں سے ٹکرا رہا ہوں۔ میں نے چاچا اور چاچی کی دھندلی سی جھلک بھی دیکھی۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔ پتا نہیں میں کن اندھیروں میں کھو گیا تھا۔ اگر پھٹ پڑتا تو زندگی تمام ہو جاتی۔ پھر نہ حسن ہوتا' نہ شباب ہوتا' رات ہوتی نہ برسات ہوتی۔ میں پچھلی نیکیوں اور موجودہ گناہوں کے ساتھ مٹی میں دفن ہو جاتا۔

ابھی زندگی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ کسی اسپتال کا کمرا تھا۔ چاچی کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ "اسے ہوش آ گیا ہے' ڈاکٹر کو بلائیں۔"

میں نے چاچا کو کمرے سے باہر جاتے دیکھا۔ چاچی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے میرے بچے نے آنکھ کھولی ہے۔ میں سات دیگوں

کی نیاز دلاؤں گی۔"

میں بہت سکون محسوس کر رہا تھا۔ دماغ ہر سوچ سے خالی تھا۔ میں نے خالی خالی نظروں سے چاچی کو دیکھا۔ وہ بولیں۔ "ڈاکٹر کہتا ہے تمہارے دماغ پر بہت بوجھ پڑا ہے۔ بیٹے! اتنا نہ پڑھا کرو۔ آگ لگا دو ایسی موٹی موٹی کتابوں کو جو پڑھنے والے کو پاگل بنا دیتی ہیں۔"

چاچا ڈاکٹر کے ساتھ آئے۔ ان کے پیچھے نرس اور وارڈ بوائے بھی تھے۔ ڈاکٹر نے میرے شانے کو تھپک کر کہا۔ "ہیلو مائی بوائے! تم تو بہت حوصلے والے ہو۔ دیکھو بالکل نارمل ہو۔ ہو نا؟"

میں نے پلکیں جھپک کر کہا "جی ہاں' تھینک یو ڈاکٹر۔"

وہ معائنہ کرتے ہوئے بولا۔ "کیا مجھ سے باتیں کرو گے؟"

"ضرور کروں گا۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "پلیز' آپ سب تھوڑی دیر کے لئے باہر جائیں۔"

چاچا' چاچی' نرس اور وارڈ بوائے وغیرہ باہر چلے گئے۔ ڈاکٹر نے کہا "میں دماغی امراض کا معالج ہوں۔ مجھ سے کچھ نہ چھپانا۔ جس قدر کھل کر گفتگو کرو گے اتنا ہی علاج آسان ہو گا۔"

"میں کچھ نہیں چھپاؤں گا۔"

"تم اچانک ایب نارمل کیوں ہو گئے تھے۔ تمہارے بزرگ کہتے ہیں پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے ایسا کیوں ہوا؟ مجھے ایسا لگا تھا جیسے میرے سر میں انگارے بھر گئے ہیں۔ اگر میں زور سے نہیں چلاؤں گا تو دماغ پھٹ جائے گا۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ میں چیخنے لگا تھا اور بے اختیار دیوار اور الماری سے ٹکرا رہا تھا۔ ایک بار میں نے چاچا اور چاچی کی موجودگی کو بھی سمجھا پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔"

"یہ تم کیفیت بتا رہے ہو۔ وجہ بتاؤ۔ تم کہتے ہو تمہارے سر میں انگارے بھر گئے تھے۔ کیوں بھر گئے تھے؟ وہ کیا بات ہے' جو ایب نارمل ہونے کی محرک بنی؟"

"ڈاکٹر! مرض کی وجہ ہر مریض نہیں جانتا۔ مرض کیوں لاحق ہوتا ہے اس کی تشخیص ڈاکٹر کرتا ہے۔"

"میں سمجھ گیا تم بتانا نہیں چاہتے۔"

"کوئی بات ہوتی تو ضرور بتاتا۔"

کیسے بتاتا؟ کیا میں اس جرم کا اعتراف کرتا کہ میرے اندر کی بارود سے کسی شریف زادی کی دھجیاں نہیں اڑیں' مجھ دہشت گرد کے پرزے اڑ گئے اور میں تو اسے شریف زادی مان نہیں سکتا تھا۔ اس نے ایک رات مجھے لہو لہان کیا تھا۔ دوسری رات اسپتال پہنچا

دیا تھا۔

ڈاکٹر نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ "تمہارے خاندان میں کبھی کوئی ایب نارمل رہا ہے۔"

میں نے کہا "جی ہاں' میرے دادا آخری تین برسوں میں دماغی مریض رہے۔ ایک ماہ تک مینٹل اسپتال میں رہے۔ پھر انہیں پاگل خانے منتقل کر دیا گیا۔

ڈاکٹر نے چاچا کو بلا کر پوچھا۔ انہوں نے تصدیق کی۔ پھر ڈاکٹر نے کہا "فی الحال تشویش کی بات نہیں ہے لیکن احتیاط لازمی ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ایسا دورہ پھر نہ پڑے تو ان کے دادا کی مکمل میڈیکل رپورٹ اور نفسیاتی تجزیے کی تفصیلی رپورٹ بھی لے آئیں۔ انہیں ابھی پر سکون رہنے کی دوائیں دی جا رہی ہیں۔ اگر نیند آئے تو سونے دیں۔ ورنہ ہنستے بولتے رہیں تاکہ ان کا دل بہلتا رہے۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ چاچی اور چاچا ہنس بول کر میرا دل بہلائیں۔ میرے دل بہلانے کا سامان یہ بزرگ گھر چھوڑ آئے تھے اور میں اس سامان کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ڈاکٹر نے جو سکون کی دوائیں دی تھیں ان سے دماغ کی گرمی اور جذباتیت ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ جہاں جنون ہو' وہاں سکون نہیں ملتا اور جب سکون مل جائے تو جنون سرد پڑ جاتا ہے۔ میں بڑے آرام سے سو گیا۔

امی اور ابا اطلاع ملتے ہی چلے آئے۔ امی دعائیں مانگتی ہوئی اسپتال کے کمرے میں آئیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے روتے ہوئے مجھے گلے سے لگایا۔ مجھے چومتے ہوئے پوچھا۔ "ماں کی جان! تجھے کیا ہو گیا تھا؟ کس دشمن کی نظر لگ گئی تھی؟ تو صبح سے آدھی رات تک پڑھتا کیوں ہے؟ ان کتابوں کی گرمی نہیں چڑھے گی تو اور کیا ہو گا۔"

ابا نے امی سے کہا۔ "زینت! کتابوں میں گرمی نہیں ہوتی' وہ ذہانت کے لئے تازہ ہوا کا جھونکا ہوتی ہیں۔ کتابیں ڈاکٹر پیدا کرتی ہیں مریض نہیں۔ بیٹے کے سامنے زیادہ نہ بولو۔ ڈاکٹر کی ہدایات یاد رکھو۔"

چاچا نے فون کے ذریعے ابا سے کہہ دیا تھا کہ وہ دادا جان کی میڈیکل رپورٹ لے آئیں۔ انہوں نے وہ رپورٹ لا کر ڈاکٹر کو دی تھی پھر مجھ سے تنہائی میں پوچھا۔ "کیا بات ہے بیٹے؟ تم تو بہت ٹھنڈے مزاج کے تھے پھر دماغ میں گرمی کیسے چڑھ گئی؟ کالج میں کسی سے جھگڑا ہوا تھا؟ تمہارا چاچا کہتا ہے تم یہ پیشانی کا زخم کالج سے لے کر آئے تھے۔ اگر کسی نے تمہاری توہین کی ہے' تمہاری خود داری اور برتری کو ٹھیس پہنچائی ہے تو اس کا نام اور پتا بتا دو۔ میں اس کی لاش تمہیں دکھا کر سکون پہنچاؤں گا۔ اپنے باپ سے کچھ نہ چھپاؤ۔"

"ابا! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں خود نہیں سمجھ پا رہا ہوں کہ یہ پاگل پن کا دورہ کیوں پڑا تھا۔"

"بیٹے! ڈاکٹر مجھ سے پوچھ رہا تھا کیا تم عاشق مزاج اور جذباتی ہو۔ میں نے فخر سے کہا کہ میرا بیٹا انتہائی شریف اور صوم و صلواۃ کا پابند ہے لیکن ڈاکٹر مجھے کرید رہا تھا۔ کہہ رہا تھا اکثر والدین اپنی اولاد کے معاملے میں ایسے ہی نیک خیالات رکھتے ہیں لیکن جوانی کے پیروں تلے کیلے کا چھلکا ضرور آتا ہے۔ تب مجھے یاد آیا کہ تم شاہدہ کو چاہتے ہو۔"

میں نے چونک کر کہا "نہیں' یہ آپ سے کس نے کہہ دیا؟"

انہوں نے مسکرا کر جیب سے وہی کاغذ نکالا' جس کی تحریر پوچھتی تھی کہ چچا کی بیٹی کو کیا کہتے ہیں؟ پھر جواب بھی لکھا تھا کہ بچپن میں بہن اور جوانی میں کزن کہتے ہیں۔ یعنی وہ

ایسی تحریر تھی جسے باپ کے نام پوسٹ کرنے کے بعد بیٹے اور بھتیجی کا عشق سمجھائے بغیر سمجھ میں آ جاتا تھا۔

انہوں نے وہ کاغذ دکھاتے ہوئے پوچھا۔ "یہ تم نے ہی لکھا ہے؟ انکار نہ کرنا۔ رائٹنگ تمہاری نہیں ہے۔ تم نے کسی سے لکھوایا ہے۔ اسے میرے پاس بھیجنے کے لئے تم میں اتنی جرات نہیں تھی کہ لفافے پر اپنے ہاتھ سے ایڈریس لکھتے۔ تم نے شاہدہ سے ایڈریس لکھوا کر اسے پوسٹ کرایا۔"

"ابا! آ .... آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔"

"لیکن ڈاکٹر غلط نہیں سمجھ رہا ہے۔ میں نے یہ اسے پڑھایا ہے۔"

میں نے ایک ہاتھ سے سر تھام لیا۔ اسی وقت امی نے کمرے میں آ کر کہا۔ "شاہدہ گھر سے کھانا لائی ہے۔"

میں نے پریشان ہو کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ بڑا سا ٹفن کیریئر اٹھائے امی کے پیچھے کھڑی تھی۔ ابا مسکراتے ہوئے اٹھ گئے۔ امی سے بولے۔ "ادھر آؤ۔ تم سے کچھ کہنا ہے۔"

وہ امی کو باہر لے گئے۔ شاہدہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بیڈ کے پاس آئی۔ سرہانے والی میز کے خانے سے برتن اور چمچے نکالنے لگی۔ میں نے اسے صرف ایک نظر دیکھا تھا پھر سر جھکا لیا تھا۔ میرا سر ندامت کے احساس سے نہیں اپنی شکست کے خیال سے جھکا تھا۔ اس نے مجھے توڑ پھوڑ کر اسپتال پہنچایا تھا۔ یہ ذلت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

وہ ٹفن کیریئر کھول کر روٹیاں اور سالن پلیٹ میں ڈالتے ہوئے بول رہی تھی۔ "تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ مجھے غلط نہ سمجھو۔ اسپتال سے گھر آؤ گے تو تمہارے قدموں میں گر جاؤں گی۔ تایا ابا نے میرے ابا کو وہ خط دکھایا ہے جو تم نے لکھا تھا اور میں نے پوسٹ کیا تھا۔ ہمارا رشتہ جلد ہی پکا ہو جائے گا۔ تم نے اپنی امی اور ابا کی قسم کھائی تھی کہ مجھے اپنے گھر کی عزت بناؤ گے۔"

وہ عاجزی سے بولی۔ "خدا جانتا ہے میں نے ...."

میں نے بات کاٹ کر کہا "بکواس مت کرو اور سنو۔ میں پھر اپنی اور ابا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہیں اس بری طرح ذلیل کروں گا کہ سب تمہارے منہ پر تھوکیں گے۔ اسی لمحے سے تمہاری ذلت شروع ہو گی۔ بزرگ سمجھتے ہیں یہ محبت سے لایا ہوا کھانا میں تمہاری میزبانی میں کھاؤں گا۔ نہیں' باہر جاؤ اور انہیں بتا دو کہ میں نے تمہارا لایا ہوا کھانا سونگھنے سے بھی انکار کر دیا ہے۔"

اس کی صورت ایسی ہو گئی تھی جیسے اب تب میں رو پڑے گی۔ میں اس کا ڈسا ہوا تھا۔ مجھے اس پر ترس نہیں آ سکتا تھا۔

اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ ادھر کوئی نہیں تھا۔ وہ جلدی سے ہاتھ جوڑ کر

بولی۔ "ہمارے بزرگ راضی ہیں' سب کے سب خوش ہیں۔ امی کہہ رہی تھیں ڈاکٹر نے بھی فوراً" شادی کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ میں ہاتھ جوڑ کر منت کرتی ہوں۔ غصہ تھوک دو۔ میرے منہ پر تھوک دو۔ تنہائی میں خوب انتقام لو مگر مجھے ایک بار اپنا لو' میں تمہاری ساری شکایتیں دور کردوں گی۔"

میں نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ اس نے موسم باراں کی مناسبت سے دھنک لباس پہنا تھا۔ شاید غسل کرتے ہی گھر سے نکل آئی تھی۔ زلفیں بھیگی بھیگی سی تھیں۔ اگر وہ اور قریب ہوتی تو اس کی سانسوں سے برسات کی بھیگی ہوئی ہوا آتی۔ ہزار نفرت کے باوجود مانتا ہوں کہ بڑے ہی نامعلوم طور طریقوں سے اس کی ضرورت میرے اندر پرورش پاتی رہتی ہے۔ میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "یہ اپنے دونوں ہاتھ نہ جوڑو۔ میرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ جوڑو۔ تمہاری التجا کا یہ انداز دیکھ کر آخری موقع دیتا ہوں۔ شرط وہی ہے۔ وعدہ کرو۔ آج رات ہسپتال میں تم میرے پاس رہو گی۔"

اس نے بے بسی سے پریشان ہو کر مجھے دیکھا پھر کہا "یہ کیا کہہ رہے ہو؟ ہمارے بزرگ کبھی اجازت نہیں دیں گے۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ اجازت نہ ملے تو گھر سے بھاگ کر آ جاؤ۔ کل رات تم نے دھوکا دیا' مذہب کی آڑ لے کر مجھے بے وقوف بنایا۔ تم اس کی تلافی کیسے کرو گی؟ یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔"

وہ سوچتی رہ گئی۔ چند لمحوں تک ایسی گم صم رہی جیسے سولی پر چڑھنے آئی ہو۔ پھر وہ بولی۔ "مجھے سوچنے کی مہلت دو۔ روٹی کھا لو۔"

میں بستر پر کھسک کر سرہانے کے قریب آیا۔ پھر کھانا کھانے لگا۔ وہ بڑی عاجزی سے بولی۔ "تم میرا مزاج اور میری فطرت کو کیوں نہیں سمجھ رہے ہو۔ اگر تمہاری بے جا ضد مان لوں گی تو اپنی نظروں سے گر جاؤں گی۔ میرے اندر کی لڑکی مجھے زندہ رہنے نہیں دے گی۔"

"تم کسی غیر کی نہیں اپنے ہونے والے شوہر کی ضد ماننے والی ہو۔"

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ آؤں گی تو پھر کوئی گڑبڑ ہو جائے گی۔ قدرت کے اشاروں کو اور غائبانہ تنبیہہ کو سمجھو۔ ایک رات زخمی ہوئے۔ دوسری رات ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ پتا نہیں تیسری رات کیا ہو جائے گا۔"

"جو ہو گا' اس کی ذمے داری میری ہو گی۔ میں صرف ایک بات جانتا ہوں کہ آج رات تم آؤ گی۔ ورنہ زندگی میں پھر کبھی نہیں آؤ گی۔"

وہ کھانے کے بعد ٹفن کیریئر لے کر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی کچھ بے چینی سی ہوئی۔ ڈاکٹر نے سکون کی دوائیں دی تھیں۔ میں نے پھر اسے رات کو بلا کر بدپرہیزی کی تھی۔ وہ آتی یا نہ آتی لیکن اس کے آنے کا تصور ہیجان انگیز تھا اور یہ موجودہ دواؤں کے

منافی تھا۔

اگر میں صبر کر لیتا۔ اسپتال سے چھٹی کے بعد گھر جاتا اور وہاں اپنی بات منواتا تو میرے لئے بہتر ہوتا لیکن وہ پوسٹ کیا ہوا خط اندیشہ پیدا کر رہا تھا کہ آج کل میں ہمارا رشتہ طے ہو جائے گا۔ پھر وہ اور سر چڑھے گی۔ اسے آج ہی سر سے اتار کر قدموں میں گرانا لازمی ہو گیا تھا۔

شام چھ بجے تک ابا کو میرے پاس رہنا تھا۔ رات نو بجے امی کے آنے کے بعد وہ گھر جا کر آرام کرتے۔ ایک وارڈ بوائے نے آ کر کہا۔ "آپ کا فون ہے۔ اٹینڈ کر لیں۔"

ابا یہ کہتے ہوئے گئے کہ تمہاری ماں کا فون ہو گا۔ ابھی آتا ہوں۔ میں سوچنے لگا امی رات کو میرے پاس رہنے آئیں گی تو شاہدہ نہیں آ سکے گی۔ ویسے بھی ہمارے بزرگ ہمیں اسپتال کے کمرے میں رات سے صبح کرنے کی اجازت نہ دیتے۔ یہ تو میں نے شاہدہ کو پرابلم میں ڈالا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ مستقبل میں کروڑ پتی چودھرائن بننے کے لئے کیا کر سکے گی۔

ابا نے واپس آ کر کہا "شاہدہ کا فون ہے جاؤ بات کر لو۔"

میں نے بستر سے اتر کر چپل پہنیں۔ پھر کمرے سے نکل کر نرس کے چیمبر میں آیا۔ ہیڈ نرس نے ایک طرف رکھے ہوئے ریسیور کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے کہا "ہیلو، میں سلمان بول رہا ہوں۔" ہیڈ نرس وہاں سے چلی گئی۔

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "میں ہوں شاہدہ۔"

"ہاں بولو، آ رہی ہو یا کوئی رکاوٹ ہے؟"

وہ ذرا چپ رہی پھر بولی۔ "آ سکتی ہوں۔ بے حیائی کو آتے جاتے کون روک سکتا ہے۔ لڑکی گھر سے بھاگنا چاہے تو ہزار حیلوں بہانوں سے بزرگوں کو چکر دے سکتی ہے۔"

"کیا تم نے کوئی تدبیر سوچی ہے؟"

"میرے پاس خواب آور گولیاں ہیں۔ اپنے والدین اور تمہارے والدین کو دودھ یا چائے میں دو دو گولیاں دے کر صبح تک سلا سکتی ہوں۔"

"میں مانتا ہوں اس قسم کی چالبازیوں میں تمہارا جواب نہیں ہے۔"

"میں نے یہ چالبازی یا شیطانی حرکت ان راتوں میں نہیں کی جب ہمارے کمرے ایک دوسرے کے بالکل قریب تھے۔ میں نے راتیں کالی کرنے کے لئے اپنے والدین کو نیند کی گولیاں نہیں کھلائیں۔"

"تم بات لمبی کر رہی ہو، آخر کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"یہی کہ تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں۔ خود کو تمہاری امانت سمجھتی ہوں اور شادی سے پہلی امانت میں خیانت نہیں کرنا چاہتی۔"

"کیا یہی بکواس کرنے کے لئے فون کیا ہے۔"

"یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم کزن ہو یا گناہ گار؟"

"میں گناہگار ہوں اور یہ گناہ تمہارے ساتھ ہوا ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟"

"میں یہ بکواس خاندان کے بزرگوں تک پہنچاؤں گا اور صاف کہہ دوں گا کہ ایسی لڑکی شریک حیات بننے کے قابل نہیں رہتی جو پہلے ہی کزن کے ساتھ منہ کالا کر لیتی ہو۔"

کزن! کزن! تم اتنا بڑا جھوٹ بولو گے؟ اتنی شرمناک تہمت لگاؤ گے؟ فون پر اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ شاید وہ کیچڑ اچھالنے پر طیش میں آ گئی تھی یا صدمے سے ٹوٹ رہی تھی۔ میں نے کہا "تمہاری نیک نامی کے لئے صرف آج کی رات رہ گئی ہے۔ گناہگار کے پاس آ کر ہمیشہ کے لئے نیک ہو جاؤ یا گناہ سے دامن بچا کر عمر بھر کی بدنامی مول لو۔"

یہ کہتے ہی میں نے ریسیور رکھ دیا۔ اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ ابا نے مسکرا کر کہا۔

"شادہ تمہارے لئے بڑی پریشان رہتی ہے۔ خیریت پوچھ رہی ہو گی۔"

"خیریت پوچھنے کا تو بہانہ ہے۔ مجھے پریشان کرتی رہتی ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو بیٹے؟"

"وہ آپ کے بھائی کی بیٹی ہے۔ آپ کو برا تو لگے گا لیکن سچ تو سچ ہے۔ اسے بڑوں کا لحاظ اور شرم نہیں ہے۔ ابھی فون پر ضد کر رہی تھی کہ رات کو اسپتال میں رہے گی۔ میں نے پوچھا تمہیں اپنی اور خاندان کی عزت کا خیال ہے یا نہیں۔ ہمارے بزرگ بے غیرت نہیں ہیں کہ جوان لڑکی کو اسپتال میں جوان لڑکے کے پاس چھوڑ دیں۔"

ابا نے شدید حیرانی سے پوچھا "کیا شادہ یہاں رات کو آنا چاہتی ہے؟ بیٹے، مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔"

"یقین نہ کریں۔ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔"

"نہیں، میں تمہیں جھوٹا نہیں کہتا مگر......"

"مگر وہ بچی، نیک اور پارسا ہے۔ ابھی آپ یہاں سے گھر جاتے تو وہ میری خیریت معلوم کر لیتی۔ گھڑی دیکھیں، ساڑھے چھ ہو چکے ہیں۔ رات کی تاریکی پھیل رہی ہے۔ ایسے میں وہ گھر سے نکل کر کس پبلک کال آفس میں فون کرنے آئی تھی؟ کیوں اس نے فون کیا؟ اسی لئے کہ مجھ سے یہاں آنے کی ضد کرے۔"

وہ سوچ میں پڑ گئے پھر بولے "کوئی بات نہیں بیٹے۔ ابھی بچی ہے۔ نادان ہے۔ یہ بات اپنی ماں سے نہ کہنا۔ وہ تو میرے خاندان والوں سے خار کھاتی ہے۔ اپنی بہن کی بیٹی سے تمہارا رشتہ کرنا چاہتی ہیں۔"

"ابا! اول تو میں اتنی جلدی ...... شادی کے خلاف ہے۔ پھر میں نے قریب رہ کر شاہدہ کے وہ رنگ ڈھنگ دیکھے ہیں کہ بس۔ آگے یہ کہاوت کافی ہے۔ کہ آنکھوں دیکھی مکھی نگلی نہیں جاتی۔"

ابا ایک جھٹکے سے یوں اٹھ کھڑے ہوئے جیسے منہ پر جوتا پڑا ہو۔ وہ شاہدہ کو بیٹی سمجھتے تھے۔ وہ سگے بھائی کی بیٹی تھی' اسے دل و جان سے چاہتے تھے۔ اس پر اتنا شرمناک الزام آیا تو وہ تڑپ گئے۔ بے چینی سے میرے بیڈ کے پاس ٹہلنے لگے۔ پھر میرے سامنے رک کر بولے۔ "شاہدہ کی بدنامی' میری تمہاری اور پورے خاندان کی بدنامی ہے۔ اس سلسلے میں میری دو باتیں یاد رکھو۔ ایک تو یہ کہ یہ الزام جھوٹا نہ ہو۔ دوسری یہ کہ الزام جھوٹا ہو یا سچا۔ یہ بات اسپتال کے اس کمرے سے باہر نہ جائے۔ اب بتاؤ کیا تم نے اپنی آنکھوں سے ہماری بچی میں کوئی خرابی دیکھی ہے۔ اگر نہیں دیکھی تو کوئی ثبوت یا گواہ ہے۔ اگر ہے تو ابھی پیش کرو۔"

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ابا شاہدہ کو اس قدر غیرت کا مسئلہ بنا لیں گے۔ جب وہ گناہگار نہیں تھی تو میں اس کے خلاف ثبوت اور گواہ کہاں سے لاتا؟ انہوں نے پوچھا "تم نے مجرموں کی طرح سر کیوں جھکا لیا ہے؟"

میں نے جھجکتے ہوئے کہا "آپ کے سامنے جھکا ہوا سر مجرم کا نہیں گناہگار کا ہے۔"

میں بدستور سر جھکائے بیٹھا تھا اور اپنی خاموشی کو اقرار بنا رہا تھا۔ تہذیب اور شرم کے پردے میں رہ کر سمجھ رہا تھا کہ گناہگار ہی اپنے اور اس کے گناہ کا چشم دیدہ گواہ ہوتا ہے۔

پھر میں نے دیکھا کہ وہ تڑپ کر میری طرف آئے اور ایک زور دار طمانچہ میرے منہ پر رسید کر دیا۔ "ذلیل! کمبخت! تم عبادت کرتے ہو۔ خدا کا کلام پڑھتے ہو۔ پورے خاندان میں فرشتہ کہلاتے ہو اور تم نے ایسی حرکت کی۔ تم میرے بھائی کے گھر میں کھاتے رہے اور میرے بھائی کے گھر میں تھوکتے بھی رہے۔ ایک کتا بھی مالک کے گھر میں پیشاب نہیں کرتا۔ تم نے میرا سر شرم سے جھکا دیا ہے۔"

وہ زور زور سے سانسیں لے رہے تھے جیسے اپنے اندر بیٹے کی محبت سے کشتی لڑ رہے ہوں۔ اگر میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اسے گولی مار دیتے۔ وہ کبھی غصے سے ٹہل رہے تھے۔ کبھی بیٹھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ میں اس لیے خون کے گھونٹ پی رہا ہوں کہ گھر کا معاملہ ہے۔ بیٹے اور بھتیجی کی غلطی ہے۔ اسپتال سے چھٹی ہوتے ہی تم دونوں کا نکاح پڑھا کر اس غلطی پر پردہ ڈال دیا جائے گا۔"

میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ بازی میرے خلاف ہو گئی تھی۔ میں اپنے اوپر حاوی رہنے والی لڑکی کو شریک حیات نہیں بنانا چاہتا تھا۔ میں نے سر جھکا کر کہا "ابا! میں شادی نہیں کروں گا۔ امی بھی اسے بہو نہیں بنائیں گی۔"

انہوں نے آنکھیں نکال کر تنبیہہ کے انداز میں انگلی دکھاتے ہوئے کہا "خبردار! اپنی امی سے ایسی کوئی بات نہ کرنا جس سے شاہدہ پر داغ لگتا ہو۔ تمہاری ماں یہ بدنامی اپنے میکے والوں میں پھیلا دے گی۔"

"ابا! یہ شادی میری بربادی ہوگی۔"

"بربادی ہونے دو۔ میرا فیصلہ نہیں بدلے گا۔"

میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ایک تو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شاہدہ کا پلڑا کیسے بھاری ہو جاتا تھا۔ میں جدھر سے اس پر حملے کرتا تھا ادھر سے مات کھاتا تھا۔ وہ سنجیدہ' باوقار اور شرم والی تھی۔ میں اس کی شخصیت کو مسخ کرنے میں ناکام رہتا تھا اور یہی باتیں خطرے کی گھنٹی بجاتی تھیں کہ شادی کے بعد وہ ہر پہلو سے مجھ پر حاوی رہے گی۔

انہوں نے کہا۔ "میں کل صبح ڈاکٹر سے کہوں گا کہ تمہیں چھٹی دے دے۔ میں جب تک تمہاری شادی نہیں کراؤں گا مجھے سکون نہیں ملے گا۔ میں راتوں کو سو نہیں سکوں گا۔"

"اب ایسی بھی کیا جلدی ہے ابا؟ میری تعلیم تو مکمل ہونے دیں۔"

"مجھے تعلیم سے زیادہ تمہاری سلامتی کی فکری ہے۔ میں نہیں چاہتا تمہارے ساتھ بھی وہی ہو جو تمہارے دادا کے ساتھ ہوا تھا۔ ان کی موت پاگل خانے میں ہوئی تھی۔ تمہاری دادی کی وفات کے بعد وہ ایک عورت کے دیوانے ہو گئے تھے۔ انہوں نے اس پر دولت لٹائی تاکہ وہ شادی کر لے لیکن اس نے دور ہی دور سے انہیں دیوانہ بنا کر پاگل خانے پہنچا دیا تھا۔"

یہ تو میں جانتا تھا کہ دادا پاگل ہو گئے تھے لیکن یہ اب پتا چلا کہ انہیں ایک عورت نے پاگل بنا دیا تھا۔ اگر مجھے پہلے ان کے پاگل پن کی وجہ بتائی جاتی تو میں اسے دادا جان کی حماقت کہتا۔ بھلا عورت بھی کوئی چیز ہے جس کے لئے پاگل ہوا جائے۔ لیکن اب ذاتی تجربات سے تسلیم کر رہا تھا کہ عورت کس طرح رفتہ رفتہ ہمارے اندر سرنگ بناتی ہے اور ہماری پہلی اور آخری ضرورت بن کر حواس پر چھا جاتی ہے۔ وہ ملے تو ہم ہوش مند' نہ ملے تو دیوانے ہو جاتے ہیں۔

میں اوپر سے کزن کے خلاف لڑ رہا تھا۔ اس پر کیچڑ اچھال رہا تھا۔ اسے شریک حیات نہیں داشتہ بنانا چاہتا تھا لیکن اندر سے اس کی ضرورت پکار رہی تھی۔ ابھی تو امی اور ابا کی موجودگی نے مجھے نارمل بنایا ہوا تھا۔ یہ نہ ہوتے اور تنہائی میں وہ ہوتی اور اس پر میری حکمرانی نہ چلتی تو میں پھر آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑتا اور اسپتال کے بجائے پاگل خانے پہنچا دیا جاتا۔

خاندانی پس منظر اور موجودہ حالات کے مطابق عقل یہی سمجھاتی تھی کہ شادی جلد ہو جائے اور میں دادا جان کی تاریخ نہ دہراؤں اور یہ طے کر لوں کہ شادی کے بعد کس طرح شاہدہ کو پاؤں کی جوتی بنا کر پہنے رہنا ہے۔ فوری طور پر یہی بات عقل میں آئی کہ اسے نظروں سے گرا کر اپنی زندگی میں لایا جائے۔ میں نے کہا "ابا! میں آپ کی ہر بات مان لوں گا۔ آپ میری ایک بات مان لیں۔"

"بات معقول ہوگی تو ضرور مانوں گا۔"

"آپ ہمارا رشتہ پکا کرنے سے پہلے مجھ کو اور شاہدہ کو لعن طعن کریں۔ میرے ساتھ اسے بھی احساس دلائیں کہ ہم نے بزرگوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔"

"شاباش بیٹے شاباش! تمہارے یہ احساسات اور خیالات سن کر دل خوش ہو گیا۔ میں شاہدہ کو اس سلسلے میں ضرور ڈانٹوں گا۔"

مجھے کسی قدر اطمینان ہوا۔ میں نے اسے چیلنج کیا تھا کہ اس کی پارسائی کے غرور کو خاک میں ملاؤں گا۔ وہ اپنی ذات میں لاکھ پارسا رہے لیکن اس کا دامن داغدار اور آنچل تار تار دکھائی دیتا رہے گا۔

پھر یہی ہوا۔ اس رات ابا نے گھر جا کر چاچا اور چاچی کو ہماری غلطی کے متعلق بتایا۔ میں وہاں تماشا دیکھنے کے لئے موجود تھا۔ لیکن قیاسا" کہہ سکتا تھا کہ چاچا کا سر شرم سے جھک گیا تھا۔ چاچی نے بیٹی کی پٹائی کی تھی۔ وہ قسمیں کھا کر کہہ رہی تھی کہ وہ اتنی ہی پاک ہے جتنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے بعد رہتی آئی ہے لیکن کوئی یقین نہیں کر رہا تھا۔ مجھ جیسا فرشتہ کہلانے والا خود کو اس کے ساتھ گناہگار ٹھہرا رہا تھا۔ ایسی صورت میں اس کا انکار اور اس کی قسمیں بے وزن ہو کر رہ گئی تھیں۔

دوسری صبح پانچ بجے وہ تنتناتی ہوئی اسپتال کے کمرے میں آ گئی۔ امی میری بیڈ کی پائنتی پر سکڑ کر سو رہی تھیں۔ اس کی آواز سن کر اٹھ بیٹھیں۔ شاہدہ مجھ سے کہہ رہی تھی۔ "چلو اٹھو یہاں سے اور مسجد میں چلو۔ میں تمہارا ایمان دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم خدا کے گھر میں بھی سچ بول سکتے ہو یا نہیں؟"

میں ایک دم سے بوکھلا گیا۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ بزرگوں کا خوف اور لحاظ بھول کر یوں چڑھ دوڑے گی۔ امی نے گھور کر پوچھا "شادہ! بات کیا ہے؟ تو میرے بیٹے کو مسجد کیوں لے جائے گی؟"

"یہ آپ اپنے بیٹے سے پوچھیں۔"

"میں تجھ سے پوچھ رہی ہوں؟ اتنی صبح اکیلی آئی ہے۔ گھر سے منہ اندھیرے نکلی ہو گی۔ کیا میرے بیٹے کے ساتھ فجر کی نماز پڑھنے آئی ہے۔"

"آپ نے درست سمجھا ہے۔ یہ ابھی میرے ساتھ مسجد میں جائے گا۔"

"کیسی بدتمیزی سے بول رہی ہے۔ یہ تجھ سے عمر میں بڑا ہے۔"

وہ بولی "اپنی ماں کو بتاؤ' تم کرتوت میں شیطان سے بھی بڑے ہو۔"

میں نے کہا۔ "امی! آپ خاموش رہیں۔ یہ غصے میں ہے۔ خواہ مخواہ بات بڑھے گی۔"

"بیٹے! تم اس لڑکی کے غصے سے ڈر رہے ہو؟"

وہ بولی۔ "ڈرنے کی بات ہے۔ اس لئے بچہ ڈر رہا ہے۔"

وہ بیڈ سے اتر کر چپلیں پہنتے ہوئے بولیں۔ "آخر بات کیا ہے۔ یہ شیرنی بن کر گھر سے یوں غراتی کیوں آئی ہے اور اتنی سر چڑھ کر کیوں بول رہی ہے؟"

اسی وقت چاچی' چاچا اور ابا تیزی سے چلتے ہوئے آئے۔ انہوں نے شاہدہ کو دیکھا۔ پھر مجھے کاغذ کا ایک ٹکڑا دکھا کر کہا "شادہ یہ پرچی گھر میں لکھ کر آئی ہے کہ یہ ابھی تمہیں مسجد میں لے جانے کے لئے اسپتال جا رہی ہے۔"

چاچی نے بیٹی سے کہا "تجھے پرچی لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا یہاں آنے کے لئے مجھ سے نہیں کہہ سکتی تھی؟"

"آپ لوگوں سے کہتی تو یوں آنے کی اجازت نہ ملتی۔ ان صاحبزادے کو مجھ پر اور زیادہ کیچڑ اچھالنے اور اپنا بچاؤ کرنے کا موقع مل جاتا اور مجھے محاسبہ کرنے میں جتنی دیر ہوتی اتنی دیر تک میری ناکردہ بے حیائی پر میرے امی ابا کا کلیجہ چھلنی ہوتا رہتا۔"

میرے ابا نے کہا "بیٹی! اونچی آواز میں نہ بولو۔ اسپتال والے جمع ہو جائیں گے۔"

"ہونے دیں۔ جب میں بدنام ہو رہی ہوں تو سب ہی بدنام ہوں گے۔ آپ کو خاندان کی عزت اور غیرت کا اتنا ہی خیال ہے تو بیٹے کو ابھی مسجد میں لے چلیں۔"

ابا نے مجھ سے کہا۔ "اٹھو یہ جہاں کہتی ہے' وہاں چلو۔"

میں مشکل میں پڑ گیا۔ اسپتال یا گھر میں باتیں ہوتیں تو میں سو پینترے بدل کر اسے جھوٹی اور بدکار ثابت کر دیتا لیکن میں نے تو پہلے ہی اس کے متعلق رائے قائم کر لی تھی کہ یہ مرد کو شکنجوں میں کسنے والی لڑکی ہے۔ اب یہ مجھے اللہ کے گھر میں پکڑے لے جا رہی تھی۔

یہ درست ہے کہ بے ایمان عدالتوں میں کلام پاک اٹھا کر اور مسجد میں قسمیں کھا کر بھی جھوٹ بولتے اور دھوکا دیتے ہیں لیکن میری گھٹی میں اللہ کا خوف تھا۔ اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ میں مسجد جانے کے لئے بستر سے نہیں اٹھا۔ مجرم کی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا۔ ابا نے کہا۔ "تم نے سنا نہیں؟ یہاں سے اٹھو اور چلو۔"

امی نے کہا۔ "یہ آپ لوگ میرے بیٹے کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟"

ابا نے کہا "صبر کرو۔ ابھی معلوم ہو جائے گا۔"

میں بیڈ سے اتر کر امی کے پیچھے آ گیا۔ ان کے پاس پناہ لے کر بولا "امی! میں آپ کے پاس رہوں گا۔ ان لوگوں کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔"

ابا نے کہا "اچھا ماں کی گود میں چھپ رہے ہو۔ اس کا مطلب ہے تم جھوٹ بول رہے تھے۔ معصوم شادہ پر شرمناک الزام لگا رہے تھے۔ یہ شیطنت تمہارے اندر کیوں پیدا ہوئی؟"

چاچا نے پوچھا۔ "میں نے تمہیں بیٹا بنا کر رکھنے میں کوئی کمی کی تھی؟"

چاچی نے کہا "بیٹے! مائیں دودھ پلا کر پالتی ہیں۔ میں تو دعائیں مانگ مانگ کر تمہیں پالتی رہی۔"

شاہدہ نے کہا "امی! آپ اسے بیٹا نہ کہیں۔ کیونکہ یہ میرا بھائی کہلانے کے لائق نہیں

ہے۔ مجھ پر تہمت لگانے والا میرا مجازی خدا بھی نہیں بن سکے گا۔ اگر یہ میرے گھر میں قدم رکھے گا تو میں گھر چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔"

ابا نے کہا۔ "بیٹی! غصہ برداشت کرو۔ میں مانتا ہوں تمہاری انا کو مجروح کیا گیا ہے لیکن یہ ہمارے گھر کے اندر کا معاملہ ہے۔ جو بات بگڑ چکی ہے' اسے ہم بنائیں گے۔ میں اسے ایسی سزا دوں گا' ایسی سزا دوں گا کہ ......"

شاہدہ نے کہا۔ "نہیں' آپ میں سے کسی کی بھی دی ہوئی سزا اسے کم پڑے گی۔ سزا میں دے رہی ہوں۔"

ابا نے کہا "میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔"

چاچا نے کہا۔ "بیٹی بات ختم کرو۔"

"کیا میری بے گناہی ثابت نہ ہوتی تو بات ختم ہو جاتی؟ کیا مجھے دلہن بنا کر لے جانے سے بدکاری کا داغ مٹ جاتا۔ بیٹی باپ کے گھر سے ہزاروں لاکھوں کا جہیز لے کر جاتی ہے لیکن ماں کی تربیت بیٹی کی بے داغ آبرو جہیز میں دیتی ہے۔ اس جھوٹے الزام کے بعد میری ماں کے پاس بیٹی کو دینے کے لئے کچھ نہیں رہا تھا۔ یہ شخص مجھے بیوی بنانے کے بعد تمام رشتے داروں اور دوستوں میں اسی طرح ذلیل کرتا جیسے شادی سے پہلے کر رہا ہے۔ کل ہی اس نے فون پر مجھے ذلیل اور رسوا کرنے کا چیلنج کیا تھا۔"

سب نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ ابا نے پوچھا "تم نے ایسا چیلنج کیوں کیا تھا؟"

میں امی کے پیچھے ان سے لپٹا ہوا تھا۔ وہی میرا مضبوط سہارا تھیں۔ میں نے کہا۔ "امی! ڈاکٹر نے کہا ہے مجھے پریشان نہ کیا جائے۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے امی!"

وہ بولیں۔ "میرے بچے کو آرام کرنے دیں۔ کیا آپ اسے پاگل بنا دینا چاہتے ہیں۔"

ابا نے کہا۔ "میں شادہ سے آخری بار پوچھ رہا ہوں۔ کیا اس مکار فریبی لڑکے کو معاف کرے گی۔ اگر نہیں کرے گی تو آج سے میں اسے اپنا بیٹا تسلیم نہیں کروں گا۔"

"مجھے افسوس ہے تایا ابا! میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی لیکن ایک درخواست کروں گی۔ جانے سے پہلے آخری بار آپ کے بیٹے سے تنہائی میں دو باتیں کرنا چاہوں گی۔"

ابا نے چاچا کو دیکھا۔ چاچا نے کہا۔ "بھائی جان! آپ بڑے ہیں۔ ہمیں اپنی بیٹی پر اعتماد بھی ہے اور فخر بھی۔"

امی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "یہ میرے بیٹے سے تنہائی میں کیا کہنا چاہتی ہے؟ میں اسے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

ابا نے کہا۔ "سیدھی طرح باہر چلو اور دونوں کو تھوڑی دیر کے لئے تنہا چھوڑ دو۔"

میں نے کہا۔ "امی آپ جائیں۔ فکر نہ کریں۔"

امی دوسرے تمام بزرگوں کے ساتھ کمرے سے جانے لگیں۔ میں بستر پر آ کر بیٹھ گیا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے کے پاس گئی۔ پھر اس کے دونوں پٹ بند کر کے فاتحانہ شان سے میری طرف گھوم گئی۔ ہماری نظریں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں۔ کبھی وہ نظریں جھکا لیا کرتی تھی' اب جھکنا اور گرنا بھول گئی تھی۔ اس نے کہا "یہ پرانی کہاوت ہے کہ بدا اچھا بدنام برا۔ اگر ہمارے درمیان بدی ہوتی تو شاید میں اسے برداشت کر لیتی لیکن تم نے بدنام کر کے بڑی کمینگی کا ثبوت دیا ہے۔ اسے میں برداشت نہیں کروں گی۔ تم نے ناجائز طریقوں سے مجھے حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اب جائز طریقے سے بھی حاصل نہیں کر سکو گے۔" وہ ٹہلنے کے انداز میں چلتی ہوئی میرے بیڈ کے ایک طرف سے دوسری طرف آئی پھر بولی۔ "میں پھر اکیلی تمہارے کمرے میں ہوں۔ مرد کے بچے ہو تو میرا ہاتھ پکڑو۔"

اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ بولی۔ "تم گھبرا رہے ہو اس لئے کہ بزرگوں کا اعتماد تم پر سے اٹھ گیا ہے اور میں بھرپور اعتماد حاصل کر کے آئی ہوں۔"

وہ درست کہہ رہی تھی۔ اگر میں ہاتھ پکڑتا اور وہ چیخ مارتی تو بزرگ کبھی یقین نہ کرتے کہ اس نے ہاتھ پیش کیا تھا۔ مجھے پھر ایک بار شیطان تسلیم کیا جاتا۔ وہ بولی۔ "کیا دیکھ رہے ہو۔ یہ وہی گورے گورے چکنے ہاتھ ہیں۔ یہی گورا بدن تمہارے سامنے بارش میں بھیگتا رہا تھا اور تم مسرتوں کی برسات میں بھیگتے رہے تھے۔ کیسی کم نصیبی ہے کہ صرف خیالی مسرتیں ملتی ہیں۔ وہ خواب خواب مسرتیں تعبیر بن کر تمہاری تنہائی میں آتی ہیں اور تم اس جیتی جاگتی تعبیر کو پکڑ نہیں سکتے۔ اور جب نہیں پکڑ سکتے تو دیوانے ہو جاتے ہو' چیختے چلاتے ہو اور دیواروں سے ٹکریں مارتے ہو۔ آج آخری بار یہ بدن تمہارے پاس آیا ہے۔ آج کے بعد تمہاری زندگی میں بہت سی شاہدائیں آئیں گی لیکن بدن کا یہ تاج محل تمہیں کبھی نصیب نہیں ہوگا جسے تم نے میرے گھر کا نمک کھا کھا کر دن رات دیکھا ہے۔ میری ماں کی گود میں سر رکھ کر مجھے ڈھونڈا ہے۔ میں تب بھی نہیں ملی' اب بھی نہیں مل رہی ہوں۔ میں جا رہی ہوں۔ آج کے بعد میرے دل سے جتنی بددعائیں نکلیں گی وہ سب تمہارے لئے ہوں گی۔"

یہ کہتے ہوئے وہ پلٹ گئی۔ تیزی سے چلتی ہوئی دروازے کے پاس گئی پھر اسے ایک جھٹکے سے کھول کر باہر نکل گئی۔ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میرے جی میں آیا زور زور سے چیخ پڑوں۔ اسے چیخ چیخ کر گالیاں دوں' دوڑ کر جاؤں اور واپس کھینچتے ہوئے کمرے میں لا کر اس کا لباس تار تار کردوں۔ اس کی پارسائی کی دھجیاں اڑا دوں۔ میرے اندر ایسا کر گزرنے کی تحریک پیدا ہو رہی تھی۔ میں زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ جیسے درندہ اپنے شکار تک نہ پہنچنے کے باعث بے چین ہو جاتا ہے۔ ویسے ہی میں بستر پر ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل رینگ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے ایک مسکن دوا دی تھی اور تاکید کی تھی کہ جب ذہنی انتشار

بڑھے اور یہ محسوس کرو کہ دماغی طور پر بے قابو ہونے والے ہو تو وہ دوا کھا لینا۔ میں نے سرہانے کی میز سے وہ دوا اٹھائی۔ گلاس میں پانی لیا پھر دو گولیاں نگل لیں۔

فوراً ہی سکون نہیں ملا مگر اعتماد پیدا ہوا کہ نارمل رہوں گا۔ وہ مجھے پاگل بنانا چاہتی ہے لیکن میں اس کے اشتعال دلانے سے مشتعل ہونے کی غلطی نہیں کروں گا۔ تھوڑی دیر بعد میں سیدھا لیٹ گیا۔ پھر مجھے نیند آ گئی۔

چونکہ میرے اندر ہیجان دبا ہوا تھا۔ غبار نکلا نہیں تھا۔ اس لئے گہری نیند نہیں آئی۔ میں نیم خوابیدہ سا تھا۔ کزن کو دیکھ رہا تھا۔ پتا نہیں وہ سپنا تھا' میری سوچ تھی یا میرے بھوکے ارادے تھے جو بند آنکھوں کے پیچھے پورے ہو رہے تھے۔ سبز باغ اسے کہتے ہیں جو تصور میں دکھایا جاتا ہے۔ حقیقتاً اس کا وجود نہیں ہوتا۔ وہ اپنے بدن کا سبز باغ دکھا گئی تھی۔ میں اسے چھونا چاہتا تھا' وہ ٹرانسپرنٹ ہو جاتی تھی یعنی شیشے کی طرح آر پار دکھائی دیتا تھا۔ وہ ہوا تھی' مٹھی میں نہیں آتی تھی۔ وہ خوشبو تھی مگر سونگھنے سے پہلے ہی اڑ جاتی تھی۔ وہ سب رنگ تتلی تھی' اپنے پیچھے دوڑاتی تھی۔ اسی دوڑ بھاگ کے دوران کانٹا چبھا تو میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

میری امی مجھے جھنجوڑ کر پوچھ رہی تھی۔ "کیا ہوا بیٹا؟ آنکھیں کھولو۔"

امی اور اسپتال کو دیکھ کر اطمینان ہوا کانٹا پاؤں میں نہیں چبھا تھا۔ ہاں چبھا نہیں چبھی ہوئی تھی۔

امی نے پوچھا۔ "تم ٹھیک ہو نا؟ ڈاکٹر کو بلاؤں؟"

"نہیں' میں ٹھیک ہوں۔ ابا وغیرہ کہاں ہیں؟"

"وہ چلے گئے۔ تمہارے باپ کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے۔ وہ ایسی حالت میں تجھے چھوڑ کر بھتیجی کے ساتھ گئے ہیں۔ مجھے حکم دیا ہے کہ ہسپتال سے چھٹی کرا کے تمہیں حویلی لے جاؤں۔"

"امی! میں یہ شہر چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ تعلیم ادھوری نہیں چھوڑوں گا۔"

"چولہے میں گئی تمہاری تعلیم۔ ابھی نیند میں کزن' کزن پکار رہے تھے۔ یہی ہے تمہاری تعلیم؟"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "میں کس کزن کو پکار رہا تھا۔"

"کسی کزن کو نہیں' اسی کو پکار رہا تھا۔ میں اتنی بھی جاہل نہیں ہوں کہ کچھ سمجھ ہی نہ سکوں۔ میں ابھی ڈاکٹر صاحب کے پاس جا رہی ہوں۔ ہم آج ہی شام کی کوچ سے پنڈ چلیں گے۔"

"میں نے کہہ دیا' میں نہیں جاؤں گا۔"

"نہیں جائے گا تو کہاں رہے گا؟ چاچا کے گھر میں تیرا داخلہ بند ہو چکا ہے۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں چاچا کے گھر پر۔"

"شاباش بیٹا! میں اپنی بھانجی سے تیری شادی کراؤں گی۔"

"میں پنڈ نہیں جانا چاہتا اور آپ شادی کی بات کر رہی ہیں"

"میرے ساتھ نہیں جائے گا تو یہاں ٹھکانا کہاں ہے؟"

"ہاسٹل میں رہوں گا۔"

"ہوٹل میں کتنے دن رہے گا؟"

"امی! ہوٹل نہیں ہاسٹل۔"

"یہ ہاسٹل کیا ہوتا ہے؟"

"طلباء کی رہائش گاہ ہوتی ہے۔ دوسرے علاقوں سے پڑھنے کے لئے آنے والے لڑکے وہاں رہتے ہیں۔ میں وہاں بڑے آرام سے رہوں گا۔ آپ صرف ابا کو راضی کر لیں۔"

امی نے اپنے طور پر بڑی کوششیں کیں کہ میں کسی طرح پنڈ واپس جانے کے لئے راضی ہو جاؤں لیکن میں نے یہاں رہنے کی ضد پوری کر لی۔ ابا نے کہہ دیا۔ "میری طرف سے تم جہنم میں رہو۔ اچھی تعلیم حاصل کر کے آؤ گے تو حویلی میں گھسنے دوں گا۔ چاچا' چاچی اور شاہدہ کے دل کسی طرح جیت کر آؤ گے تو سر آنکھوں پر بٹھاؤں گا۔ آئندہ رقم کی ضرورت ہو تو اپنی ماں کو خط لکھنا۔ میں تمہارے خط کا بھی جواب نہیں دوں گا۔"

امی چاچا کے ہاں سے میری کتابیں اور سامان لے آئیں۔ میں نے فی الحال ایک سستے ہوٹل میں کمرا لیا اور ہوسٹل میں رہائش کے لئے پرنسپل کو درخواست لکھ کر دی۔ اسلم کو پتا چلا تو اس نے کہا "سفارش کے بغیر ہاسٹل کا کمرا نہیں ملے گا۔ قاسم کا باپ ایم این اے ہے۔ تمہاری درخواست پر اس کے باپ کے دستخط ہوں گے تو ہاسٹل کے دروازے تمہارے لئے کھل جائیں گے۔"

میں پھر ایک بار قاسم کی کوٹھی میں آیا۔ اپنا مدعا بیان کیا تو اس نے کہا۔ "یار! کیا غیروں جیسی باتیں کرتے ہو۔ یہ شاہی قلعے جیسی پھیلی ہوئی کوٹھی کس لئے ہے۔ جو کمرا چاہو' پسند کر لو۔ جتنے برس چاہو' رہ لو۔ کوئی تمہیں یہاں سے جانے کو نہیں کہے گا۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو تمہاری محبت ہے لیکن میرے والد اس معاملے میں بڑے سخت ہیں۔ وہ دو چار دوستوں کی ٹولی بنا کر رہنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ میرے لئے ہاسٹل میں بندوبست کرا دو۔"

"بندوبست ہو جائے گا لیکن چند ہفتے یا چند مہینے لگ سکتے ہیں۔ بائی دی وے' چاچا کا گھر کیوں چھوڑ رہے ہو؟"

"کچھ خاندانی جھگڑے پیدا ہو گئے تھے اس لئے وہ گھر چھوڑ دیا۔ آج کل ہوٹل میں ہوں۔"

"ہوٹل؟" ان چاروں دوستوں نے چونک کر دیکھا۔ پھر قاسم اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "لعنت ہے ہم پر۔ تم ہوٹل میں رہتے ہو اور ہمیں آج معلوم ہو رہا ہے۔ چلو اٹھو ہمارے

ساتھ ہوٹل چلو اور ابھی اپنا سامان یہاں لاؤ۔"

میں نے کچھ کہنا چاہا۔ محمود نے کہا "خبردار! انکار نہ کرنا۔ ہم نے تمہاری بات مان لی کہ تمہیں ہاسٹل میں رہنا چاہئے۔ تم بھی مان لو کہ جب تک ادھر بندوبست نہ ہو' یہاں ہمارے ساتھ رہو گے۔"

ریاض نے کہا "ایک بات یاد رکھو۔ قاسم کی بات مانو گے تو ہاسٹل والا کام جلدی ہو جائے گا۔"

میں انہیں ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنا کام نکالنے کے لئے ان کے ساتھ عارضی رہائش کے لئے آمادہ ہو گیا۔ ان کے ساتھ ہوٹل جا کر اپنا سامان لے آیا۔ انہوں نے میرے لئے ایک کمرا مخصوص کر دیا لیکن وہاں پڑھنے کے لئے ایک کتاب بھی نہ کھول سکا۔ ایک تو وہاں چاروں دوستوں کی چنڈال چوکڑی تھی۔ ریڈیو' کیسٹ ریکارڈر' ٹی وی اور وی سی آر جیسی دلچسپیوں کے سامان تھے۔ وہ کسی بھارتی فلم کا جذباتی ناچ گانا دکھانے کے لئے مجھے کمرے سے بلاتے تو میں دیکھتے دیکھتے وہیں بیٹھا رہ جاتا تھا۔ اسکرین پر نظر آنے والے مناظر میں ڈوب کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتا تھا۔

ابتدا میں احساس نہیں ہوا کہ پھر میرے اندر آتشی لاوا پک رہا ہے۔ ایک شام ریاض نے کہا "یار! تم راتوں کو بہت شور مچاتے ہو۔ یہ کزن کون ہے؟"

میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ محمود نے پوچھا۔ "کیا یہ وہی تو نہیں جس کا نام ہم نہیں جانتے تھے اور نادانستگی میں اسے شاہدہ کہا تھا؟"

اس کا نام سن کر دل پر گھونسا سا لگا۔ میں نے پوچھا "کیا میں نیند میں کسی کا نام لیتا ہوں؟"

"نام تو نہیں لیتے ہو۔ البتہ کزن کہتے ہو۔"

اسلم نے کہا۔ "اور ایسی ایسی باتیں کرتے ہو جنہیں سن کر ہم بالغ ہو جاتے ہیں۔"

یہ قہقہے لگانے لگے۔ میں جھینپ رہا تھا۔ قاسم نے میرے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "یار! شرماتے کیوں ہو۔ شرماتی تو لڑکیاں ہیں۔ بھئی محمود! ہمارے پاس وہ ویڈیو کیسٹ ہیں نا جس میں ایک جوان بڑا شرمیلا ہوتا ہے۔ اس کی زندگی میں ایک حسینہ آتی ہے۔ اس کہانی میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ جب تک کسی حسینہ کے متعلق سوچتے رہو' شرم اور جھجک سی رہتی ہے۔ حسینہ مل جائے تو رفتہ رفتہ جھجک دور ہو جاتی ہے۔"

محمود نے کہا "وہ کیسٹ ویڈیو کی دکان سے لایا گیا تھا۔ دس روپے کرایہ دو پھر ادھر جاؤں گا تو روٹی شوٹی لے آؤں گا۔"

قاسم نے کہا "چرغہ کھانے کو جی چاہتا ہے مگر میرے ڈیڈی نے ابھی تک خرچ کے روپے نہیں بھیجے ہیں۔"

میں نے پانچ سو کا نوٹ نکال کر دیا۔ ریاض نے کہا "تم سے لینا اچھا نہیں لگتا۔"

"کیوں اچھا نہیں لگتا؟"

"اس لئے کہ مہمان ہو۔ ہمارے بے تکلف دوست نہیں بنتے ہو۔"

محمود نے پانچ سو کا نوٹ میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ "پکی دوستی کرو گے تو ہم یہ روپے لیں گے۔"

"بھئی میں دوست ہوں اور پکی دوستی کیسی ہوتی ہے؟"

"ہم ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں چھپاتے ہیں۔ سب اپنی اپنی معشوق کی باتیں کرتے ہیں لیکن تم کزن والی بات چھپتے ہو۔"

قاسم نے کہا۔ "او بھئی! اپنا یار کھلتے کھلتے کھلے گا۔ تم جاؤ کیسٹ اور چرغے لے آؤ۔"

جب اپنے اندر رنگین اور سنگین جذبات کروٹیں لیتے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ ہم کسی کو راز دار بنا کر اس سلسلے میں خوب بولیں۔ یوں اندر سے تھوڑا دھواں نکل جاتا ہے۔ ان چاروں نے ایک ایک محبوبہ پال رکھی تھی اور بڑے چٹخارے لے کر ایک دوسرے کے سامنے اپنی اپنی محبت کا جغرافیہ پیش کرتے رہتے تھے۔ ایک وقت تھا جب میں ایسی باتوں سے توبہ توبہ کرتا تھا۔ اب ان کے درمیان بیٹھ کر شوق سے سنتا تھا۔ انہوں نے مجھے بھی اپنے دل کی باتیں سنانے پر مجبور کیا تو میں نے وہ تمام حالات بتا دیئے جن سے گزرتے ہوئے اسپتال پہنچ گیا تھا۔ ہم عزت دار لوگ ہیں اپنے ڈیڈی کی سیاسی پوزیشن کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ورنہ کزن کو اغوا کر کے تمہارے پاس یہاں لے آتے۔ یار! حد ہو گئی' اس نے تمہیں پاگل بنا دیا۔"

اسلم نے کہا "لڑکیاں تو پاگل بناتی ہی ہیں۔"

"ابے پاگل نہیں دیوانہ بناتی ہیں۔ دیوانہ بنانے اور پاگل بنانے میں فرق ہے۔"

ریاض نے کہا۔ "بھئی یہ کیا فلسفہ لے بیٹھے ہو۔ اپنے یار کے لئے کچھ کرو۔"

محمود نے میری پشت پر ہاتھ مار کر کہا۔ "یہ اپنا سلمان کچھ منہ سے کھلتا نہیں ہے۔ اس کے لئے روبی کیسی رہے گی؟"

میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ پوچھنا چاہتا تھا۔ یہ روبی کون ہے؟ قاسم نے کہا "او نہیں یار! تم نے سلمان کی اسٹوری توجہ سے نہیں سنی۔ اس کی کزن صحت مند ہے۔ شہر میں رہتی ہے لیکن پنڈ کی کڑی لگتی ہے۔ روبی تو اس کے سامنے مچھر ہے۔ دوست کی مدد کرنا ہو تو تگڑی مدد کرو۔"

"پروین ٹھیک رہے گی۔"

"وہ موٹی ہے۔ ایک تو یہ سمجھ نہیں آتی کہ تم لوگ موٹاپے کو صحت مندی کیوں سمجھتے ہو۔ وہ بھئی وہاں سے میرا البم اٹھاؤ۔ اس میں نیلم کی تصویر ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "قاسم بھائی! یہ روبی' پروین اور نیلم کون ہیں؟"

"یہ کرائے کی ویڈیو کیسٹیں ہیں زندہ کیسٹس۔"

میں نے انکار میں ہاتھ ہلا کر کہا۔ "نہیں قاسم بھائی! میں نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں۔"

"پھر کیا سوچا ہے؟"

"مجھ سے کبھی گناہ نہیں ہوگا۔"

"تو پھر تم نے کزن سے کس بات کا جھگڑا کیا تھا؟"

"اس کی بات نہ کرو۔ اس کا معاملہ کچھ اور ہے۔ پتا نہیں کیوں وہ مجھے اپنی گھر والی لگتی رہی۔ لیکن وہ میرے لئے چیلنج بن گئی تھی۔"

"تم بھی عجیب ہو۔ یہ جو ویڈیو پر حسین عورتوں کو دیکھتے ہو تو یہ اچھی لگتی ہیں؟ کیا یہ گناہ نہیں ہے؟"

"ہاں۔ صرف آنکھوں کا گناہ ہے۔ دیکھتا ہوں پھر دیکھ کر بات ختم ہو جاتی ہے۔"

"بات کہاں ختم ہوتی ہے بھئی' وہ تو دماغ میں پکتی رہتی ہے خوابوں میں بھڑکتی رہتی ہے۔ اس لئے تم نیند میں اسے پکارتے ہو۔ اگر پھر شدت بڑھے گی تو پھر ذہنی توازن کھو بیٹھو گے۔ اس کا علاج یہی ہے جو ہم بتا رہے ہیں۔"

میں نے ایسے علاج سے انکار کر دیا۔ یہ درست ہے کہ میں فلموں میں پرائی عورتوں کو دیکھتا تھا لیکن کالج میں لڑکیوں سے بات کرتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ انہیں نظر بھر کر نہیں دیکھتا تھا۔ شاید اس لئے کہ دیکھنے کے لئے شاہدہ بہت تھی۔ اب وہ نہیں رہی تھی لیکن اپنا آسیب چھوڑ گئی تھی۔ ایک رات چنڈال چوکڑی نے ایک بہت ہی رومانی اور جذباتی فلم دکھائی۔ جب وہ ختم ہوئی تو میرے دماغ میں ہلکی سی دھند چھا گئی تھی۔ میں کچھ ہوش میں تھا اور کچھ مدہوش سا تھا آس پاس بیٹھے ہوئے ساتھیوں کی موجودگی کا علم تھا لیکن وہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ قاسم نے پوچھا "فلم کیسی لگی؟"

میں نے سحر زدہ ہو کر کہا "ایک بار دیکھا ہے۔ دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔"

اس کیسٹ کو ریوائنڈ کر کے دوسری بار چلایا گیا ہے۔ قاسم نے میرے ہاتھ میں ریموٹ کنٹرولر دے کر کہا "تمہیں جو سین پسند نہ آئے اسے آگے بڑھا دو' جو پسند آئے اسے بار بار ریوائنڈ کر کے دیکھو۔"

ان لمحات میں ایک حسرت تھی۔ کاش کوئی ایسا ریموٹ کنٹرولر ہوتا جس کے ذریعے میں شاہدہ کو بار بار ریوائنڈ کر کے دیکھ سکتا۔ میں نے بعض مناظر کو کئی بار اس لئے دیکھا کہ ہیروئن کی جگہ شاہدہ نظر نہیں آ رہی تھی جبکہ ہر لڑکی میں اس کا روپ دکھائی دیا کرتا تھا۔ اب میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا۔ ریوائنڈ کرتا تھا شاید اب کی بار دکھائی دے۔ لیکن وہ ایسی گم ہو گئی تھی جیسے میری آنکھوں کو اپنے دیدار سے اندھا کر دیا ہو اور اس اندھے پن کو مقدر بنا دیا ہو کہ میں آئندہ کبھی اسے دیکھ نہیں سکوں گا۔

دیکھتے دیکھتے ریوائنڈ کرتے کرتے میں یکبارگی پھٹ پڑا۔ چیخ کر بولا' کہاں مر گئی ذلیل کمینی! دکھائی کیوں نہیں دیتی؟"

وہ چاروں ایکدم سے اچھل پڑے۔ رات کے دو بج گئے تھے۔ ان میں سے کوئی سو رہا تھا۔ کوئی اونگھ رہا تھا' وہ ایسی فلمیں دیکھتے ہی رہتے تھے اس لئے نصف بیدار تھے نصف خوابیدہ تھے۔ میرے چیخنے پر وہ گھبرا کر میری طرف لپکے "کیا ہوا؟ کس سے بول رہے ہو؟"

"وہ ...... وہ ......" میں نے ٹی وی اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ چاروں میرے آس پاس تھے۔ ایک نے میرے سر پر آئس بیگ رکھا تھا۔ دماغ کو ٹھنڈک پہنچ رہی تھی۔ وہ مجھے میرے بستر پر لے آئے تھے۔ میں نے کہا۔ "یہ ساتھ والی دراز میں سکون کی دوائیں ہیں۔"

انہوں نے مجھے دوائیں کھلائیں۔ میں تھوڑی دیر بعد سو گیا لیکن ان کی نیند اڑ گئیں۔ میں سوتا رہا۔ وہ جاگتے رہے اور مجھے مصیبت سمجھ کر آپس میں مشورے کرتے رہے۔ میں ابتداء میں ان سے دور بھاگتا تھا اب انہیں دوست اور ہمدرد سمجھنے لگا تھا۔ یہ مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ مجھے کس طرح مزید پاگل بنا دینے کی پلاننگ کر رہے تھے۔

وہ چاروں دولت مند گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مجھے نقصان پہنچا کر کوئی بہت بڑا فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ چونکہ بگڑے ہوئے رئیس زادے تھے۔ اس لئے قرضوں میں جکڑے رہتے تھے۔ان دنوں انہیں بیس ہزار روپے کی سخت ضرورت تھی۔ یہ رقم وہ جوئے میں ہار گئے تھے اور ادائیگی کے لئے ایک ہفتے کی مہلت حاصل کی تھی۔ مہلت بھی اس لئے انہیں مل گئی تھی کہ قاسم نے اپنی دو لاکھ کی کار گروی رکھی تھی۔ اگر وہ سات دنوں کے اندر بیس ہزار روپے ادا نہ کرتے تو وہ دو لاکھ کی کار چلی جاتی۔

انہیں امید تھی کہ وہ چاروں اپنے اپنے والدین سے پانچ پانچ ہزار لا کر بیس ہزار کا قرض ادا کر دیں گے لیکن قاسم کا باپ بیرون ملک کے دورے پر چلا گیا تھا۔ محمود کے باپ نے ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا تھا کہ وہ آوارہ ہو گیا ہے ماہانہ دس ہزار روپے خرچ کرنے لگا ہے اور مزید پانچ ہزار لینے آیا ہے۔ اس طرح باقی دو دوست بھی ناکام رہے تھے وہ تھوڑی رقم ضرور لائے تھے لیکن دوسرے قرض خواہوں نے رقم چھین لی تھی۔ اس رات میں مسکن دوائیں کھا کر سو گیا تو ایک نے کہا "یہ کروڑ پتی باپ کا بیٹا ہے۔ اس کے پاس تھوڑی بہت رقم ضرور ہو گی۔"

انہوں نے میری جیب سے چابی نکال کر اٹیچی کھولی۔ اس کی تلاشی لی۔ کپڑوں کے نیچے سے ستائیس ہزار روپے نکلے۔ ان کی تو عید ہو گئی۔ ابا نے مجھے دس ہزار دیے تھے لیکن امی نے ان سے چھپا کر بیس ہزار روپے اٹیچی میں رکھ دیئے تھے۔ کل تیس ہزار میں سے میں نے تین ہزار خرچ کئے تھے باقی ان چاروں کے ہاتھ لگ گئے۔

انہوں نے اٹیچی کو پہلے کی طرح لاک کیا۔ چابی میری جیب میں رکھی۔ پھر وہ دوسرے کمرے میں آ گئے۔ قاسم نے کہا۔ "میں کل صبح ہی بیس ہزار ادا کر کے اپنی کار لے آؤں گا۔"

اسلم نے پوچھا "کل وہ اپنی اٹیچی کھولے گا تو کیا ہو گا؟"

قاسم نے کہا۔ "ہم سب اپنے اپنے کمرے سے ایک ایک قیمتی چیز غائب کر دیں اور سلمان کے کمرے سے اس کی اٹیچی کو غائب کیا جائے۔ اس طرح یہ تاثر دیا جائے کہ کوٹھی

میں ڈاکو آئے تھے۔"

ایک نے چٹکی بجا کر کہا۔ "فنٹاسٹک آئیڈیا ہے۔"

"یہ آئیڈیا کامیاب ہو جائے تو اس پاگل کو بھی کسی بہانے سے یہاں سے ٹرخا دینا چاہئے۔"

"یہ تو ہاسٹل میں جگہ ملنے سے پہلے نہیں جائے گا۔"

"اس کا باپ بھی جائے گا۔ ہم اس کے ساتھ کچھ ایسی الٹی سیدھی حرکتیں کریں گے کہ یہ بھاگنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

دوسری صبح میری آنکھ پہلے کھلی۔ میں قدرے سکون محسوس کر رہا تھا۔ سوچا غسل کر کے لباس تبدیل کروں تب معلوم ہوا کہ اٹیچی غائب ہے۔ میں نے قاسم کے کمرے میں آ کر اسے جگایا اور اپنی اٹیچی کے متعلق پوچھا۔ اتنے میں محمود نے آ کر کہا "یار قاسم! میری الماری کھلی ہوئی ہے۔ میری سونے کی انگوٹھی، ٹائی پن اور چھ ہزار روپے غائب ہیں۔"

قاسم نے پوچھا "تم نے الماری کو لاک نہیں کیا تھا؟"

وہ بولا تم تو جانتے ہو۔ رات دو بجے تک سلمان کا ذہنی توازن بگڑا رہا۔ ہم اسے سنبھالتے رہے۔ جب یہ سو گیا تو ہم نے خوب پی لی۔ مدہوشی میں الماری لاک کرنا کیسے یاد رہتا ہے۔

"بھئی یہ سلمان کہہ رہا ہے اس کی اٹیچی غائب ہے۔"

"اس کا مطلب ہے رات چور آئے تھے۔ تم اپنے کمرے کی تلاشی لو۔"

کمرے کی چیزیں دیکھنے پر معلوم ہوا وی سی آر چوری ہو گیا ہے۔ ریاض اور اسلم نے بتایا کہ نقد رقم، سونے کی چین اور گھڑی وغیرہ چوری ہو گئی ہیں۔ مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ میرے ساتھ وہ چاروں بھی لٹ گئے ہیں۔ میں نے کہا "پولیس کو انفارم کرنا چاہئے۔"

قاسم نے کہا "ہم سے پوچھا جائے گا کہ چور آئے تھے تو ہم پانچوں گہری نیند کیسے سو رہے تھے۔ کسی ایک کو تو آہٹ سن کر جاگنا چاہئے تھا۔ کیا ہم کہہ سکیں گے کہ ہم نے بہت زیادہ نشہ کیا تھا؟ یا سب کے سب خواب آور گولیاں کھا کر سو گئے تھے۔ پھر چوری کی رپورٹ سے ملتا کیا ہے؟ مال تو کبھی نہیں ملتا۔ کچھ بچا کھچا مل بھی جائے تو اس سے زیادہ تھانے پولیس کے چکر میں رقمیں خرچ ہوتی رہتی ہے۔ بات عدالت تک پہنچے تو پیشیاں بھگتنی پڑتی ہیں۔"

ان سب نے مل کر مجھے قائل کر دیا کہ پولیس کے چکر میں نہیں پڑنا چاہئے۔ قاسم نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ "میرے دوست! ہمیں اپنی چوری کا غم نہیں ہے۔ شرمندگی یہ ہے کہ تم مہمان بن کر آئے اور لٹ گئے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں کسی طرح بھی خون پسینہ ایک کر کے تمہارے ستائیس ہزار ادا کروں گا۔"

میں نے کہا "قاسم بھائی! ایسی باتیں نہ کرو۔ میں تم سے ایک پیسہ نہیں لوں گا۔ یہ

واردات ہم سب کے ساتھ ہوئی ہے۔ مجھے رقم کے جانے کا اتنا افسوس نہیں ہے۔ آج خط لکھوں گا یا پنڈ جاؤں گا تو رقم لے آؤں گا۔ مجھے تو یہ شرمندگی ہے کہ پچھلی رات میرے پاگل پن کے باعث تم لوگوں کو پریشانی ہوئی ہو"

"پریشانی اس لئے نہیں ہوئی کہ تم بوجھ ہو۔ ہاں تمہارے پاگل پن سے ہم پریشان ہوئے اور تشویش میں مبتلا ہو کر سوچنے لگے کہ اتنے پیارے دوست کو یہ کیا روگ لگ گیا ہے۔ یہ غم غلط کرنے کے لئے ہم نے زیادہ پی لی تھی۔"

محمود نے کہا "ہم تمہارا علاج کر کے رہیں گے۔ اگر تمہیں ہماری دوستی پر بھروسا نہیں ہے تو انکار کر دو۔ ورنہ ہم جیسا کہتے جائیں تم عمل کرتے جاؤ۔ پھر دیکھو گے کہ ہمیشہ نارمل رہا کرو گے۔"

قاسم اپنی کار واپس لے آیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کار گروی میں پھنسی ہوئی تھی۔ محمود نے قاسم کے کمرے سے وی سی آر لے جا کر دکاندار کو دیا تھا اور مزید دو ہزار دے کر نئے ماڈل کا دوسرا وی سی آر لے آیا تھا۔ مجھے تاثر دیا گیا کہ صرف تین ہزار ادا کر کے وہ قسطوں پر لایا گیا ہے۔

میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا تھا کہ اب وی سی آر پر فلمیں نہیں دیکھوں گا۔ دماغ قابو میں نہیں رہتا ہے۔ مجھے یہ بات یاد آتی تھی کہ میرے دادا کو بھی کسی عورت نے دیوانہ بنا کر پاگل خانے پہنچا دیا تھا۔ ایک ناقابلِ حصول حسینہ میری رگوں میں لہو کی طرح رواں دواں تھی اور میں اپنی رگیں کاٹ کر نہیں پھینک سکتا تھا۔

وی سی آر پر فلمیں نہ دیکھنے کے فیصلے پر قائم نہ رہ سکا۔ انہوں نے میرا علاج کرنے کے بہانے ایک چال چلی۔ شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ میں قاسم کے کمرے میں بیٹھا کہہ رہا تھا۔ "کل میں پنڈ جاؤں گا اور ای سے کچھ رقم لے آؤں گا۔"

اسی وقت باہر پورچ میں کار رکنے کی آواز آئی۔ قاسم نے مسکرا کر کہا "محمود آیا ہے اور تمہاری شاہدہ کو لایا ہے۔"

ایک دم سے میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "شاہدہ؟ یعنی میری کزن؟"

اسی وقت کمرے کے باہر چھم چھم کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ قاسم نے کہا "وہ تمہاری کزن ہے یا نہیں یہ میں نہیں جانتا۔ ہاں، محمود نے بتایا تھا کہ کسی شاہدہ کو لانے والا ہے۔"

دروازہ کھلا چھم چھم کی آواز واضح ہو گئی۔ میں نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ کھڑی ہوئی تھی۔ چہرے پر دو پٹے کا نصف گھونگٹ تھا اس لئے صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں کی اُجلی رنگت بتا رہی تھی کہ وہ بہت حسین ہے۔ تنگ پاجامے اور ململ کے کرتے میں اس کی صحت مندی دیکھ کر دل گواہی دے رہا تھا وہ شاہدہ ہے۔

محمود اس کا ہاتھ تھام کر کمرے کے دوسرے دروازے سے کاریڈور میں گیا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی لیکن دور تک اور دیر تک پازیب کی چھم چھم پکارتی رہی۔ پھر محمود نے واپس آ کر مجھ سے کہا۔ "میں نے اسے تمہارے کمرے میں پہنچا دیا ہے۔"

"میرے کمرے میں؟ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا "لیکن وہ ...."

قاسم نے میرے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اپنے کمرے میں نہ جانا چاہو تو میرے بستر پر سو جانا۔ بھئی ریاض! فلم چلاؤ۔"

ریاض وی سی آر کے پاس گیا۔ محمود نے کہا "سلمان! تم نے بتایا تھا کہ جس رات بارش میں تمہاری کزن بھیگ رہی تھی، اس وقت اس نے ململ کا کرتا اور تنگ پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ آج بھی شاہدہ وہی لباس پہن کر آئی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "مگر یہ تو بتاؤ یہ شاہدہ کون ہے؟"

قاسم نے کہا۔ "یار! خود جا کر دیکھ لو۔ فلم شروع ہو گئی ہے۔ ہمیں دیکھنے دو۔"

میں اضطراب میں مبتلا ہو گیا۔ میں نہیں جانا چاہتا تھا مگر جا کر دیکھنا بھی چاہتا تھا۔ جانا پہچانا سا بدن کہہ رہا تھا "میں وہی ہوں۔ ہاں، میں وہی ہوں ...."

سامنے اسکرین پر رنگین اور سنگین نظارے تھے اور نظروں میں ململ سے جھلکتا بدن تھا۔ آنکھیں ادھر تھیں، دھیان ادھر تھا۔ پھر میں نے محسوس کیا۔ وہاں بیٹھا رہا تو پھٹ پڑوں گا۔ میں ایک دم سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سب نے مجھے نظر انداز کیا۔ کسی نے نہیں پوچھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میرے اندر دھواں سا بھر رہا تھا۔ میں آگے بڑھتے ہوئے لڑکھڑایا۔ ریاض نے گرنے سے پہلے مجھے سنبھال لیا۔ قاسم نے کہا۔ "اسے کمرے میں پہنچا کر آ جاؤ۔"

سوچا جائے تو نشہ کسی چیز میں نہیں ہوتا۔ احساس میں ہوتا ہے۔ احساس کرنے والا ایک گھونٹ پی کر بہک جاتا ہے اور بے حس پینے والا پوری بوتل حلق سے اتار کر اپنے پیروں پر کھڑا رہتا ہے۔ نشہ اس کا کچھ نہیں بگاڑتا۔ میں وہی تھا جو ایک گھر میں رہ کر کزن کے وجود کا احساس نہیں کرتا تھا۔ جب اس نے احساس دلایا تو پھر یہی احساس بے لگام نشہ بن گیا۔ میں ریاض کے سہارے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آیا۔ وہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ریاض مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔

اسے دیکھ کر میں دروازے سے لگ گیا۔ پھر فاتحانہ انداز میں بولا "تم میرے کمرے میں آنے سے انکار کرتی تھیں۔ مگر آج تمہیں آنا پڑا۔ اب حجاب کیسا؟ آنچل سرکاؤ۔ اپنی صورت دکھاؤ۔"

وہ ذرا کسمائی۔ بستر پر بیٹھے بیٹھے ذرا سرک کر دور ہو گئی۔ میں دروازے کے پاس سے آگے بڑھا۔ لڑکھڑاتا ہوا پلنگ کے پاس آیا۔ پھر گرتے گرتے سنبھل کر بستر کے سرے پر

اوندھے منہ گر پڑا۔ اس کا ایک پاؤں ذرا قریب تھا۔ بلب کی روشنی میں چاندی کی پازیب چمک رہی تھی۔ میں نے پازیب پر ہاتھ رکھا۔ اس وقت تاریکی چھا گئی۔ بجلی چلی گئی تھی۔

مجھے یوں لگا' اسے اندھیرے کی چادر میں چھپا کر مجھ سے چھین کر لے جایا جا رہا ہے۔

میرے ہاتھ سے اس کی پازیب نکل گئی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر بستر پر ٹٹولا۔ پازیب تھی نہ پاؤں تھا۔ پاؤں والی بھی نہیں تھی۔ میں نے چیخ کر آواز دی۔ "کزن! تم کہاں ہو۔ میرے پاس آؤ۔ آؤ' اب نہ جاؤ۔ میں تمہارے پیچھے بھاگتے بھاگتے تھک گیا ہوں۔ تمہارے پاس پہنچتے پہنچتے گر پڑا ہوں۔ مجھے سنبھال لو۔ کزن .... کزن ...."

میں چیخ رہا تھا۔ اسے پورے بستر پر ٹٹول رہا تھا۔ وہ نہیں مل رہی تھی۔ نامرادی مجھے اندر سے جھنجوڑ رہی تھی۔ مجھے وہ رات یاد آئی جب اس نے طمانچہ مارا تھا۔ میں تاریک بستر پر اسے تلاش کرتے کرتے نیچے فرش پر گر پڑا۔ مجھے یاد آیا کہ ایک رات میں اسے بازوؤں میں گرفتار کرنا چاہتا تھا مگر پلنگ کے پائے سے ٹکرا کر زخمی ہو گیا تھا۔ اس تاریک کمرے میں یہ منظر بھی دکھائی دیا کہ وہ دونوں ہاتھوں سے قرآن مجید تھامے اسے سینے سے لگائے میرے کمرے میں آئی ہے۔ میں ایک دم سے پھٹ پڑا۔ "شاہ ہے دا ...."

میں فرش پر سے اٹھ کر چکراتا ہوا ایک طرف گیا تو اندھیرے میں کزن سے ٹکراتے ہی ایک ہاتھ سے گرفت میں لیا۔ دوسرے ہاتھ کی مٹھی میں اس کی زلفیں آ گئیں۔ میں نے غصہ سے کچھ کہنے کے لئے زلفوں کو ایک جھٹکا دیا تو لانبی چوٹی اور پراندے سمیت وگ ہاتھ میں آ گئی۔ دھوکا .... دھوکا .... دھوکا۔ میرے دماغ کی رگیں پھٹنے والی تھیں۔

وہ آئی نہیں تھی۔ آیا تھا۔ وہ گرفت سے نکلنے کے لئے زور لگا رہا تھا۔ میں نے گریبان پکڑ کر کھینچا۔ اس کے بدن کا سانس لیتا ہوا ایک مصنوعی حصہ الگ ہو کر میرے ہاتھ میں رہ گیا۔ وہ تڑپ کر میری گرفت سے نکل گیا۔ اسی وقت کمرا روشن ہو گیا۔ بجلی کا آنا جانا محض قاسم وغیرہ کا ایک منصوبہ تھا۔ روشنی ہوتے ہی آنکھیں ذرا چندھیا سی گئیں۔ دھندلی نظر سے میں نے اسلم کو دیکھا وہ ململ کے کرتے اور تنگ پاجامے میں تھا اور دروازہ کھول کر کمرے سے باہر بھاگ رہا تھا۔ قاسم' ریاض اور محمود کمرے میں آ گئے تھے اور مجھ پر قہقہے لگا رہے تھے۔ میں نے ڈوبتے ہوئے ذہن سے انہیں دیکھا اور دم توڑتی ہوئی ہوشمندی سے اتنا سمجھا کہ میں پاگلوں کی طرح چیخ رہا ہوں اور اپنی مرضی کے خلاف بے اختیار دیوار سے ٹکریں مار رہا ہوں۔ اس کے بعد میں اپنے تمام ضروری ارمانوں کے ساتھ مر گیا۔

اسے موت ہی کہنا چاہئے کہ مجھے اپنے وجود کا پتا نہیں تھا۔ میرے والدین کہتے ہیں میں وحشت و جنون میں چیختا چلاتا اور دوڑتا بھاگتا تھا۔ مجھے زنجیروں سے باندھ کر رکھا جاتا تھا۔ ایسی بھی زندگی ہوتی ہے کہ ہمیں اپنی خبر نہیں ہوتی۔ آنکھیں کھلی رہتی ہیں مگر ہم دنیا کو دیکھ کر سمجھ نہیں پاتے۔ اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کو پہچان نہیں پاتے۔ اپنی پیدا کرنے والی ماں کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ ممتا کے دودھ کا ایک چھینٹا بھی ہمیں ہوشمندی کی طرف نہیں لاتا۔

کیلنڈر کی تاریخیں بدل رہی تھیں۔ ایک ایک ماہ کے ورق الٹ رہے تھے۔ ڈاکٹر وغیرہ مجھے ہوشمندی کی طرف لانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ انہوں نے کہہ دیا تھا۔ "جب تک یہ ہوش و حواس میں نہیں آئے گا' اس کا نفسیاتی تجزیہ اور علاج نہیں ہو سکے گا۔"

چھ ماہ بعد ایک صبح میں نے آنکھ کھولی تو یوں لگا ابھی پیدا ہوا ہوں۔ یہ دنیا نئی نئی سی لگی۔ نرس اور ڈاکٹر آئے' وہ بھی نئے انسان لگ رہے تھے۔ بستر سے منسلک رہنے والی زنجیروں سے میرے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ اس پر مجھے حیرانی نہیں ہوئی۔ ابھی مجھے یاد نہیں آیا تھا کہ کبھی دماغی توازن کھو بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ "ہیلو' کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں۔ تھینک یو ڈاکٹر! بائی دی وے' مجھے کیا ہوا تھا؟"

"یہ خود ہی بڑی سہولت سے آہستہ آہستہ سوچو۔ تم کون ہو اور تمہیں کیا ہوا تھا؟ آج سے تمہیں ہمارے ساتھ تعاون کرنا ہے۔"

اس نے وارڈ بوائز کو بلا کر زنجیریں کھولنے کا حکم دیا پھر کہا۔ "تم چھ ماہ سے انڈر ٹریٹمنٹ ہو۔ پچھلے ایک ماہ سے خاموش اور سنجیدہ ہو۔ اگرچہ بولتے نہیں تھے' ہماری باتیں نہیں سمجھتے تھے تاہم دوسروں کے لئے خطرناک نہیں رہے تھے۔ ایک ماہ کی اسٹڈی کے بعد یہ زنجیریں کھولی جا رہی ہیں۔"

میرے ہاتھ کھل گئے۔ نرس نے سرہانے کی میز کی طرف اشارہ کیا پھر کہا۔ "یہ گلاس میں دودھ ہے اور یہ گلوکوز' اسے کیسے استعمال کرو گے؟"

میں نے سوچتی ہوئی نظروں سے دودھ اور گلوکوز کو دیکھا۔ فوراً یاد آ گیا۔ میں نے تین

چیچ گلوکوز دودھ میں حل کیا۔ پھر اسے پینے لگا۔ ڈاکٹر نے کہا "شاباش! یہ کلپ بورڈ، قلم اور کاغذ ہیں۔ اسے پکڑو۔"

میں نے وہ چیزیں لے لیں۔ ڈاکٹر نے اپنی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا "میں صرف پانچ منٹ دے رہا ہوں۔ ان پانچ منٹوں میں صرف اپنے متعلق لکھو۔ کوئی بات نہ سوچنا۔ لکھنے کے لئے کوئی پلاننگ نہ کرنا۔ جو بات دماغ میں آتی جائے اسے لکھتے چلے جاؤ۔ کم ان' اسٹارٹ رائٹنگ۔"

میں کلپ بورڈ پر جھک کر لکھنے لگا۔ ڈاکٹر نے پانچ منٹ کے بعد کہا۔ "اسٹاپ۔"

میں نے قلم روک لیا۔ اس نے وہ کاغذ لے کر نرس کو دیا پھر مجھ سے کہا۔ "تم جس ہستی کو زیادہ چاہتے ہو اس کے متعلق لکھو وقت وہی پانچ منٹ ہے۔ کم آن سٹارٹ۔

ڈاکٹر کی باتیں سنتے ہی میرے سامنے امی کا ممتا بھرا چہرا ابھرا تھا۔ میں بے اختیار ان کے متعلق لکھتا چلا گیا۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت تھی۔ میں ابھی پیدا ہوا تھا اور ایک نوزائیدہ بچہ اپنی ماں کو ہی سوچتا اور ماں کو ہی ڈھونڈتا ہے۔

پانچ منٹ کے بعد ڈاکٹر نے وہ صفحہ بھی لے لیا۔ اسی طرح اس نے پانچ منٹ کا وقت دے کر لکھوایا کہ مجھے کن چیزوں سے اور کن کرداروں سے محبت ہوتی ہے۔ مجھے کون سی باتیں ناگوار گزرتی ہیں اور شدید نفرت کے اسباب کیا ہوتے ہیں۔ ان امتحانات کے بعد میری امی اور ابا کو مجھ سے ملنے کی اجازت دی گئی۔ امی آتے ہی خوشی سے لپٹ کر رونے لگیں۔ ابا نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "بیٹے میں کبھی تم سے ناراض ہوا تھا۔ اسے بھول جاؤ۔ میں تم سے وہی پہلے جیسی محبت کرنے والا باپ ہوں۔ تم اپنے آپ کو سنبھالو۔ تمہارے اندر تھوڑا سا بھی غصہ' تھوڑی سی بھی نفرت ہے خواہ کسی کے لئے ہے تو اسے نکال کر پھینک دو۔ دنیا کی کوئی سی بھی خواہش کرو۔ میں اپنی بساط کے مطابق اسے پوری کروں گا۔"

اسی وقت چاچی اور چاچا آئے۔ چاچی نے میری بلائیں لیں۔ چاچا نے دعائیں دیں۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تھے تب انہیں دیکھتے ہی کزن یاد آ گئی تھی۔ میری نظریں بار بار دروازے کی طرف جا رہی تھیں۔ شاید وہ اپنے والدین کے پیچھے آنے والی ہو لیکن وہ نہیں آئی تھی۔ مجھے غصہ نہیں آیا۔ کوئی جوش یا جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ صرف مایوسی ہوئی۔

دوسرے دن ڈاکٹر نے کہا "آج وقت کی پابندی نہیں ہے۔ ابھی لکھنا شروع کرو اور جب تک لکھ سکتے ہو لکھتے چلے جاؤ۔"

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ جو جی میں آیا' وہ لکھتا چلا گیا۔ ڈاکٹر اسپتال کے دوسرے مریضوں کو دیکھنے گیا تھا' واپس آیا تو میرے تحریر شدہ کاغذات کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ایک اسٹنٹ لیڈی ڈاکٹر وہ تمام کاغذات ترتیب سے ایک فائل میں رکھ کر لے گئی۔ دوسرے دن ڈاکٹر نے میرے ابا سے کہا "تمہارا بیٹا کسی کزن سے بہت زیادہ اٹیچ ہے۔ کیا

آپ اس سلسلے میں کچھ روشنی ڈالیں گے۔"

وہ تذبذب میں پڑ گئے۔ اپنے بھائی کی بیٹی کو اس معاملے میں لانا نہیں چاہتے تھے۔ ڈاکٹر نے کہا "آپ کوئی جواب دینے سے پہلے یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ آپ کا ایک بھی غلط جواب آپ کے بیٹے کی دماغی حالت کے لئے نقصان دہ ہو گا۔"

انہوں نے میری سلامتی کی خاطر ڈاکٹر کو ابتدا سے آخر تک وہ تمام باتیں بتائیں جو وہ جانتے تھے۔ پھر بھی بتانے کے لئے بہت کچھ رہ گیا تھا اور وہ بہت کچھ صرف شاہدہ جانتی تھی یا میں جانتا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا "آپ کہتے ہیں وہ پونے دو برس تک چچا کے گھر میں رہا۔ اسے کزن سے اور کزن کو اس سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ پھر اچانک وہ کزن اس کے خلاف کیوں ہو گئی؟ آپ کے بیٹے نے اس پر جھوٹا الزام کیوں لگایا؟"

ابا نے کہا۔ "بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہم اپنے بچوں سے نہیں کرتے۔ ہمارے اندازے کے مطابق ان کے درمیان ایسا شرمناک اختلاف پیدا ہوا ہے جو میرے بیٹے پر یہ مصیبتیں لے آیا ہے۔"

"بات کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی ہے۔ اگر آپ تمام بزرگ حضرات مل کر کسی طرح اختلافات دور کریں تو علاج آسان ہو جائے گا۔"

ابا نے یہ باتیں امی کو سمجھائیں۔ امی نے اس لئے سمجھ لیا کہ وہ میری سلامتی کے لئے کچھ بھی کر سکتی تھیں۔ پھر ان کی بہن کی بیٹی بیاہ کر دوسری جگہ چلی گئی تھی۔ وہ مجھ سے تنہائی میں بولیں۔ "میں تمہیں ہنستے بولتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ سچ سچ بتاؤ کیا شاہدہ کو اپنی دلہن بنانا چاہتے ہو؟"

زندگی اور موت کی درمیانی جگہ اسپتال ہے۔ یہاں آنے والا موت کی طرف بھی جا سکتا ہے۔ یہاں بیٹھ کر میں کہہ سکتا تھا کہ میری آخری خواہش صرف شاہدہ ہے۔ میں نے امی کے سامنے ہاں کے انداز میں سر ہلا دیا۔

پھر بزرگوں کے درمیان کھچڑی پکنے لگی۔ چاچی اور چاچا اگرچہ مجھے دعائیں دینے آئے تھے۔ تاہم مجھ سے بدظن تھے۔ رشتے داری میں رسمی طور پر بھی دعائیں دی جاتی ہیں۔ اختلافات کے باوجود دکھ درد میں خیر خیریت پوچھ لی جاتی ہے لیکن کسی بھی عزت دار اور غیرت مند لڑکی کے ماں باپ یہ برداشت نہیں کرتے کہ اس کے اجلے دامن پر کوئی دھبا لگا کر چلا جائے۔ میں بڑے بھائی کا بیٹا تھا اس لئے وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے تھے اور اپنے ہاں میرا داخلہ ممنوع کر دیا تھا۔

جب ابا نے میرے لئے پھر سے شاہدہ کو مانگا تو چاچا ہتھے سے اکھڑ گئے۔ "بھائی جان! آپ آئندہ میری بیٹی کا نام اپنے بیٹے کے نام کے ساتھ نہ لیں۔ ورنہ آپ سے بھی رشتہ ٹوٹ جائے گا۔"

امی نے اپنا دامن پھیلا کر کہا "پچھلی غلطیوں پر خاک ڈالنے کی کوئی صورت نکالو۔ ہم

عمر میں اور رشتے میں تم سے بڑے ہیں پھر بھی تمہارے آگے جھک رہے ہیں۔"

"بھائی' آپ جھکتے جھکتے ٹوٹ جائیں گی۔ پھر بھی وہ ذلیل اور کم ظرف میرا داماد نہیں بنے گا۔"

ابا نے پوچھا "ایسی کیا قیامت ہو گئی ہے کہ معافی اور توبہ کا کوئی دروازہ ہی نہیں کھل سکتا؟"

چاچا نے کہا "آپ دیکھنا اور سننا ہی چاہتے ہیں تو ابھی دکھاتا اور سناتا ہوں۔"

انہوں نے اپنی الماری کھول کر کچھ کاغذات نکالے۔ پھر ایک ایک کاغذ میرے ابا کے منہ پر پھینکتے ہوئے کہا "یہ دیکھیں اور یہ دیکھیں اور یہ پڑھیں۔ آپ کے بیٹے کے دوستوں نے ڈاک کے ذریعے میری بیٹی کو یہ خط لکھے ہیں۔ یہ ایسے خطوط ہیں جنہیں فوراً جلا دینا چاہئے لیکن میں نے ثبوت کے طور پر رکھا ہے کہ آپ کا وہ کم ظرف بیٹا کیسی کیسی محفلوں میں میری بیٹی کی بے حیائی کی باتیں کرتا ہے۔"

ابا نے وہ خطوط پڑھ کر ندامت سے سر جھکا لیا۔ امی نے کہا۔ "ہمارے بیٹے نے کمینگی کی انتہا کر دی ہے۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ شاہدہ ہمارے خاندان کی غیرت ہے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ وہ نارمل ہو رہا ہے۔ اسے غصہ دلانے اور صدمہ پہنچانے والی باتیں نہ کی جائیں۔ میں اسے یہ خطوط بھی نہیں دکھا سکتا۔ اسے جوتے بھی نہیں مار سکتا۔ میں کیا کروں۔ کیا میں پاگل ہو جاؤں؟"

"خدا نہ کرے کہ آپ کے ساتھ کچھ ایسا ہو۔ یہ تو خاندانی دشمنی کی بنیاد پڑ گئی ہے۔ آپ دونوں بھائیوں نے ایسے نازک موقع پر صبر اور دانشمندی سے کام نہ لیا تو ایک طرف ہمارا بیٹا پھر سے پاگل ہو جائے گا اور شاہدہ مفت میں بدنام ہوتی رہے گی۔"

"آپ ہماری شاہدہ کی فکر نہ کریں۔ اس کے نصیب میں جو ہو گا وہ بھگت لے گی۔ آپ مہربانی کر کے گفتگو کا موضوع بدل دیں یا یہاں سے چلے جائیں۔"

میں نے اپنے والدین کو کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ مجھ پر غصہ نہیں دکھا سکتے تھے۔ میرے پاس آتے تھے اور جھوٹی تسلیاں دیتے تھے کہ ابھی شاہدہ کو رشتے کے لئے راضی کیا جا رہا ہے۔ پھر چاچی اور چاچا یہ کہتے ہیں کہ سلمان جب دماغی طور پر بالکل نارمل ہو جائے گا تو رشتے کی بات آگے بڑھائی جائے گی۔ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ پر سکون اور نارمل رکھنے کے لئے ایسی باتیں کرتے رہتے تھے۔

مزید چھ ماہ گزر گئے یعنی ایک برس تک جاری رہنے والے علاج سے میں بالکل نارمل اور صحت مند ہو گیا تھا۔ ادھر چاچا کسی دوسری جگہ شاہدہ کا رشتہ طے کر رہے تھے۔ ابا نے کہا۔ "دیکھو' میرے بیٹے سے دشمنی نہ کرو۔ اسے نئی زندگی ملی ہے' مجھ سے میرا بیٹا نہ چھینو۔ شاہدہ صرف میرے گھر آئے گی۔"

"بھائی جان! یہ میری زندگی میں نہیں ہو گا۔"

"پھر میرے بیٹے کی زندگی میں شاہدہ کسی اور کی دلہن نہیں بن سکے گی۔"

"کیا آپ دھمکی دے رہے ہیں؟"

"آج دھمکی ہے کل دھماکا ہو گی۔"

"اچھی بات ہے۔ آج سے بڑے بھائی کا احترام ختم سمجھو کوئی دھماکا ہوا تو منہ توڑ جواب دوں گا۔"

چاچا دوسرے دن شاہدہ کے ہونے والی سسرال گئے تو وہاں چند بزرگوں نے کہا۔ "بھائی صاحب! آپ کچھ زیادہ ہی چالاک بن رہے ہیں۔ کیا یہ بتا سکتے ہیں کہ آپ بیٹی کی شادی اپنا خاندان چھوڑ کر ہمارے خاندان میں کیوں کر رہے ہیں؟"

چاچا نے کہا۔ "اس لئے کہ آپ کا لڑکا ہمیں پسند ہے۔"

"لیکن آپ کی لڑکی ہمیں پسند نہیں ہے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ نے ہم میں کیا عیب دیکھا ہے؟"

"کوئی عیب ہے تب ہی آپ کے خاندان میں اسے کسی نے بہو نہیں بنایا ہے۔ اب ہماری زبان نہ کھلواؤ۔ ہماری بھی بیٹیاں ہیں۔"

چاچا وہاں سے سر جھکا کر چلے آئے۔ ایک نیک سیرت بیٹی کی بدنامی سے دل کٹ رہا تھا۔ انہوں نے خاندان کے بزرگوں کو بلایا اور کہا "بھائی جان اس خاندان کی ایک عزت دار بیٹی کو دوسرے خاندانوں میں جا کر بدنام کر رہے ہیں۔ ان کی یہ حرکت صرف میرے لئے نہیں آپ سب کے لئے بھی ندامت کا باعث ہے۔"

ایک بزرگ نے کہا "درست کہتے ہو۔ اکثر یہی ہوتا ہے کہ بہنوں اور بیٹیوں کی بدنامیوں سے اونچے خاندانوں کی عظمت اور وقار کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ دانشمندی یہی ہے کہ شاہدہ کی بدنامی کو یہیں روک دیا جائے اور اپنے ہی خاندان میں اس کی شادی کر دی جائے۔"

دوسرے بزرگ نے کہا۔ "وہ سلمان کے ساتھ بدنام ہو رہی ہے۔ سلمان ہی اس کے سر کی چادر بن سکتا ہے اور کی پارسائی کا بھرم رکھ سکتا ہے۔"

چاچا نے کہا "میں بھائی جان کی نادانی اور زیادتیاں بیان کر رہا ہوں اور آپ لوگ ان کی ہی حمایت میں بول رہے ہیں؟"

ایک اور بزرگ نے کہا "اگر ہمیں جہاں دیدہ سمجھ کر فیصلہ کرنے بلایا ہے تو فیصلہ یہی ہے دوسرے خاندانوں میں بیٹی کا رشتہ کرنے اور بدنامی کو دور تک پھیلانے سے صرف تمہاری نہیں ہم سب کی ذلت اور رسوائی ہے۔"

ایک اور بزرگ نے کہا "تمہیں اپنے بھائی جان کا احسان ماننا چاہئے۔ کہ شادی سے پہلے رسوا ہونے والی کو وہ بہو بنا رہا ہے۔ اس شادی کے بعد کوئی تمہاری بیٹی کی طرف انگلی اٹھانے کی بھی جرات نہیں کرے گا۔"

وہاں بیٹھے ہوئے سب سے معمر بزرگ نے کہا "خاندان کے تمام بزرگوں نے متفقہ فیصلہ سنا دیا ہے۔ اگر تم نے فیصلہ تسلیم نہ کیا تو ہم دیکھیں گے کہ بیٹی کا بیاہ کہاں کرو گے۔ ہمارے جیتے جی شاہدہ خاندان پر کیچڑ اچھالنے کے لئے دوسرے گھر نہیں جائے گی۔"

چاچا وہاں سے سر جھکا کر چاچی کے پاس آئے۔ ان کے پیچھے کھڑی ہوئی شاہدہ نے کہا "ابا! آپ دونوں سگے بھائی ہیں۔ آپ کی بدقسمتی یہ ہے کہ آپ بیٹی کے باپ ہیں۔ آپ کو تو ہارنا ہی پڑے گا۔"

چاچا راضی ہو گئے۔ امی نے آ کر مجھے خوشخبری سنائی۔ ڈاکٹر نے سنا تو اس نے مبارکباد دی۔ ابا نے کہا "آپ کے بیٹے کا یہی ایک علاج تھا۔ آپ لوگ دانشمندی کا ثبوت دے رہے ہیں۔"

ابا اس معاملے میں دیر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اگلے جمعے کو برات لے کر بھائی کے گھر پہنچ گئے۔ چاچا نے کہا تھا' شادی کی رات شاہدہ رخصت ہو کر میلوں دور پنڈ والی حویلی میں نہیں جائے گی۔ دلہا دلہن اسی کوٹھی میں رہیں گے۔ دوسری صبح رخصتی ہو گی۔ اور شاہدہ نے اپنی ماں سے کہا تھا۔ نکاح کے بعد وہ میرے ساتھ تنہا اس کوٹھی میں رہے گا۔ تمام براتی اور میکے والے دوسری کوٹھی میں رات گزاریں گے۔ یوں بھی براتی تعداد میں صرف پندرہ تھے۔ چونکہ ایک ہی خاندان تھا اس لئے وہ براتی بھی تھے اور شاہدہ کے میکے والے بھی۔ انہوں نے اسی محلے میں ایک دن اور ایک رات کے لئے کوٹھی حاصل کر لی تھی۔

نکاح پڑھاتے وقت بارش ہونے لگی تھی۔ اگر وہ شادی اطمینان اور سہولت سے ہوتی تو بارش کے موسم میں کبھی نہ ہوتی مگر سچائی کی آنکھ سے دیکھا جائے تو وہ زبردستی کی شادی محض میرے علاج کے لئے ہو رہی تھی۔ اس لئے کسی بھی موسم میں اور کسی حالت میں ہو سکتی تھی لہٰذا وہ ہو رہی تھی۔

میں بہت خوش تھا۔ میری زندگی کے اندھیروں میں آسیب بن کر آنے والی حقیقت بن کر آ رہی تھی۔ نکاح کے بعد کھانے کا انتظام دوسری کوٹھی میں تھا۔ چند عورتوں نے میکے میں ہونے والی دلہا دلہن کی رسومات ادا کیں۔ پھر وہ دلہن کو اس کمرے میں لے گئیں جہاں کبھی میں رہا کرتا تھا۔ پھر وہ واپس آئیں۔ امی اور چاچی نے مجھے دعائیں دیں۔ میں ان کے ساتھ کوٹھی کے باہر برآمدے تک آیا۔ جب وہ دوسری کوٹھی کی طرف جانے لگیں تو پھر بارش ہونے لگی تھی۔ میں سوچا انہیں رک جانے کو کہوں لیکن زبان نہیں کھلی۔ آج یہاں کسی کی موجودگی گوارہ نہیں تھی۔

وہ نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو میں برآمدے سے گزر کر اندر آیا۔ بیرونی دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ پھر راہداری میں چلتا ہوا اپنے کمرے کے دروازے پر آ گیا۔ میرے دل کی دھڑکنیں کچھ پاگل ہو رہی تھیں۔ میں نے آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر آتے ہوئے بستر کی طرف دیکھا تو وہ نہیں تھی۔ دلہن کی سیج سونی تھی۔

میرے اندر بے چینی سی پھڑپھڑانے لگی۔ وہ ہاتھ آتے آتے نکل جاتی تھی۔ میں نے آواز دی۔ "کزن!"

باتھ روم کی طرف دیکھا۔ اس کا دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا اور اندر سے واش بیسن میں پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے ذرا اطمینان کی سانس لی پھر باتھ روم کے قریب آ کر کہا۔ "کزن! خیریت تو ہے۔ تم نے دروازہ کھلا رکھا ہے اس لئے پوچھ رہا ہوں۔ کیا مدد کے لئے آؤں؟"

اندر خاموشی تھی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا "بھئی مذاق کر رہا تھا۔ اندر نہیں آؤں گا۔ یہاں انتظار کر رہا ہوں۔"

میں مستی میں جھومتا ہوا بستر پر آ کر چاروں شانے چت ہو گیا۔ اس بستر پر میں پونے دو برس تک تنہا سوتا رہا تھا اور یہاں کزن کو بلانے میں ناکام ہوتا رہا تھا۔ آج اسی کے لیے بستر پر پھولوں کی پتیاں بچھی ہوئی تھیں۔ مجھے دستک سنائی دی۔ میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دستک نہیں تھی۔ کھٹکا سا ہوا تھا۔ کوٹھی کے تمام دروازے اندر سے بند تھے پھر راہداری میں کون ہو سکتا تھا؟"

میں نے بستر سے اٹھ کر دروازے کے پاس آ کر پوچھا "کون ہے؟"

جواب نہیں ملا۔ میں نے اندر کی چٹخنی گرائی پھر دروازے کو کھولنا چاہا تو وہ نہیں کھلا۔ میں نے زور زور سے جھٹکا دیا۔ پتا چلا وہ باہر سے بند ہے۔ میں ابھی اس دروازے سے اندر آیا تھا۔ اسے باہر کی طرف سے کھلا ہونا چاہئے تھا۔ پھر یہ کیسے بند ہو گیا۔ میں نے چیخ کر پوچھا۔ "باہر......... کون ہے؟ کس نے دروازہ بند کیا ہے؟"

جواب میں بجلی کی زور دار کڑک سنائی دی۔ میں وہاں سے پلٹ کر تیزی سے چلتا ہوا باتھ روم کے پاس آیا۔ پھر دروازے کو کھول دیا۔ واش بیسن کا نلکا کھلا ہوا تھا اور پانی بیسن میں گر رہا تھا۔ میں نے اندر آ کر دیکھا' وہ نہیں تھی۔ میں نے چیخ کر آواز دی۔ "شاہدہ!"

جواب میں بادل گرجنے لگے۔ جب گرجنے کی آواز کچھ کم ہوئی تو دستک سنائی دی۔ میں باتھ روم سے نکل کر کمرے کے بند دروازے کی طرف جانے لگا۔ پھر دستک سن کر رک گیا۔ گھوم کر کھڑکی کی سمت دیکھا۔ پھر ایک بار وہاں دستک ہوئی۔ میں نے آگے بڑھ کر صحن میں کھلنے والی کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔

تیز ہوا کا جھونکا آیا۔ صحن میں موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ وہ تنگ پاجامے اور ململ کے کرتے میں بھیگ رہی تھی۔ اس کے بدن پر سہاگ کا سرخ جوڑا نہیں تھا۔ میں اسے سیج پر چاہتا تھا' وہ صحن میں تھی۔ بھیگنے کا عجب سماں پیش کر رہی تھی۔ احساس میں گدگدی پیدا کر رہی تھی۔ آج سے ٹھیک ایک برس پہلے اسی بارش میں اسی صحن میں اس کا یہی نظارہ تھا۔ اس وقت چاچی اور چاچا کی بیداری کے خوف سے صحن میں نہیں گیا تھا۔ آج بھی نہیں جا سکتا تھا اس نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔

میں نے بے چین ہو کر کہا۔ "آج میں صحن میں آ سکتا ہوں' دروازہ کھولو۔"

وہ بولی "تم نے ایسی دلہن دیکھی یا سنی ہے جو پہلی رات سیج پر نہ ہو صحن کی بارش میں ہو؟"

"واقعی دیکھی نہ سنی۔ دروازہ کھولو۔ ہم دلہا دلہن یہ رات بارش میں منائیں گے۔"

وہ آنگن میں کبھی ادھر جا رہی تھی۔ کبھی ادھر آ رہی تھی۔ آنے جانے میں بدن لہریں لیتا تھا۔ زلفوں سے پانی مسلسل ٹپک رہا تھا اور گوری جلد پر پھسل رہا تھا۔ وہ پھسل کر صحن کے چکنے فرش پر ذرا دور تک گئی۔ فرش کے پانی میں لیٹی ہوئی جل پری لگ رہی تھی۔ ایک بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "میں تمہاری دلہن ہوتی تو سیج پر ہوتی۔ ایک نا محرم ہوں۔ اسی لئے ہمارے درمیان بند دروازے کی دیوار ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔ تم نامحرم نہیں ہو میری منکوحہ ہو۔ ہمارا نکاح پڑھایا گیا ہے۔"

"تم نے اور تمہارے باپ نے مجھے ہر پہلو سے گھیر کر بدنامی کے عذاب میں مبتلا کر کے اسی طرح منکوحہ کے بستر پہنچانا چاہا ہے جس طرح چند بدمعاش مجبور لڑکی کو زبردستی ہوس کے بستر پر لاتے ہیں۔"

بجلی کڑکتی ہوئی' ہاں کہتی ہوئی آسمان کے ایک طرف سے دوسری طرف چلی گئی۔

اس نے پوچھا۔ "بولو۔ کسی کو مجبور کر کے نکاح قبول کرانے سے نامحرم' محرم ہو جاتی ہے۔ یہ کس مذہب میں ہے کہ جب تھپڑ کھا کر بھی کسی کو بستر پر نہ لا سکو' زخم کھا کر بھی ایک شریف زادی کو مجبور نہ کر سکو ...... تنہائی میں کلام پاک کو درمیان دیکھ کر شیطانی ارادے میں کامیاب نہ ہو سکو تو سماج اور برادری کے ٹھیکیداروں سے آبرو لوٹنے کا نکاح نامہ حاصل کر لو۔ کل میری لاش دیکھ کر تمہیں اور تمہارے باپ کو معلوم ہوگا کہ ایسے نکاح نہیں ہوتا بلکہ کسی بے بس کے جذبات کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔"

بادل گرجتے گئے۔ تائید میں ہاں ہاں کہتے گئے۔

وہ بول رہی تھی مگر بہت کم سنائی دے رہی تھی۔ جب برق سر صحن لہراتی ہو تو صرف نظارے دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے کھڑکی کی جالیوں سے دونوں بازو اس کی طرف بڑھائے۔ گڑگڑا کر کہا "مجھے آنے دو۔ میرے دماغ میں جہنم دہک رہا ہے۔ میں کھڑکی توڑ دوں گا۔ اپنا سر پھوڑ لوں گا۔"

"اگر تمہارے دل میں خدا کا خوف ہوتا تو میں دروازہ کھول کر تمہارے پاس آ جاتی مگر ایک بے دین اور بے ایمان کے پاس نہیں آؤں گی۔ تم نے مقدس کتاب کا احترام نہیں کیا۔ ایمان والے ہوتے تو دنیا سے کہتے' تمہاری کزن کلام الٰہی کے سائے میں باوضو آئی اور باوضو گئی۔ اگر صرف میری توہین ہوتی تو میں برداشت کر لیتی لیکن تم نے کلام الٰہی کی نفی کی ہے۔ تمہیں اس کی سزا ضرور ملے گی۔"

میں نے گرجتے ہوئے کھڑکی کی آہنی جالیوں پر سر مارتے ہوئے کہا "دروازہ کھولو۔

دروازہ کھولو۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تم مجھے پاگل بنا رہی ہو۔ میں پاگل نہیں بن سکتا۔ میں پاگل نہیں ہوں۔"

میری پیشانی آہنی جالیوں سے لہولہان ہو رہی تھی۔ اس نے کہا تم پاگل ہو "تم پاگل رہو گے۔ تم نے مجھے بدکار ثابت کیا۔ میں تمہیں پاگل ثابت کروں گی۔ تم میرا یہ بدن کبھی حاصل نہیں کر سکو گے۔"

میں نے حلق پھاڑ کر پوچھا "تم کب تک بچتی رہو گی۔ یہ دروازہ کب تک بند رہے گا؟"

اس نے گریبان سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی پھر کہا "اگر ہمارا نکاح جائز ہے تو پھر بیوی کے مرتے ہی شوہر نامحرم ہو جاتا ہے۔ پھر مرحومہ کو چھونا تو دور کی بات ہے اس کی صورت بھی دیکھنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ صبح جب دروازہ کھلے گا تو دنیا والے موجود رہیں گے۔ ان کی موجودگی میں تم مجھے ہاتھ نہیں لگا سکو گے۔"

اس نے شیشی کھول کر منہ سے لگا لی۔ میں آہنی جالیوں کو جھنجوڑنے لگا۔ سر ٹکرانے لگا۔ وہ تمام زہر حلق سے اتارنے کے بعد زور سے چیخ کر بولی۔

سوال: "چچا کی بیٹی کو کیا کہتے ہیں؟"

جواب: "بچپن میں بہن اور جوانی میں کزن کہتے ہیں۔"

اور کزن نامحرم ہوتی ہے۔ میں کل بھی ناقابل حصول تھی۔ مرنے کے بعد بھی رہوں گی۔"

وہ پانی سے بھرے ہوئے صحن کے فرش پر گر پڑی۔ میں دوڑتا ہوا دروازے کے پاس آیا۔ اسے جھنجوڑنے لگا۔ وہ کھل نہیں سکتا تھا۔ اسے ٹکریں مارنے لگا۔ وہ ٹوٹ نہیں سکتا تھا۔ میں فرش پر پچھاڑیں کھانے لگا مگر مر نہیں سکتا تھا۔ نہ یہ ہو سکتا تھا نہ وہ ہو سکتا تھا۔ میں نے آخری بار کزن کو پکارنے کے لئے چیخ ماری پھر بے ہوش ہو گیا۔

پتا نہیں کتنے مہینے کتنے برس گزر گئے ہیں۔ میں زندہ ہوں مگر زندوں میں نہیں ہوں۔ کبھی نارمل رہتا ہوں تو یہ دنیا سمجھ میں آتی ہے کبھی ایب نارمل ہوتا ہوں تو ایک عالم نامعلوم میں رہتا ہوں۔ اور قبر کو بھی تو عالم نامعلوم کہا جاتا ہے۔ یوں میرے قبر میں آنے جانے کا سلسلہ جاری ہے۔

ختم شد